ملکیت زمین اور اُس کی تحدید

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی

مکتبہ دار العلوم کراچی ۱۴

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی

نام مقالہ ———— ملکیت زمین اور اس کی تحدید
مصنف ———— مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ
باہتمام ———— حافظ محمد یامین (فاضل دارالعلوم کراچی)
کمپوزنگ ———— الفاروق کمپیوٹرز لاہور ۲۲۱۹۵۳
بار دوم ———— رجب ۱۴۱۳ھ

ناشر
مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴
پوسٹ کوڈ ۷۵۱۸۰

ملنے کے پتے
◄ مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴
◄ ادارۃ المعارف، دارالعلوم کراچی ۱۴
◄ دارالاشاعت، ایم۔ اے جناح روڈ کراچی
◄ ادارۂ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

سپریم کورٹ کی شریعت اپلیٹ بنچ میں ہمارے ملک کے مروجہ زرعی اصلاحات کے قوانین کو قرآن وسنت کے منافی ہونے کی بناپر چیلنج کیا گیا تھا اس مقدمے میں جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے جو تاریخ ساز فیصلہ لکھا، اس میں ملکیت زمین، تحدید ملکیت، اولوالامر کی اطاعت کی حدود اور دوسرے متعلقہ مسائل پر انتہائی پر مغزاور سیر حاصل بحثیں کی گئی ہیں یہ فیصلہ افادہ عام کے لئے کتابی صورت میں شائع کیا جارہا ہے۔ اور کتابی شکل میں اشاعت کے وقت مولانا موصوف نے ضمیمہ کے طور پر دوابواب کا اضافہ کیا ہے جس میں ملکیت زمین کے خلاف پیش کئے جانے والے دلائل کا تجزیہ اور مزارعت کے جواز اور عدم جواز پر اطمینان بخش بحثیں شامل کر دی گئی ہیں۔ اس طرح اب یہ کتاب "ملکیت زمین اور اس کی تحدید" کے موضوع پر اردو زبان کی مفصل ترین کتاب بن گئی ہے۔ جو انشاء اللہ اہل علم و دانش کے لئے نہایت مفید اور دلچسپ ہوگی اور اس سے اسلام کے معاشی اصولوں...... اور نظام اراضی سے متعلق اس کی تعلیمات کو مستند طریقے سے سمجھنے میں انشاءاللہ مدد ملے گی۔ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائیں۔ آمین۔

فاروق القاسمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

إن الحکم إلا للہ علیہ توکلت و علیہ فلیتوکل المتوکلون

عدالت عظمیٰ پاکستان

شریعت اپیلیٹ بینچ

روبروئے:

جناب جسٹس محمد افضل ظلہ صاحب	چیرمین
جناب جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ صاحب	ممبر
جناب جسٹس شفیع الرحمٰن صاحب	ممبر
جناب جسٹس پیر محمد کرم شاہ صاحب	ممبر
جناب جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی صاحب	ممبر

شریعت اپیل نمبر ۱ ـــ ۱۹۸۱ء

قزلباش وقف بنام چیف لینڈ کمشنر، پنجاب، لاہور وغیرہ

شریعت اپیل نمبر ۳ ـــ ۱۹۸۱ء

شیر علی خان بنام حکومت پاکستان

شریعت اپیل نمبر ۴ ـــ ۱۹۸۱ء

سید خوشحال خان بنام وفاقی حکومت پاکستان

شریعت اپیل نمبر ۸ ـــ ۱۹۸۱ء

سید علی اکبر محمود بنام ڈپٹی لینڈ کمشنر، رحیم یار خان

شریعت اپیل نمبر ۹ ـــ ۱۹۸۱ء

بشریٰ بی بی بنام ڈپٹی لینڈ کمشنر

شریعت اپیل نمبر ۱۰ ـــ ۱۹۸۱ء

سردار سلطان محمود خان بنام حکومت پاکستان

شریعت اپیل نمبر ایک ـــ در ـــ ۱۹۸۷ء

سید عزیز الاسلام وغیرہ بنام وفاق پاکستان

شریعت اپیل نمبر ۲۱ ـــ در ـــ ۱۹۸۴ء

صوبہ پنجاب بنام عوام الناس پاکستان

تاریخ ہائے سماعت .... ۱۷، ۱۸، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴ / ستمبر ۱۹۸۵ء اور مورخہ ۳ / مئی ۱۹۸۶ء و ۱۶ اق، ۱۸ / جنوری ۱۹۸۸ء

فیصلہ

۱۔ یہ تمام اپیلیں چونکہ فیڈرل شریعت کورٹ کے ایک ہی فیصلے کے خلاف دائر کی گئی ہیں، اور ان سب میں بنیادی مسئلہ ایک، یا ایک جیسا ہے، اس لئے ان تمام اپیلوں کی سماعت بھی ایک ساتھ کی گئی، اور اس فیصلے کے ذریعہ ان سب کا ایک ساتھ تصفیہ مطلوب ہے۔

۲۔ شریعت اپیل نمبر ۱ ۔ 1981ء میں اپیل کنندہ قزلباس وقف ہے، جو ناصر علی خان قزلباس نے ۱۹۵۲ء میں فی سبیل اللہ وقف کیا تھا، یہ وقف ۴۰ مربع زرعی زمین اور دوسری شہر جائیداد پر مشتمل تھا، جس کی آمدنی وقف نامہ کی رو سے مذہبی اور خیراتی مقاصد میں خرچ ہونی تھی۔

۳۔ جب ۱۹۷۲ء میں مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۱۱۵ نافذ ہوا، اور اس کے ذریعہ زمین کی ملکیتوں پر حد عائد کر کے اس حد سے زائد زمینیں مالکان سے لی گئیں تو قزلباش وقف کی متعدد درخواستوں کے باوجود اسے مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۱۱۵ کے احکام سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا گیا، اور زمین کا جتنا حصہ ۱۴ ہزار یونٹ سے زائد تھا، وہ لے لیا گیا، اور مذکورہ ریگولیشن کے پیراگراف نمبر ۱۸ ذیلی اے شق ۲ کے تحت ۲۵۰ ایکڑ زمین مزارعین کو دے دی گئی۔

۴۔ جنوری ۱۹۷۷ء میں لینڈ ریفارمز ایکٹ ۱۹۷۷ء نافذ ہوا، جس میں ملکیت زمین کی حد اور کم کر کے ۱۰۰ ایکڑ یا ۸ ہزار یونٹ (جو بھی زیادہ ہو) مقرر کر دی گئی، جس کے نتیجے میں وقف کی مزید زمین وقف کے تصرف سے لے لی گئی، اور اب وقف کے پاس ایک ہزار بیس ایکڑ میں سے صرف ۱۰۲ ایکڑ زمین باقی رہ گئی۔

۵۔ قزلباش وقف کی طرف سے اس کارروائی کے خلاف متعدد مقدمات دائر کئے گئے، جو بالآخر ناکام ہوئے، یہاں تک کہ فروری ۱۹۷۹ء میں صدارتی حکم نمبر ۳/۱۹۷۹ء نافذ ہوا، جس کے ذریعہ دستور پاکستان میں ایک نئے باب ۳۔ اے کا اضافہ کیا گیا، اور ہر ہائی کورٹ میں شریعت بنچیں قائم کی گئیں، جو کسی قانون کو قرآن و سنت کے خلاف قرار دینے کی مجاز تھیں، چنانچہ ۲۱/مارچ ۱۹۷۹ء کو اپیل کنندہ نے لاہور ہائی کورٹ کی شریعت بینچ میں مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ اور لینڈ ریفارمز ایکٹ ۱۹۷۷ء کو قرآن و سنت کے خلاف ہونے کی بنیاد پر چیلنج کیا، یہ درخواست سماعت کے

لئے منظور ہو گئی، لیکن اس دوران ہائی کورٹوں کی شریعت بینچوں کی جگہ فیڈرل شریعت کورٹ وجود میں آ گیا، چنانچہ یہ درخواست فیڈرل شریعت کورٹ کو منتقل ہو گئی، فیڈرل شریعت کورٹ نے مقدمہ کی سماعت کے بعد اپنے فیصلے مورخہ ۱۳/ دسمبر ۱۹۸۰ء کو اپنے اکثریتی فیصلے کی بنا پر یہ درخواست خارج کر دی، تاہم جسٹس کریم اللہ درانی (مرحوم) نے اپنے اقلیتی فیصلے میں اس درخواست کو منظور کرتے ہوئے یہ قرار دیا کہ مذکورہ قوانین میں "شخص" کی ایسی تعریف جس کی رو سے مسلمان وقف بھی اس میں داخل ہو جائے، قرآن و سنت کے خلاف ہے۔

اب اپیل کنندہ نے فیڈرل شریعت کورٹ کے خلاف اس عدالت میں اپیل دائر کی ہے۔

۶۔ اپیل نمبر ۳ و ۱۰ـ ۱۹۸۱ء میں اپیل کنندہ نے مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۱۱۵ کے پیراگراف نمبر ۸ کو قرآن و سنت کے خلاف ہونے کی بنا پر چیلنج کیا ہے، جس میں نہری زمین کے ۱۵۰ ایکڑ اور بارانی زمین کے ۳۰۰ ایکڑ یا ۱۲ ہزار پیداواری یونٹ (جو بھی زیادہ ہو) سے زائد زمین ملکیت میں رکھنے پر پابندی عائد کی گئی ہے، اسی طرح لینڈ ریفارمز ایکٹ ۱۹۷۷ء کی اس دفعہ کو چیلنج کیا ہے، جس کی رو سے ملکیت زمین کی حد مزید گھٹا کر ۱۰۰ ایکڑ کر دی گئی ہے۔

۷۔ اپیل نمبر ۴ـ ۱۹۸۱ء میں مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۱۱۵ کے پیراگراف نمبر ۲۴ کو چیلنج کیا گیا ہے، جس میں زمین کی ہر ایسی تقسیم اور ہر ایسے انتقال کو ممنوع قرار دیا گیا، جس کے ذریعہ کسی شخص کی زمین کفایتی مقدار (economic holding) سے کم رہ جائے، نیز اپیل کنندہ نے مذکورہ ریگولیشن کے پیراگراف نمبر ۲۵ کے ذیلی فقرہ نمبر ایک (شق اے سے ڈی تک)، اور ذیلی فقرہ نمبر ۳ (اے سے سی تک) کو بھی قرآن و سنت کے خلاف ہونے کی بنیاد پر چیلنج کیا ہے، پیراگراف نمبر ۲۵ ذیلی فقرہ نمبر ایک مزارعین کو بے دخلی سے تحفظ فراہم کرتا ہے، اور ذیلی فقرہ نمبر ۳ زمین پر عائد ہونے والے تمام واجبات (بیج کی فراہمی وغیرہ) مالک یا قابض کے ذمہ قرار دیتا ہے، البتہ کھاد کی فراہمی زمیندار اور مزارع کی مشترک ذمہ داری قرار دیتا ہے۔

۸۔ شریعت اپیل نمبر ۸، ۹ـ ۱۹۸۱ء میں لینڈ ریفارمز ایکٹ ۱۹۷۷ء کی دفعات ۳، ۴، ۵، ۶، اور ۷ کو قرآن و سنت کے خلاف ہونے کی بنا پر چیلنج کیا گیا ہے، جو زرعی زمین کی ملکیت کی تحدید اور اس سلسلے میں زمین کے انتقالات پر مختلف قسم کی پابندیوں پر مشتمل ہے۔

شریعت اپیل نمبر ایک در ۱۹۸۷ء کے اپیل کنندگان کچھ وہ لوگ ہیں جو مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ کی زد میں آنے کی بنا پر اپنی کچھ جائیداد سے محروم ہوئے، شروع میں انہوں نے متعدد اتھارٹیز کے سامنے اپنی درخواستیں پیش کیں، جو ناکام ہوئیں، بالآخر انہوں نے فیڈرل شریعت کورٹ میں ایم۔

ایل۔ آر ۱۱۵ کو قرآن و سنت سے متصادم ہونے کی بنا پر چیلنج کیا. فیڈرل شریعت کورٹ نے اپنے ایک مختصر حکم مورخہ ۱۷/۱۱/۱۹۸۶ء کے ذریعہ ان کی درخواست سرسری طور پر خارج کر دی. اور اپنے مختصر حکم میں اخراج کی وجہ صرف یہ بیان کی کہ فیڈرل شریعت کورٹ حافظ محمد امین بنام اسلامی جمہوریہ پاکستان (پی۔ ایل۔ ڈی ۱۹۸۱ء Fsc ۲۳) کے مقدمہ میں یہ قرار دے چکا ہے کہ یہ معاملہ اس کی حدود اختیار سماعت میں نہیں ہے۔

اپیل کنندہ کا موقف یہ ہے کہ یہ عدالت (سپریم کورٹ) حکم صوبہ سرحد بنام سعید کمال شاہ (پی۔ ایل۔ ڈی ۱۹۸۶ء Scp ۳۶۰) کے مقدمہ میں مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ کی بعض دفعات کے بارے میں یہ قرار دے چکی ہے کہ وہ فیڈرل شریعت کورٹ کی حدود اختیار میں داخل ہے. اور اس بنا پر ایم۔ ایل۔ آر ۱۱۵ کی بعض دفعات کو قرآن و سنت سے متصادم قرار دے چکی ہے. ان حالات میں جب کہ اس عدالت کے مذکورہ فیصلے کی بنا پر فیڈرل شریعت کورٹ کا دائرہ اختیار واضح ہو گیا ہے. اور یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ ایم۔ ایل۔ آر ۱۱۵. اس کی حدود اختیار سے خارج نہیں ہے تو اب ان کا یہ مقدمہ فیڈرل شریعت کورٹ کو ریمانڈ کرنا چاہئے. تاکہ فیڈرل شریعت کورٹ مقدمہ کے ذاتی حسن و قبح (Merits) کی بنیاد پر اس کا فیصلہ کرے۔

جہاں تک اس مقدمہ کے ریمانڈ کا تعلق ہے. اپیل کنندگان کا موقف اس لئے قابل تسلیم نہیں ہے کہ فیڈرل شریعت کورٹ نے حافظ محمد امین بنام اسلامی جمہوریہ پاکستان کے مقدمہ میں صرف اختیار سماعت کے فقدان کی وجہ سے درخواست خارج نہیں کی تھی. بلکہ ساتھ ہی ریمانڈ کے امکان کو مدنظر رکھتے ہوئے اصولوں (Merits) پر بھی فیصلہ دے دیا تھا. اور اب وہ فیصلہ دوسری منسلکہ اپیلوں کے ذریعہ ہمارے پاس چیلنج کیا گیا ہے. لہٰذا اس مقدمہ کو ریمانڈ کرنے کے بجائے ہم میرٹس کی بنیاد پر اس کا تصفیہ دوسری منسلکہ اپیلوں کے ساتھ کرنا مناسب سمجھتے ہیں. کیونکہ اپیل کنندگان کا مقصد بھی ایم۔ ایل۔ آر ۱۱۵ کی دفعات کو چیلنج کرنا ہے. جو مذکورہ حد سے زائد زمینوں کو بلا معاوضہ چھین لینے کے احکام پر مشتمل ہیں۔

شریعت اپیل نمبر ۲۱ در ۱۹۸۴ء صوبائی حکومت پنجاب نے فیڈرل شریعت کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف دائر کی ہے جس کے ذریعہ اس نے پنجاب ٹیننسی ایکٹ ۱۸۸۷ء کی دفعہ ۶۰۔ اے میں ترمیم کرنے کی ہدایت کی تھی. اس اپیل میں جو مسئلہ اٹھایا گیا ہے. وہ بھی چونکہ ایم۔ ایل۔ آر ۱۱۵ کے بعض احکام سے قریبی تعلق رکھتا ہے. اس لئے اس اپیل کی سماعت بھی مذکورہ بالا اپیلوں کے ساتھ کی گئی ہے۔

۹۔ یہ مقدمات جس بنیادی مسئلہ سے متعلق ہیں، ان کے تصفیہ کے لئے پہلے مندرجہ ذیل نکات کی تحقیق ضروری ہو گی:

(۱) کیا اسلام میں زمین کی انفرادی ملکیت تسلیم کی گئی ہے؟

(۲) کیا اسلام نے زمین یا دوسری املاک میں ملکیت کی کوئی حد مقرر فرمائی ہے؟

(۳) اگر اسلام نے از خود ملکیت کی کوئی حد مقرر نہیں کی، تو کیا کسی حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ملکیت کی کوئی حد مقرر کر دے؟ اور کسی قانون کے ذریعہ عوام کو اس بات کا پابند بنا دے کہ وہ اس مقررہ حد سے زائد کوئی چیز اپنی ملکیت میں نہ لائیں؟

(۴) کیا اسلام میں حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ افراد کی کسی شخصی ملکیت کو ان کی رضامندی کے بغیر ان کی ملکیت سے نکال دے؟ اگر یہ اختیار حاصل ہے تو کن حالات میں؟ اور معاوضے کے ساتھ یا بلا معاوضہ؟

ہم ان چار نکات سے متعلق قرآن و سنت کی روشنی میں اپنی تحقیق کا نتیجہ ذیل میں پیش کرتے ہیں:

ملکیت زمین کا مسئلہ۔

۱۰۔ چونکہ زیر نظر مقدمات میں کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ اسلام میں زمین کی انفرادی ملکیت جائز نہیں ہے، بلکہ دونوں فریق اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام میں زمین انفرادی ملکیت کے تحت آ سکتی ہے، وفاقی شرعی عدالت نے بھی اپنے فیصلے میں اس بات کو تسلیم کیا ہے، اس لئے اس نکتہ کی توضیح و تشریح میں زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ البتہ چونکہ دوسرے زیر تصفیہ نکات اسی نکتہ پر موقوف ہیں، اس لئے نہایت اختصار کے ساتھ اس مسئلے میں قرآن و سنت کے موقف کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۱۔ قرآن کریم جس معاشرے میں نازل ہوا، وہاں اشیائے صرف (Consumer goods) اور وسائل پیداوار (Factors of Production) دونوں پر انفرادی ملکیت کو تسلیم کیا جاتا تھا، اور اسی کے مطابق معاملات جاری تھے۔ قرآن کریم نے انفرادی ملکیت کے اس اصول میں عملاً کوئی تبدیلی پیدا نہیں فرمائی، البتہ کئی مقامات پر یہ واضح فرمایا کہ زمین و آسمان کی تمام اشیاء پر حقیقی ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے، وہی ان اشیاء کا خالق اور ان کا حقیقی مالک ہے، اور اس مالک حقیقی نے یہ چیزیں انسانوں کو عطا فرمائی ہیں، جس کے نتیجے میں وہ دنیاوی احکام و معاملات کے

لحاظ سے ان اشیاء کے مالک قرار پا گئے ہیں، اور ان کو ان مملوکہ اشیاء پر تمام مالکانہ حقوق حاصل ہو گئے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ ملکیت اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، اس لئے یہ بالکل بے مہار اور مادر پدر آزاد ملکیت نہیں ہے۔ بلکہ اپنے حصول کے طریقے اور استعمال کے لحاظ سے بہت سی حدود کی پابند ہے۔ چنانچہ ان دنیوی مالکوں پر واجب ہے کہ وہ اسے اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کریں۔ اور ان حدود سے تجاوز نہ کریں۔

۱۲۔ قرآن کریم نے ملکیت کی یہ حقیقت متعدد مقامات پر بیان فرمائی ہے۔ ایک طرف یہ ارشاد فرمایا:

ولله ما في السموات وما في الأرض

اور اللہ ہی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور جو کچھ زمین میں ہے (۱)

۱۳۔ لیکن دوسری طرف یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کا مالک حقیقی ہونے کے باوجود دنیوی احکام کے لحاظ سے ان اشیاء کی ملکیت انسانوں کو عطا فرما دی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

أولم يروا أنا خلقنا لهم مما عملت أيدينا أنعاما فهم لها مالكون

اور کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لئے

۱۔

اپنے ہاتھ کی ساختہ چیزوں میں سے مویشی پیدا کئے، یہاں یہ لوگ ان کے مالک ہو گئے۔ (۱)

۱۴۔ اس طرح یہ واضح فرمانے کے باوجود کہ زمین و آسمان کی تمام اشیاء حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں، اللہ تعالیٰ نے دنیوی احکام کے لحاظ سے ان اشیاء پر انفرادی ملکیت تسلیم فرمائی، اور اس حیثیت سے قرآن کریم میں جا بجا ان اشیاء کو "انسانوں کا مال" (یعنی ان کی ملکیت) قرار دیا گیا ہے۔ (۲) اور اسی بنا پر ان انفرادی ملکیتوں میں غیر ممالک کی مداخلت کو منع فرمایا گیا ہے

۱۔ (نساء ۴: ۱۲۶، ۱۳۱، ۱۳۲۔ مزید دیکھئے سورۃ بقرہ ۲: ۱۰۷ و آل عمران ۳: ۱۰۹، و انعام ۶: ۱۲ و یونس ۱۰: ۵۵، ۶۶، و رعد ۱۳: ۱۶ و ابراہیم ۱۴: ۲، و النحل ۱۶: ۵۲، و طہ ۲۰: ۶، و الحج ۲۲: ۶۴، و النور ۲۴: ۶۴، و الروم ۳۰: ۲۶، و لقمان ۳۱: ۲۶، و سبا ۳۴: ۱، و الشوریٰ ۴۲: ۴ وغیرہ۔

(۱) یٰسین ۳۶: ۷۱۔

مثلاً ارشاد ہے:

یا أیھا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل

اے ایمان والو! ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق طریقے سے مت کھاؤ۔ (۳)

۱۵۔ لیکن جابجا یہ تنبیہ بھی فرمادی گئی کہ چونکہ تمہاری یہ انفرادی ملکیت اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، جو ان تمام چیزوں کا حقیقی مالک ہے۔ اس لئے جہاں اللہ تعالیٰ تمہیں ان املاک کو خرچ کرنے کا حکم دے، وہاں تمہارے لئے ان کا خرچ ضروری ہو گا، نیز اگرچہ کسی دوسرے شخص کو تمہاری انفرادی ملکیت میں مداخلت کرنے کا حق نہیں ہے، لیکن تمہیں از خود اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ اس نعمت کا شکر اس طرح ادا کرنا چاہئے کہ اس ملکیت کے ذریعہ دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ ارشاد ہے:

و آتوھم من مال اللہ الذی آتاکم

اور ان (غلاموں) کو دو اللہ کے اس مال میں سے جو اللہ نے تمہیں دے دیا ہے۔ (۱)

نیز ارشاد ہے:

و ابتغ فی ما آتاك اللہ الدار الآخرة ولا تنس نصیبك من الدنیا و أحسن کما أحسن اللہ الیك ولا تبغ الفساد فی الأرض

اور جو کچھ اللہ نے تجھے دیا ہے اس کے ذریعہ آخرت کی جستجو کر، اور دنیا سے اپنا حصہ فراموش نہ کر، اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی

---

(۲) ایسی تمام آیات کو نقل کرنا تو مشکل ہے، البتہ چند حوالے درج ذیل ہیں:
بقرہ ۲: ۲۶۴، ۱۸۸، ۲۶۱، ۲۷۴، ۲۷۹، و آل عمران ۳: ۱۰، ۱۱۶، ۱۸۶، النساء ۴: ۲، ۶، ۱۰، ۳۶، ۳۸، ۹۵، الانفال ۸: ۲۸، ۳۶، ۷۲، والتوبہ ۹: ۲۴، ۳۴، ۴۴، ۸۶، ۸۵، ۱۰۳، ۱۱۱ و یونس ۱۰: ۸۸ و بنی اسرائیل ۱۷: ۶ ط الاحزاب ۳۳: ۲۷ والسبا ۳۴: ۳۷ و محمد ۴۷: ۳۶ والناز یات ۵۱: ۱۹، المجادلۃ ۵۸: ۱۷، الحشر ۵۹: ۸، الصف ۶۱: ۱۱ المنافقون ۶۳: ۹ التغابن ۶۴: ۱۵ المعارج ۷۰: ۲۴، اللیل ۹۲: ۱۱ والھمزۃ ۱۰۴: ۳ والمسد ۱۱۱: ۲۔

(۳) سورۃ النساء ۴: ۲۹، سورۃ البقرۃ ۲: ۱۸۸۔

(۱) النور ۲۴: ۳۳۔ (۲) القصص ۲۸: ۸۲۔

(دوسروں کے ساتھ) احسان کر. اور زمین میں فساد کا خواہاں نہ ہو۔ (۲)

(۱۶) انفرادی ملکیت کی یہ حقیقت کہ دنیا کی ہر چیز اصل میں اللہ کی ہے. اور اللہ نے بندوں کو اس کا مالک بنایا ہے. قرآن کریم نے جا بجا بیان فرمایا ہے. اور اس حقیقت کے اعتبار سے اشیائے صرف (Consumer goods) اور وسائل پیداوار (Factors of Production) کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا. چنانچہ زمین کے بارے میں بھی بعینہ یہی بات قرآن کریم نے ان الفاظ میں ارشاد فرمائی ہے:

اِن الارض للہ یورثها من یشاء من عباده

بلاشبہ زمین اللہ کی ہے. اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے. اس کا وارث (مالک) بنا دیتا ہے۔ (۱)

(۱۷) جس طرح زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو گزشتہ آیات میں اصلاً اللہ تعالیٰ کی ملکیت قرار دے کر یہ بتایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں تمہیں مالکانہ حقوق کے ساتھ عطا فرما دی ہیں. بعینہ اسی طرح سورۂ اعراف کی اس آیت میں زمین کے بارے میں بھی یہی بات ارشاد فرمائی گئی ہے کہ وہ اصل میں اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے. لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے. اس کا مالک بنا دیتا ہے۔

(۱۸) تقریباً یہی بات سورۂ انعام کے آخر میں ان الفاظ کے ساتھ ارشاد فرمائی گئی ہے:

و هوالذی جعلکم خلائف الأرض و رفع بعضکم فوق بعض درجات لیبلوکم فی ما آتاکم. اِن ربك سریع العقاب و اِنه لغفور رحیم

اور اللہ ہی ہے جس نے تمہیں زمین کا نائب بنایا. اور تم میں سے بعض کو دوسرے بعض پر درجات کے اعتبار سے فوقیت دی، تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں دیا ہے. اس کے بارے میں تمہیں آزمائے. بلاشبہ وہ بڑی مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ (۲)

---

(۱) الاعراف ۷. ۱۲۸۔

(۲) الانعام ۶. ۱۶۵۔

(۱۹) پھر جس طرح اشیاء صرف اور دوسری املاک کے بارے میں قرآن کریم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ چونکہ ان کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے. اس لئے جس جگہ وہ ان کو خرچ کرنے کا حکم دے. (مثلاً زکوۃ وغیرہ کی صورت میں) وہاں ان کو خرچ کرنا واجب ہے. اسی طرح زمین کے بارے میں بھی یہ ارشاد فرمایا کہ اس کی پیداوار کا ایک حصہ (عشر وغیرہ کی صورت میں) اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا ضروری ہے. چنانچہ ارشاد ہے:
یا ایہا الذین آمنوا انفقوا من طیبات ما کسبتم و مما اخرجنا لکم من الارض

اے ایمان والو! خرچ کرو اپنی پاک کمائیوں میں سے اور ان چیزوں میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالی ہیں۔ (۱)

نیز ارشاد ہے:
وھو الذی انشا جنت معروشات و غیر معروشات و النخل و الزرع مختلفاً اکلہ و الزیتون و الرمان متشابھا و غیر متشابہ. کلوا من ثمرہ اذا اثمر و آتوا حقہ یوم حصادہ ولا تسرفوا. انہ لا یحب المسرفین.

اور (اللہ تعالیٰ) وہی ہے جس نے باغات پیدا کئے. وہ بھی جو ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں. اور وہ بھی جو ٹٹیوں پر نہیں چڑھائے جاتے. اور کھجور کے درخت اور کھیتی. جن میں کھانے کی چیزیں مختلف طور کی ہوتی ہیں. اور زیتون اور انار جو باہم ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں. اور کبھی مشابہ نہیں ہوتے. ان سب کا پھل کھاؤ جب وہ پھل دیں. اور اس میں جو حق واجب ہے. وہ کاٹنے کے دن دیا کرو. اور اسراف نہ کرو. بلاشبہ وہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (۲)

(۲۰) ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم نے "ملکیت" کی حقیقت اور اس کے حقوق و فرائض کے سلسلے میں عام اشیاء صرف اور زمین کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا. بلکہ جس قسم کی انفرادی ملکیت عام اشیاء صرف میں انسانوں کے لئے جائز قرار دی ہے. اسی قسم کی ملکیت زمین پر بھی برقرار رکھی ہے. اور جس قسم کے حقوق عام اموال پر عائد کئے ہیں اسی قسم کے

(۱) البقرۃ ۲: ۲۶۷۔

(۲) سورۃ الانعام ۶: ۱۴۱۔

حقوق زمین پر بھی عائد فرمائے ہیں جس طرح عام اشیاء صرف کے بارے میں فرمایا کہ:

ھوالذی خلق لکم ما فی الأرض جمیعاً۔

(اللہ تعالیٰ) وہی ہے جس نے تمہارے لئے وہ تمام چیزیں پیدا فرمائیں جو زمین میں ہیں۔ (۱)

اسی طرح زمین کے بارے میں فرمایا کہ:

و الأرض وضعھا للأنام.

اور زمینوں کو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے لئے بنایا ہے۔ (۲)

(۲۱) لہٰذا جس طرح پہلی آیت سے اشیاء صرف میں انفرادی ملکیت کی نفی نہیں ہوتی. اسی طرح دوسری آیت سے زمین کی انفرادی ملکیت کی نفی کا کوئی سوال نہیں. حقیقت حال دونوں جگہ یہ ہے کہ اشیاء صرف ہوں یا زمین اور دوسرے وسائل پیداوار. وہ سب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے فائدے کے لئے پیدا فرمائے ہیں. ان پر اصلی اور حقیقی ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے. لیکن اللہ تعالیٰ نے دنیا کا نظام چلانے کے لئے ان پر بندوں کو انفرادی ملکیت کے حقوق عطا فرمائے ہیں. البتہ ساتھ ہی ان پر کچھ فرائض عائد فرمادئے ہیں. کہ وہ اپنی ان املاک سے فائدہ اٹھاتے وقت ان فرائض کو فراموش نہ کریں. اور ان کا ایسا غلط استعمال نہ کریں. جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف ہو۔

(۲۲) ۔ قرآن کریم کے بعد سنت کی طرف آئیں تو اس میں زمین کی انفرادی ملکیت کے احکام اور اس کے حقوق و فرائض اور زیادہ تفصیل کے ساتھ موجود ہیں. ذیل میں چند وہ احادیث ذکر کی جاتی ہیں. جن سے زمین کی انفرادی. ملکیت واضح طور پر ثابت ہوتی ہے.

(۱) حضرت عائشہؓ روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من أعمر أرضاً لیست لأحد فھو أحق

جو شخص کسی ایسی زمین کو آباد کرے جو کسی کی ملکیت میں نہ ہو. تو وہ اس زمین کا زیادہ حقدار ہے۔ (۳)

---

(۱) البقرۃ ۲: ۲۹۔

(۲) الرحمٰن ۵۵/ ۱۰۔

(۳) صحیح البخاری. کتاب الحرث والمزارعۃ. باب من احیا ارضا. حدیث نمبر ۲۳۳۵۔

اس حدیث سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوا کہ بنجر اور غیر مملوک زمین کو آباد کرنے سے وہ آباد کار کی ملکیت میں آجاتی ہے، اور دوسری طرف یہ بھی ثابت ہوا کہ جو زمین کسی کی ملکیت میں ہو، وہ خواہ غیر آباد پڑی ہو، اسے آباد کرنے سے اس پر ملکیت کے حقوق حاصل نہیں ہوتے۔

۲۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ بالا حکم اور بھی متعدد صحابہ کرام سے مروی ہے، مثلاً حضرت سعید بن زیدؓ آپ سے یہ الفاظ روایت فرماتے ہیں:

من أحيا أرضا ميتة فهي له. وليس لعرق ظالم حق

جو شخص مردہ (غیر مملوک، غیر آباد) زمین آباد کرے تو وہ زمین اسی کی ہے، اور دوسرے کی زمین میں ناحق طور پر آباد کاری کرنے والے کو کوئی حق حاصل نہیں۔ (۱)

اور حضرت عروہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں:

أشهد أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قضى أن الأرض أرض الله، والعباد عباد الله، ومن أحيا مواتاً فهو أحق بها، جاء نا بهذا عن النبي صلى الله عليه وسلم الذين جاؤا بالصلوات عنه.

میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ فرمایا کہ زمین اللہ کی ہے، اور بندے بھی اللہ کے ہیں، اور جو شخص کسی مردہ زمین کو آباد کرے، وہ اس کا زیادہ حقدار ہے، ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ انہیں لوگوں نے پہنچایا ہے جنہوں نے آپ سے نمازوں کا حکم ہم تک پہنچایا ہے۔ (۲)

اور حضرت طاؤسؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

عادي الأرض لله وللرسول، ثم لكم من بعد، فمن أحيا أرضا ميتة فهي له.

---

(۱) تلخیص سنن ابی داؤد للمنذری، ص۲۶۵ ج۴، حدیث نمبر ۲۹۴۹

(۲) تلخیص سنن ابی داؤد للمنذری، ص۲۶۶، ج۴، حدیث نمبر ۲۹۵۲، مطبوعہ مکتبہ الاثریہ، سانگلہ ہل، پاکستان۔

(۱) کتاب الخراج لابی یوسف، ص۶۵، مطبوعہ بیروت۔

جس زمین کا مدت سے کوئی والی وارث نہ ہو، وہ اللہ اور رسول کی ہے، پھر بعد میں تمہاری ہے، چنانچہ جو شخص کسی مردہ زمین کو آباد کرے گا، وہ زمین اسی کی ہو جائے گی۔ (۱)

۲۴۔ ان احادیث سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوا کہ زمین اصلاً اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے، لیکن جب کوئی شخص کسی غیر مملوک، لاوارث اور بنجر زمین کو آباد کر لے تو وہ اس کی ملکیت میں آ جاتی ہے، دوسری طرف ان احادیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آباد کاری سے صرف انہی زمینوں پر آباد کار کو ملکیت حاصل ہوتی ہے، جو پہلے سے کسی کی شخصی ملکیت میں نہ ہوں، لیکن اگر زمین پہلے سے کسی شخص کی ملکیت میں ہے تو خواہ وہ غیر آباد کیوں نہ پڑی ہو، اس پر اس کی اجازت کے بغیر آباد کاری جائز نہیں، اور ایسی آباد کاری سے آباد کار کا کوئی حق پیدا نہیں ہوتا، اس طرح یہ احادیث شخصی ملکیت کے ثبوت پر بھی دلالت کرتی ہیں، اور اس بات پر بھی کہ جو زمین کسی کی شخصی ملکیت میں ہو، دوسروں کے ذمے اس کی ملکیت کا احترام اسی طرح واجب ہے جس طرح اشیاء صرف کی ملکیت کا۔

۲۵۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے بنجر زمینیں متعدد صحابہ کرام کو مالکانہ حقوق کے ساتھ عطا فرمائیں، مفتوحہ اراضی کو مجاہدین کے درمیان تقسیم فرما کر انہیں ان اراضی کا مالک بنایا، اور جب بنو نضیر کے یہودی جلاوطن ہوئے تو ان کی متروکہ اراضی مہاجرین میں تقسیم کی گئیں، عبدالرحمٰن بن کعبؓ فرماتے ہیں:

فأعطى النبي صلى الله عليه وسلم أكثرها للمهاجرين و قسمها بينهم، وقسم منها رجلين من الأنصار، كانا ذوي حاجة، لم يقسم لأحد من الأنصار غيرهما.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر کی اکثر زمینیں مہاجرین کو دیدیں، اور انہیں ان کے درمیان تقسیم فرمایا، اور انصار میں سے بھی دو صاحبان کو زمین کا حصہ عطا فرمایا جو ضرورت مند تھے، انصار میں سے ان صاحبان کے سوا کسی کو ان زمینوں میں سے کچھ نہیں دیا۔ (۱)

اسی طرح جب خیبر فتح ہوا تو آپ نے وہاں کی زمینیں مجاہدین میں تقسیم فرمائیں، امام زہریؒ فرماتے ہیں:

---

(۱) تلخیص سنن ابی داؤد ص ۲۳۵ ج ۴، حدیث نمبر ۲۸۸۴۔

خمس رسول الله صلی الله علیه وسلم خیبر۔ ثم قسم سائرها علی من شهدها و من غاب عنها من أهل الحدیبیة۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی اراضی کا پانچواں حصہ بیت المال کے لئے نکالا، پھر باقی تمام اراضی کو غزوۂ حدیبیہ کے شرکاء میں تقسیم فرما دیا۔ جو اس وقت وہاں موجود تھے، ان کو بھی دیا، اور جو موجود نہ تھے ان کو بھی۔ (۲)

(۲۶) اس کے علاوہ بہت سے صحابہ کرام کو آپ نے مختلف اراضی بطور عطیہ عنایت فرمائیں، مثلاً امام ابو داؤد نے اپنی سنن میں اس کے آٹھ نو واقعات ذکر فرمائے ہیں، جن میں مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت وائل بن حجرؓ، حضرت بلال بن حارثؓ حضرت ابیض بن حمالؓ اور حضرت زبیر بن عوامؓ وغیرہ کو زمینیں عطا فرمائیں (۳)

(۲۷) اسی طرح زمینوں کی خرید و فروخت کے بارے میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تفصیلی احکام عطا فرمائے، اور مالکان اراضی کو بیع، ہبہ، وقف، اجارہ اور دوسرے تمام تصرفات کی اجازت عطا فرمائی، جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ نے زمینوں پر شخصی ملکیت کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ جائز قرار دیا۔

(۲۸) نیز جس طرح اشیاء صرف میں کسی غیر مالک کی ناحق مداخلت کو آپ نے ناجائز قرار دیا، اسی طرح زمین میں بھی اس کے مالک کی اجازت کے بغیر کسی بھی تصرف کو ناجائز قرار دے کر مالک زمین کے حقوق کو تسلیم کیا، مثال کے طور پر مندرجہ ذیل دو حدیثیں یہ بات ثابت کرنے کے لئے کافی ہوں گی:۔

(۲۹) حضرت سعید بن زیدؓ (حضرت عمرؓ کے بہنوئی) عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، ایک خاتون نے ان پر دعوی کر دیا کہ انہوں نے اس خاتون کی زمین کے کچھ حصہ پر ناحق قبضہ کر لیا ہے، مقدمہ مروان بن حکم کی عدالت میں پیش ہوا تو انہوں نے اپنے بیان میں کہا کہ "میں ان کی زمین کا کوئی حصہ کیسے لے سکتا ہوں؟ جبکہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:

---

(۲) تلخیص سنن ابی داؤد، ص ۲۳۹ ج ۴، حدیث نمبر ۲۹۰۰، کتاب الخراج والامارۃ۔ باب حکم ارض خیبر۔

(۳) تلخیص سنن ابی داؤد، باب اقطاع الارضین، ص ۲۵۸، ج ۴، حدیث نمبر ۲۹۳۵ تا ۲۹۴۸۔

اس کے علاوہ زمینوں کے بطور عطیہ دینے کے مزید واقعات کے لئے ملاحظہ ہو، کتاب الاموال لابی عبید، کتاب احکام الارضین، باب الاقطاع، ص ۲۷۲ تا ۲۷۴، حدیث نمبر ۶۷۴ تا ۶۹۹۔

من أخذ شبراً من الأرض بغير حقه طوقه فى سبع أرضين يوم القيامة.

جو شخص ایک بالشت برابر زمین بھی ناحق لے گا. قیامت کے دن اس کے گلے میں وہ زمین سات زمینوں کے ساتھ طوق بنا دی جائے گی (۱)

اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ "میں تو اس حدیث کی بنا پر اپنی زمین میں سے چھ سو ہاتھ کے برابر زمین ان خاتون کے حق میں چھوڑ چکا ہوں" بلکہ بعد میں جتنی زمین پر اس خاتون کا دعویٰ تھا. اس سے بھی حضرت سعید بن زیدؓ اسی کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ (۲)

(۳۰) اسی طرح حضرت رافع بن خدیجؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من زرع فى أرض قوم بغير إذنهم فليس له من الزرع شيئ وله نفقته.

جو شخص دوسروں کی زمین میں ان کی اجازت کے بغیر کھیتی کرے اس کے لئے کھیتی کا کوئی حصہ حلال نہیں. ہاں اس کا کیا ہوا خرچ اس کا حق ہے۔

(۳۱) بہرکیف! یہ چند سرسری مثالیں تھیں. ورنہ اگر زمین کی انفرادی ملکیت پر دلالت کرنے والی تمام احادیث کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے. لیکن مذکورہ چند مثالیں بھی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ قرآن و سنت نے زمین پر انفرادی ملکیت کو ٹھیک اسی طرح تسلیم فرمایا ہے جس طرح اشیاء صرف پر. جب کسی زمین پر جائز طریقے سے کوئی ملکیت ثابت ہو جائے. تو اسے وہی مالکانہ حقوق حاصل ہوتے ہیں. جو کسی مالک کو اشیاء صرف پر حاصل ہو سکتے ہیں۔

یہ بات چونکہ ہمارے زیر بحث مقدمات کے دونوں فریقوں کو تسلیم ہے. اس لئے اس نکتے پر مزید تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ (۱)

۲۔ ملکیت کی حد از روئے اسلام

(۳۲) دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا قرآن و سنت نے زمین یا دوسری املاک میں انسان کے لئے ملکیت کی کوئی ایسی حد مقرر فرمائی ہے جس سے زائد ملکیت حاصل کرنا یا باقی رکھنا از روئے شریعت ممنوع ہو؟

---

(۱) صحیح مسلم. کتاب المساقات. باب تحریم الظلم وغصب الارض. حدیث نمبر ۱۱۔۴۔

(۲) حلیۃ الاولیاء لابی نعیم. ص ۹۷ ج ۱. ترجمہ سعید بن زیدؓ۔

۱۔ جامع الترمذی. ابواب الاحکام. باب نمبر ۲۹. حدیث نمبر ۱۳۷۸۔

(۳۳) اس سوال کا جواب بھی سادہ اور واضح ہے، اور غالباً اس میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے، اور وہ یہ کہ اسلام نے حصول ملکیت کے طریقوں پر تو حلال و حرام کی پابندیاں عائد کی ہیں، اور جائز طور پر حاصل کی ہوئی املاک پر کچھ مالی ذمہ داریاں (زکوٰۃ و عشر وغیرہ) بھی لگائی ہیں، لیکن اگر کوئی شخص صرف جائز طریقوں پر اکتفا کرتے ہوئے اپنی املاک میں اضافہ کرے اور ان پر عائد ہونے والے شرعی واجبات بھی ادا کرتا رہے تو پھر املاک کی کوئی ایسی آخری مقدار شریعت نے مقرر نہیں فرمائی جس کے بعد املاک میں کوئی جائز اضافہ ممکن نہ ہو۔

۳۴۔ نہ صرف یہ کہ قرآن و سنت میں جائز طریقے سے حاصل کی ہوئی املاک کی کوئی حد بیان نہیں کی گئی، بلکہ اس کے برعکس ایسی آیات موجود ہیں جن سے ایسی شرعی تحدید کی نفی ہوتی ہے، مثلاً سورۃ بقرہ میں ارشاد ہے:

واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب

اور اللہ جس کو چاہتا ہے، بے حساب رزق دیتا ہے۔ (۱)

ایک دوسرے موقع پر اللہ کے نیک بندوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہے:

رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله و إقام الصلوة و إيتاء الزكوة يخافون يوماً تتقلب فيه القلوب و الأبصار . ليجزيهم الله أحسن ما عملوا و يزيدهم من فضله ، و الله يرزق من يشاء بغير حساب .

وہ لوگ کہ کوئی تجارت یا بیع ان کو اللہ کی یاد، نماز کی اقامت، اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے غافل نہیں کرتی، وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں الٹ جائینگی، تاکہ اللہ ان کو ان کے بہترین اعمال کا بدلہ دے، اور اپنے فضل سے انہیں اور بھی زیادہ دے، اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے، بے حساب رزق عطا فرماتا ہے۔ (۲)

۱۔ البقرۃ ۲/۲۱۲۔

۲۔ النور ۲۴/۳۸۔

۲۔ زیر نظر مقدمے کے نقطہ نظر سے تو واقعتاً اس مسئلے کی مزید تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن اس فیصلے کو کتابی شکل میں شائع کرتے وقت مناسب معلوم ہوا کہ یہاں ان مختلف شبہات کا جواب بھی دیا جائے جو ملکیت زمین کے بارے میں

۳۵۔ اسی طرح قرآن کریم نے متعدد مقامات پر ارشاد فرمایا ہے کہ جو رزق انسان کو حلال طریقے سے حاصل ہو. اسے شکر ادا کر کے استعمال کرنا چاہئے. اور اسے حرام یا ناجائز سمجھنا درست نہیں. ارشاد ہے:

قل من حرم زینة الله التی أخرج لعباده و الطیبات من الرزق.
آپ کہہ دیجئے کہ کس نے حرام کیا ہے اللہ کی اس زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی. اور رزق کی پاکیزہ (حلال) اشیاء کو۔ (۱)

قل أرأیتم ما أنزل الله لکم من رزق فجعلتم منه حراماً و حلالاً قل آلله أذن لکم أم علی الله تفترون.
آپ کہہ دیجئے ذرا مجھے یہ تو بتاؤ کہ اللہ نے جو رزق تمہارے لئے اتارا. پھر تم نے اس میں (اپنی طرف سے) حرام اور حلال کی من گھڑت تقسیم کر لی؟ آپ کہہ دیجئے کیا اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دی تھی؟ یا تم اللہ پر بہتان باندھتے ہو؟ (۲)

۳۶۔ جن ذرائع سے انسان حصول دولت کی کوشش کرتے ہوئے دوسروں کا حق مار سکتا تھا. یا ان پر کسب معاش اور حصول دولت کے دروازے بند کر سکتا تھا. ان کو تو حلال اور حرام کے احکام کے ذریعے اسلام نے خود ہی منع کر دیا. لیکن ان احکام کی رعایت رکھتے ہوئے اگر کوئی شخص اپنی دولت کو بڑھائے تو شریعت کی نظر میں وہ کوئی گناہ یا عیب نہیں ہے. بلکہ اگر نیت بخیر ہو تو موجب اجر بھی ہو سکتا ہے. اگر کوئی شخص جائز اور پاک صاف ذرائع سے حاصل کی ہوئی آمدنی کے ذریعے زیادہ سے زیادہ صنعتیں قائم کرے. زیادہ سے زیادہ زمینوں کو آباد کرے. اور اس جدوجہد میں اپنے اسلامی فرائض کو فراموش نہ کرے تو اس سے مجموعی قومی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے. معاشی سرگرمیوں میں تیزی آتی ہے. روزگار کے مواقع بڑھتے ہیں. اور اگر اسلامی احکام کی پوری رعایت

عموماً اٹھائے جاتے ہیں چنانچہ کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ کا اضافہ کیا جا رہا ہے جو فیصلہ کا حصہ نہیں تھا۔ بعد میں اضافہ کیا گیا۔ جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ اس ضمیمے کا مطالعہ یہیں فرمالیں۔

ہو توانہی سرگرمیوں سے گردش دولت کا دائرہ وسیع ہوتا ہے. غربت میں کمی آتی ہے. اور بالآخر اس سے پورے ملک کے لئے معاشی ترقی کی راہیں کھلتی ہیں۔

لہٰذا یہ تصور درست نہیں ہے کہ کسی شخص کا دولت مند ہونا. یا کارخانوں اور زمینوں کا مالک ہونا بذات خود ہر حالت میں کوئی عیب یا گناہ ہے. یہ عیب اور گناہ اس وقت بنتا ہے. جب انسان اس کے ذریعے دوسروں پر رزق کے دروازے بند کرے. جب حق دار کو اس کا حق نہ دے. جب دوسروں کے حق پر ڈاکہ ڈال کر اپنی تجوری بھرنے کی کوشش کرے. جب حصول دولت کی دوڑ میں حلال اور حرام اور جائز اور ناجائز کی فکر چھوڑ بیٹھے. اور جب اپنے مال پر عائد ہونے والے شرعی واجبات اور حقوق کو پامال کرنے لگے۔ لیکن اگر یہ سب باتیں نہیں ہیں. تو دولت کا زیادہ سے زیادہ حصول بذات خود کوئی خرابی نہیں. اسی لئے قرآن کریم نے جہاں انسان کو کسب معاش اور حلال ذرائع سے حصول مال کی اجازت دی. وہاں اس عمل پر کوئی کمیاتی تحدید (quantitat ion linlt) عائد نہیں کی. مثلاً ارشاد ہے:

ھوالذی جعل لکم الأرض ذلولاً فامشوا فی مناکبھا وکلوا من رزقه و الیه النشور.

> اللہ تعالٰی ہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو رام کر دیا. پس اس کے راستوں میں چلو پھرو. اور اللہ کے رزق میں سے کھاؤ. اور اسی کی طرف پھر زندہ ہو کر جانا ہے۔ (۱)

وکلوا مما رزقکم اللہ حلالاً طیباً

> اور جو کچھ اللہ نے تمہیں رزق دیا ہے. اس میں سے کھاؤ. بشرطیکہ وہ حلال طیب ہو۔ (۲)

فکلوا مما رزقکم اللہ حلالاً طیباً

> پس جو کچھ اللہ نے تمہیں رزق دیا ہے، اس میں سے کھاؤ۔ بشرطیکہ وہ حلال وطیب ہو۔ (۱)

۱۔ الملک ۶۷: ۱۵

۲۔ المائدہ ۵: ۸۸

۱۔ النحل ۱۶: ۱۱۴

کلوا من طیبات ما رزقناکم ولا تطغوا فیہ فیحل علیکم غضبی.

کھاؤ ان پاکیزہ اشیاء میں سے جو ہم نے تمہیں دی ہیں، اور اس میں سرکشی اختیار نہ کرو کہ میرا غضب تم پر نازل ہو۔ (۲)

یا ایہا الذین آمنوا کلوا من طیبات ما رزقناکم و اشکروا للہ

اے ایمان والو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں دی ہیں، اور اللہ کا شکر ادا کرو۔

کلوا مما رزقکم اللہ ولا تتبعوا خطوات الشیطان

کھاؤ ان چیزوں میں سے جو اللہ نے تمہیں دی ہیں، اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ (۴)

کلوا من رزق ربکم واشکروالہ بلدۃ طیبۃ و رب غفور.

کھاؤ اپنے پروردگار کے رزق سے اور اس کا شکر ادا کرو، پاکیزہ شہر اور مغفرت کرنے والا پروردگار۔ (۵)

۳۷۔ اسی طرح یہ حقیقت بھی قرآن کریم نے بہت سے مواقع پر بیان فرمائی ہے کہ رزق کی فراخی اور تنگی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، وہی اپنی حکمت بالغہ سے کسی پر رزق کو کشادہ کر دیتا ہے، اور کسی پر تنگ، مثلاً ارشاد ہے:

لہ مقالید السموات و الأرض یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر

اسی کے قبضے میں ہے آسمانوں اور زمین کی کنجیاں، وہ رزق میں کشادگی پیدا کر دیتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے، اور تنگی پیدا کر دیتا ہے۔ (۱)

اللہ یبسط الرزق لمن یشاء من عبادہ و یقدر لہ

اللہ پھیلا دیتا ہے رزق اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہتا ہے، اور تنگی پیدا کر دیتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے۔ (۲)

۲۔ طہٰ ۲۰:۸۱

۳۔ البقرۃ ۲:۱۷۲

۴۔ الانعام ۶:۱۴۲

۵۔ النساء ۴:۱۵

۱۔ الشوریٰ ۴۲:۱۲ ۲۔ العنکبوت ۲۹:۶۲

نیز ارشاد ہے:

نحن قسمنا بينهم معيشتهم فی الحياة الدنيا و رفعنا بعضهم فوق بعض درجات ليتخذ بعضهم بعضا سخريا و رحمت ربك خير مما يجمعون.

ہم نے تقسیم کی ہے ان کے درمیان ان کی معیشت دنیوی زندگی میں، اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات کے اعتبار سے فوقیت دی ہے، تاکہ یہ ایک دوسرے سے کام لے سکیں، اور تمہارے پروردگار کی رحمت ان (مال و اسباب) سے کہیں بہتر ہے جو یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔ (۳)

۳۸۔ ان آیات قرآنی سے یہ بات واضح ہے کہ نہ صرف یہ کہ قرآن کریم نے جائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی ملکیت کی کوئی کمیاتی حد (Quntitative limit) مقرر نہیں فرمائی، بلکہ ایسی تحدید کی نفی فرمائی ہے، البتہ حلال و حرام کے احکام کے ذریعہ کسب معاش کا نظام ہی ایسا بنا دیا ہے کہ اس میں کسی دوسرے کا حق مار کر ملکیت میں اضافہ کرنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، چنانچہ سود، قمار، احتکار اور اکتناز وغیرہ کو حرام قرار دے کر اور دوسری طرف زکوٰۃ و صدقات اور میراث و وصیت کے احکام جاری فرما کر دولت کے ناجائز طور پر چند ہاتھوں میں سمٹنے کی راہیں مسدود فرما دی ہیں، جس کی کچھ تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔

۳۹۔ لہٰذا دوسرے تنقیح طلب مسئلے کا جواب بھی نفی میں ہے، یعنی قرآن و سنت نے جائز ملکیت کی کوئی کمیاتی حد مقرر نہیں فرمائی، جس کے معنی یہ ہیں کہ حصول دولت اور صرف دولت کے بارے میں شرعی احکام کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر کوئی شخص اپنی املاک میں اضافہ کرنا چاہے تو کسی بھی حد پر پہنچنے کے بعد اس کے راستے میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے۔

۳۔ حکومت کی طرف سے تحدید ملکیت۔

۴۰۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی حکومت کو یہ اختیار ہے کہ وہ مصالح عامہ کے پیش نظر اپنے باشندوں کے لئے ملکیت کی کوئی حد مقرر کر دے؟ اور اس حد سے زائد کوئی چیز ملکیت میں لانے یا رکھنے کو قانوناً ممنوع قرار دے دے؟

۴۱۔ اس سوال کے جواب کے لئے ہم قرآن و سنت اور فقہ اسلامی سے رہنمائی حاصل کرتے

۳۔ الزخرف ۴۳: ۳۲

ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تحدید ملکیت کی کئی صورتیں ممکن ہیں، اور ان میں سے ہر ایک صورت کا حکم جدا ہے۔

۴۲۔ تحدید ملکیت کی پہلی صورت یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے ملکیت کی ایک مستقل حد مقرر کر دی جائے۔ اور یہ مستقل قانون بنا دیا جائے کہ اس سے زائد کوئی چیز نہ ملکیت میں لائی جا سکتی ہے، نہ رکھی جا سکتی ہے، اس طرح کی مستقل تحدید قرآن کریم کی رو سے ہرگز جائز نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ ــ جیسا کہ تنقیح نمبر ۲ کے جواب میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ــ اسلام نے جائز ملکیت پر کوئی حد عائد نہیں کی، لہٰذا شرعی احکام کو ملحوظ رکھتے ہوئے جائز ذرائع سے ملکیت میں اضافہ کرنا جائز اور مباح کام ہے، اور جس چیز کو شریعت نے جائز قرار دیا ہو، اسے مستقل طور پر ممنوع یا حرام قرار دینے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے، قرآن کریم نے متعدد مقامات پر واضح فرمایا ہے کہ جس طرح حرام چیزوں کو حلال کرنا کسی کے لئے جائز نہیں ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے سوا کسی شخص کو یہ بھی اختیار حاصل نہیں ہے کہ کسی حلال چیز کو حرام قرار دے دے۔ ارشاد ہے:

يا أيها الذين آمنوا لا تحرموا طيبات ما أحل الله لكم ولا تعتدوا إن الله لا يحب المعتدين

اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں، ان کو حرام نہ ٹھہراؤ، اور حد سے تجاوز نہ کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (۱)

قل من حرم زينة الله التي أخرج لعباده و الطيبات من الرزق.

آپ کہہ دیجئے کہ کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہے، اور رزق کی پاکیزہ اشیاء کو۔ (۲)

قل أرأيتم ما أنزل الله لكم من رزق فجعلتم منه حراماً و حلالاً قل آلله أذن لكم أم على الله تفترون.

آپ کہہ دیجئے کہ ذرا بتاؤ تو سہی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جو رزق اتارا تھا، پھر تم نے اس میں سے کچھ کو حرام اور کچھ کو حلال بنا ڈالا۔ آپ کہئے کہ اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دی تھی، یا تم اللہ پر بہتان باندھتے ہو؟ (۳)

۱۔ المائدۃ ۵: ۸۷   ۲۔ الاعراف ۷: ۳۲   ۳۔ یونس ۱۰: ۵۹

قد خسر الذین قتلوا أولادھم سفھاً بغیر علم و حرموا ما رزقھم اللہ افتراء علی اللہ. قد ضلوا و ما کانوا مھتدین.

واقعی خسارے میں ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو بے وقوفی میں نادانی سے قتل کر ڈالا، اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جو رزق عطا فرمایا تھا، اس کو حرام کر لیا. اللہ پر بہتان باندھ کر. یہ لوگ گمراہ ہوئے. اور راہ پر نہیں آئے۔ (۱)

ولا تقولوا لما تصف ألسنتکم الکذب ھذا حلال و ھذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب ان الذین یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون.

اور جن چیزوں کے بارے میں تمہارا جھوٹا زبانی دعویٰ ہے. ان کے بارے میں یوں نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے، جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اللہ پر جھوٹ بہتان باندھو گے، بلاشبہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ بہتان باندھتے ہیں، وہ فلاح نہیں پائیں گے۔ (۲)

قل ھلم شھداء کم الذین یشھدون أن اللہ حرم ھذا فإن شھدوا فلا تشھد معھم ولا تتبع أھواء الذین کذبوا بآیاتنا والذین لا یومنون بالآخرة و ھم بربھم یعدلون.

آپ کہہ دیجئے لاؤ اپنے وہ گواہ جو یہ گواہی دیں کہ اللہ نے اس چیز کو حرام کیا ہے، پھر اگر وہ گواہی دیں بھی تو اس کا اعتبار نہ کیجئے، اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے جنہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا، اور جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اور جو اپنے پروردگار کے برابر دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ (۱)

یا أیھا النبی لم تحرم ما أحل اللہ لک

اے نبی! آپ اس چیز کو حرام کرتے ہیں، جو اللہ نے آپ کے لئے حلال قرار دی ہے۔ (۲)

۴۳۔ ان آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس طرح کسی چیز کو حلال کر لینا کسی کے لئے

جائز نہیں، اسی طرح جس چیز کو قرآن و سنت نے حرام قرار نہ دیا ہو، اسے اپنی طرف سے حرام یا مستقلاً ممنوع قرار دینے کا بھی کسی کو حق نہیں ہے۔ اور ایسی حلال اشیاء کو کسی شرعی دلیل کے بغیر حرام اور مستقل طور پر ممنوع قرار دینا اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھنے کے مترادف ہے۔

۴۴۔ لہٰذا جب قرآن و سنت نے جائز طریقے سے حاصل کی ہوئی املاک کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی، تو اپنی طرف سے کوئی حد مقرر کر کے اس سے زائد املاک کے حصول کو مستقل طور پر ناجائز قرار دینا ایک حلال کو حرام کرنا ہے، جس کا کسی کو اختیار نہیں، اور اگر کوئی قانون مستقل طور پر ایسی تحدید عائد کرے تو وہ قرآن و سنت کے احکام سے یقیناً متصادم ہو گا۔

عارضی تحدید ملکیت۔

۴۵۔ تحدید ملکیت کی دوسری صورت یہ ہے کہ کسی مصلحت عامہ کی خاطر عارضی طور پر کچھ عرصے کے لئے ملکیت کی کوئی حد مقرر کر دی جائے۔ اس عارضی تحدید ملکیت میں بھی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱) ایک صورت یہ ہے کہ مالکوں کی موجودہ املاک کو چھیڑے بغیر یہ حکم جاری کیا جائے کہ آئندہ کوئی شخص فلاں چیز ایک مقررہ حد سے زیادہ اپنی ملکیت میں نہیں لا سکے گا۔

(۲) اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی بھی چیز کی ملکیت کی ایک حد اس طرح مقرر کر دی جائے کہ جس شخص کے پاس اس وقت بھی وہ چیز اس مقررہ حد سے زیادہ موجود ہو، اسے وہ زائد مقدار حکومت کے حوالے کرنی ہو گی، اور آئندہ اس حد سے زیادہ وہ چیز ملکیت میں لانا جائز نہیں ہو گا۔

ان دونوں صورتوں پر الگ الگ گفتگو کرنا ضروری ہے۔

۴۶۔ جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے، وہ درحقیقت ملکیت کی تحدید نہیں ہے، بلکہ ملکیت کی کسی خاص شکل کے حد سے زیادہ استعمال پر پابندی ہے، مثلاً مصالح عامہ کے پیش نظر عارضی طور پر یہ قانون بنا دیا جائے کہ جس شخص کے پاس سو ایکڑ یا اس سے زیادہ زمین موجود ہے، وہ اب کوئی نئی زمین نہیں خرید سکتا، یا جس شخص کے پاس رہائش کے لئے ایک مقررہ رقبے کا مکان موجود ہے، وہ اب کوئی نیا مکان نہیں بنا سکتا۔

۴۷۔ اس قسم کی تحدید اگر مصالح عامہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکومت کی طرف سے عائد کی

جائے. اور اسکا مقصد کسی حلال کو حرام کرنا نہیں، بلکہ عارضی طور پر ایک انتظامی حکم جاری کرنا ہو تو قرآن و سنت سے اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے. اس لئے کہ اس کا حاصل ایک مباح کام پر عارضی پابندی لگانا ہے. اور اسلامی حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ مصالح عامہ کے پیش نظر کسی مباح کام پر عارضی طور سے کوئی پابندی عائد کر دے. اور ایسی صورت میں عوام پر واجب ہے کہ وہ اس حکم کی تعمیل کریں. قرآن کریم کا ارشاد ہے:

یا أیھا الذین آمنوا أطیعوا اللہ و أطیعوا الرسول و أولی الأمر منکم.

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اور اپنے میں سے ذمہ داروں کی اطاعت کرو۔ (۱)

۴۸۔ اس آیت میں أولی الأمر (حکام) کی اطاعت کو اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت سے الگ کر کے مستقل طور پر ذکر کیا گیا ہے، لہٰذا اس اطاعت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان معاملات میں أولی الأمر کی اطاعت کرو جو شرعاً فرض یا واجب ہیں. کیونکہ فرائض و واجبات پر عمل تو درحقیقت أولی الأمر کی نہیں، بلکہ اللہ اور رسول کی اطاعت ہے. لہٰذا "اولوالامر" کی اطاعت کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ جب وہ مباحات کے سلسلے میں کوئی حکم دیں تو اس کی اطاعت واجب ہے، البتہ یہ اطاعت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ ان کا وہ حکم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کسی حکم کے خلاف نہ ہو، چنانچہ اسی آیت میں آگے ارشاد ہے:

فإن تنازعتم فی شیئی فردوہ إلی اللہ و الرسول

پس اگر کسی معاملے میں تمہارے درمیان نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔ (۱)

۴۹۔ عام مسلمانوں اور "اولوالامر" کے درمیان نزاع کی عملی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ "اولوالامر" کوئی حکم جاری کریں، اور عام مسلمان اس حکم کو پسند نہ کریں. ایسی صورت میں ہدایت یہ دی گئی کہ اس حکم کو قرآن و سنت کے معیار پر جانچ کر دیکھو، اگر اس حکم میں قرآن و سنت کے کسی حکم کی خلاف ورزی کی گئی ہے تو پھر وہ حکم واجب الاطاعت نہیں، ہاں اگر اس میں قرآن و سنت کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوتی تو پھر وہ امیر کا حکم ہونے کی حیثیت سے واجب التعمیل ہے۔

۱۔ النساء ۴: ۵۹۔

۵۰۔ یہی اصول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں بیان فرمایا ہے. مثلاً":

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما، عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال : السمع و الطاعة حق، مالم یؤمر بمعصیة، فإذا أمر بمعصیة فلا سمع ولا طاعة.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (امیر کی) بات سننا اور ماننا برحق ہے، جب تک وہ کسی معصیت کا حکم نہ دے، پس اگر وہ کسی معصیت کا حکم دے، تو پھر سننا ماننا نہیں۔ (۲)

نیز حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من یطع الأمیر فقد أطاعنی، و من یعص الأمیر فقد عصانی، و إنما الإمام جنة یقاتل من وراءه، و یتقی به، فإن أمر بتقوی اللہ و عدل، فإن له بذالك أجرا، و إن قال بغیره، فإن علیه منه.

جو شخص امیر کی اطاعت کرے، وہ میری اطاعت کرتا ہے، اور جو امیر کی نافرمانی کرے، وہ میری نافرمانی کرتا ہے، امام تو ایک ڈھال ہے جس کے پیچھے ہو کر جنگ کی جاتی ہے، اور اس سے بچاؤ کیا جاتا ہے، پس اگر وہ خوف خدا کے ساتھ حکم دے اور انصاف کرے تو وہ ثواب کا مستحق ہے، اور اگر اس کے خلاف حکم دے تو اس پر اس حکم کی وجہ سے عذاب ہو گا۔ (۱)

۵۱۔ بہرصورت! قرآن و سنت کے احکام سے یہ بات واضح ہے کہ مباحات کے دائرے میں اسلامی حکومت کوئی ایسا حکم دے جس میں اس نے قرآن و سنت کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کی ہو، تو اس کی اطاعت واجب ہے، اور اگر وہ ایسا حکم انصاف کے ساتھ عوام کی مصلحت کے لئے دے تو وہ اس کے لئے باعث اجر ہے۔

۵۲۔ چنانچہ فقہاء اسلام نے بھی یہ اصول بیان کیا ہے کہ مباحات کے دائرے میں امیر کا حکم واجب الاطاعت ہے. فقہ حنفی کی مشہور کتاب "رد المحتار" میں علامہ ابن عابدین شامیؒ نے کئی مقامات پر اس اصول کا تذکرہ کیا ہے کہ:

۲۔ صحیح بخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب السمع والطاعة للامام، حدیث نمبر ۲۹۵۵

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب نمبر ۱۰۹، حدیث نمبر ۲۹۵۷۔

طاعة الإمام فی ما لیس بمعصیة واجبة
امام (سربراہ حکومت) کی طاعت ان چیزوں میں واجب ہے جو معصیت نہ ہوں۔ (۲)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

إذا أمر الإمام بالصیام فی غیر الأیام المنہیة وجب، لما قدمنا فی باب العیدین من أن طاعة الإمام فیما لیس بمعصیة واجبة.

جن دنوں میں روزہ رکھنا شرعی اعتبار سے ممنوع نہیں ہے، اگر ان میں کسی دن امام روزہ رکھنے کا حکم دے تو اس دن روزہ رکھنا واجب ہے، کیونکہ ہم پہلے باب العیدین میں لکھ چکے ہیں کہ جو بات معصیت نہ ہو، اس میں امام کی اطاعت واجب ہے۔ (۱)

۵۳۔ اسی مسئلہ کو علامہ شامیؒ کے صاحب زادے علامہ علاء الدین ابن عابدینؒ نے علامہ بیریؒ کے حوالے سے زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھا ہے، وہ فرماتے ہیں:

إن الحاکم لو أمر أهل بلدة بصیام أیام بسبب الغلاء أو الوباء وجب امتثال أمره.

حاکم اگر کسی شہر کے باشندوں کو مہنگائی یا وباء کی وجہ سے کچھ دن روزہ رکھنے کا حکم دے تو اسکے حکم کی تعمیل واجب ہے (۲)

۵۴۔ لیکن اس اصول کے ساتھ ہر جگہ یہ شرط موجود ہے کہ حاکم کا صرف وہ حکم قابل اطاعت ہے جو قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو، اور عوام کی مصلحت کے مطابق ہو، لہٰذا حاکم کے حکم کے جائز طور پر واجب الاطاعت ہونے کے لئے مندرجہ ذیل شرائط ضروری ہیں:

(۱) وہ حکم مباحات کے دائرے میں ہو۔
(۲) اس حکم سے قرآن و سنت کے کسی حکم کی خلاف ورزی لازم نہ آتی ہو۔
(۳) اس حکم سے کسی پر ظلم نہ ہوتا ہو۔
(۴) وہ حکم مصلحت کے مطابق ہو۔

---

(۱) رد المحتار، ص ۹۲ ۷ ج ۱، باب الاستسقاء۔ ۲۔ رد المحتار، ص ۷۸۰ ج ۱، کتاب الصلاۃ، باب العیدین۔

(۲) تکملہ رد المحتار، ص ۵۴ ج ۲۔

ان شرائط کے ساتھ حاکم کا حکم واجب التعمیل ہے. اور اسی اصول کو فقہاء کرام نے اپنے اس معروف اصول (maxim) کے ذریعہ بیان کیا ہے کہ:

تصرف الامام علی الرعیة منوط بالمصلحة

امام کی رعیت پر تصرف مصلحت کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ (۱)

۵۵۔ لہٰذا اگر کوئی اسلامی حکومت مصالح عامہ کے پیش نظر یہ حکم جاری کرے کہ آئندہ کوئی باشندہ فلاں چیز مقررہ حد سے زائد اپنے اختیار سے اپنی ملکیت میں نہ لائے تو چونکہ اس حکم سے مذکورہ بالا ۴ شرائط کی خلاف ورزی لازم نہیں آتی، اس لئے، ایسا حکم جائز اور واجب التعمیل ہے، چنانچہ ایسی تحدید ملکیت جس میں کسی کی ملکیت چھیننی نہ پڑے، بلکہ اس کے طریق استعمال پر پابندی عائد کی گئی ہو، مصالح عامہ کے تحت ہو تو شریعت کے خلاف نہیں ہے۔

مالکوں سے املاک چھین کر تحدید ملکیت

۵۶۔ تحدید ملکیت کی دوسری صورت یہ ہے کہ مالکوں سے ان کی موجودہ املاک چھین کر ان کی ملکیت پر تحدید عائد کی جائے. یعنی یہ قانون بنا دیا جائے کہ جس شخص کے پاس مقررہ حد سے زائد کوئی جائیداد ہوگی. وہ اس سے لے لی جائے گی. پھر اس تحدید کی بھی دو صورتیں ہیں:

(۱) یہ کہ چھینی ہوئی جائیداد کا کوئی معاوضہ مالک کو ادا نہ کیا جائے۔

(۲) یہ کہ جو جائیداد اس سے لی گئی ہے، اس کا معاوضہ ادا کیا جائے۔

یہی دو صورتیں زیر نظر مقدمے سے براہ راست متعلق ہیں، اور ان کے بارے میں یہ دیکھنا ہے کہ قرآن و سنت کی رو سے حکومت کے لئے ایسی تحدید عائد کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۵۷۔ جہاں تک پہلی صورت (بلا معاوضہ جائیدادیں لے لینے) کا تعلق ہے، اگر وہ جائیدادیں ناجائز طریقے سے حاصل کی گئی ہیں، تو انہیں ضبط کر کے اصل مالکوں یا مستحقین کو دیدینا نہ صرف جائز، بلکہ اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل ہے، لیکن اگر وہ جائیدادیں جائز طریقے سے حاصل کی گئی ہیں تو قرآن و سنت کی رو سے ان پر بلا معاوضہ قبضہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس سوال کا تعلق اسلام کے مجموعی معاشی نظام سے ہے، اور اس سوال کو اسلام کی دوسری معاشی تعلیمات سے الگ کر کے دیکھنا کسی طرح درست نہیں، بلکہ اسی سے غلط فہمیوں کا آغاز ہوتا ہے۔

۵۸۔ جب سے دنیا میں اشتراکی نظام معیشت ایک نئے نظام کی صورت میں سامنے آیا ہے،

(۱) الاشباہ والنظائر، ص ۱۵۷ ج ۱۔

اس وقت سے بیجا ارتکاز دولت کے خاتمے، منصفانہ تقسیم دولت اور فلاحی معاشی نظام کا تصور نیشنلائزیشن کے ساتھ وابستہ ہو کر رہ گیا ہے، اور بعض ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ دولت کے صرف چند ہاتھوں میں سمٹنے، اور دوسروں کے اس سے محروم ہونے کا صرف ایک ہی علاج ہے، اور وہ نیشنلائزیشن یا تحدید ملکیت، اس کے علاوہ منصفانہ تقسیم دولت کا کوئی راستہ نہیں ہے، لہٰذا اگر کوئی نظام معیشت نیشنلائزیشن یا تحدید ملکیت کا قائل نہ ہو تو وہ لازماً بیجا ارتکاز دولت کا حامی اور منصفانہ تقسیم دولت کا مخالف ہو گا، اور اس سے ضرور سرمایہ دارانہ معیشت کو تقویت ہو گی۔

۵۹۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تصور اسلام کے معاشی احکام اور اس کے بنائے ہوئے منصفانہ نظام معیشت سے ناواقفیت پر مبنی ہے، اسلام بیک وقت بیجا ارتکاز دولت کا پر زور مخالف بھی ہے، اور جائز ملکیت کے احترام کا پر زور داعی بھی، اس نے اپنی معاشی تعلیمات و احکام کے ذریعہ دولت کی آمد و خرچ کا نظام ہی ایسا بنایا ہے کہ اس کو اپنانے سے دولت صرف چند ہاتھوں میں سمٹ کر کوئی فتنہ نہیں بن سکتی، اسلام کے وہ احکام جو بیجا ارتکاز دولت کے فتنے پر موثر بند باندھتے ہیں، میں انشاء اللہ آگے ذکر کرونگا، لیکن یہاں صرف اس بات کی طرف توجہ دلانی ہے کہ اگر اسلام کسی کی جائز ملکیت کو زبردستی بلا معاوضہ لینے کو منع کرتا ہے تو اس کے معنی ہرگز یہ نہ سمجھنے چاہئیں کہ وہ بیجا ارتکاز دولت کو جواز کا کھلا لائسنس دے رہا ہے، اس لئے کہ اس نے دوسرے راستوں سے اس کا مکمل انسداد کر دیا ہے، جن کی کچھ تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔

۶۰۔ اس تمہید کے بعد کسی کی ملکیت کو بلا معاوضہ چھین لینے کے بارے میں قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کے احکام ذیل میں پیش کرتا ہوں: (۱)

۶۱۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

یا أیها الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارة عن تراض منکم ولا تقتلوا أنفسکم إن الله کان بکم رحیما. و من یفعل ذالك عدوانا و ظلما فسوف نصلیه نارا، وکان ذالك علی الله یسیرا

---

(۱) واضح رہے کہ یہاں گفتگو کسی کی جائیداد کو چھین لینے کی ہو رہی ہے، اس جائیداد پر شرعی یا سرکاری واجبات جو زکوٰۃ یا جائز ٹیکسوں کی شکل میں ہو سکتے ہیں، ان کی اسلام میں کس حد تک اجازت ہے؟ یہ ایک مستقل موضوع ہے، جو اس وقت ہمارے پیش نظر نہیں۔

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر مت کھاؤ، لیکن کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے واقع ہو تو مضائقہ نہیں، اور تم ایک دوسرے کو قتل نہ کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر بڑے مہربان ہیں۔ (۱)

اس آیت میں یہ اصول واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے کہ کسی بھی شخص کا کوئی مال اس کی مرضی اور معاوضے کے بغیر کسی کے لئے حلال نہیں، آیت میں جو "ناحق طور پر" کہا گیا ہے. اس کی تفسیر میں امام فخر الدین رازیؒ امام المفسرین حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت حسن بصریؒ سے نقل کرتے ہیں:

"الباطل هو كل ما يؤخذ من الانسان بغير عوض"

ناحق ہر وہ مال ہے جو کسی انسان سے بلامعاوضہ (زبردستی) لیا جائے۔ (۲)

۶۲۔ اسی اصول کو ایک دوسری جگہ اس طرح ارشاد فرمایا گیا ہے:

ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل و تدلوا بها إلى الحكام لتأكلوا فريقاً من أموال الناس بالإثم و أنتم تعلمون.

اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق مت کھاؤ، اور ان کو حکام کے پاس اس غرض سے مت لے جاؤ، کہ لوگوں کے مال کا ایک حصہ گناہ کے طریقے پر کھاؤ، جب کہ تمہیں علم بھی ہو (کہ ایسا کرنا جائز نہیں) (۱)

۶۳۔ لوگوں کی جائز املاک کے مکمل احترام کی تاکید اور ان پر ان کی رضامندی کے بغیر دست اندازی کی مذمت قرآن کریم نے اور بھی کئی آیتوں میں بیان فرمائی ہے۔ (۲)

۶۴۔ قرآن کریم نے ارشاد فرمایا ہے:

ولا تبخسوا الناس أشياء هم ولا تعثوا فى الأرض مفسدين.

اور لوگوں کے لئے ان کی چیزوں میں کمی نہ کرو، اور زمین میں فساد پھیلاتے نہ پھرو۔ (۳)

---

(۱) النساء ۴: ۲۹ و ۳۰۔

(۲) التفسیر الکبیر للرازی، ص ۶۹ و ۷۰، ج ۱، مطبوعہ ایران۔

(۱) البقرۃ ۲: ۱۸۸

(۲) ملاحظہ ہو، النساء ۴: ۲ و ۱۰ و ۱۶۱۔ والتوبۃ ۹: ۳۴، الانعام ۶: ۱۵۲، بنی اسرائیل ۱۷: ۳۴۔

(۳) ھود ۱۱: ۸۵ والشعراء ۲۶: ۱۸۳۔

یہ جملہ قرآن کریم میں تین جگہ حضرت شعیب علیہ السلام کی زبانی کہلایا گیا ہے. ان کی قوم ناپ تول میں کمی کرنے کی عادی تھی. اس لئے حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں اس بری عادت کو چھوڑنے کے لئے پہلے تو صاف طور پر فرمایا کہ "ناپ تول میں کمی نہ کرو" اس کے بعد یہ عمومی جملہ ارشاد فرمایا کہ "لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو" مشہور مفسر علامہ ابو حیان اندلسی فرماتے ہیں کہ پہلے تو انہیں ایک خاص جرم سے منع فرمایا گیا جو خرید و فروخت کے وقت ناپ تول میں کمی کی صورت میں کیا جاتا تھا. بعد میں "لاتبخسوا الناس اشیاءہم" فرما کر ہر طرح کے حقوق میں کتر بیونت اور کمی کو عمومی طور پر منع کر دیا۔ (۴)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت صرف ناپ تول میں کمی کے محدود معنی پر ہی دلالت نہیں کرتی. بلکہ لوگوں کی جائز املاک میں ہر ایسا تصرف جو ان میں کمی کا باعث ہو. اس کے عموم میں داخل ہے. لفظ "بخس" کے معنی عربی زبان میں "کمی کرنے" کے آتے ہیں. اور ایک حدیث میں یہ لفظ ٹھیک "تحدید ملکیت" کے معنی میں آیا ہے. اور اس میں حکومت کی طرف سے لوگوں کی جائز املاک میں کمی کرنے کی مذمت کی گئی ہے. اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

يأتي على الناس زمان يستحل فيه الربا بالبيع ، و الخمر بالنبيذ ، والبخس بالزكاة.

لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آ جائے گا جس میں سود کو بیع کے بہانے حلال کیا جائے گا. شراب کو نبیذ (شربت خرما یا شربت جو) کے بہانے. اور بخس (لوگوں کا مال کم کر کے قبضہ کرنے) کو زکوٰۃ کے بہانے۔ (۱)

حدیث کا مطلب واضح طور پر یہ ہے کہ سود، شراب اور غصب کو اس دلیل سے حلال کیا جائے گا کہ جو مقصد بیع. نبیذ اور زکوٰۃ کا ہے. ہم ان کاموں کے ذریعہ وہی مقصد پورا کر رہے ہیں. لہٰذا یہ حلال کام ہیں. اور "غصب" کے لئے "زکوٰۃ" کا بہانہ استعمال کرنے سے صاف واضح ہے کہ یہاں کسی شخص کے انفرادی غصب کا ذکر نہیں ہو رہا ہے جو حکومت کی طرف سے ہو. کیونکہ زکوٰۃ کا بہانہ وہی استعمال کر سکتی ہے. (۲) اور حکومت بھی زکوٰۃ کا بہانہ اسی وقت اختیار کر سکتی ہے

---

(۴) البحرا لمحیط۔

(۱) الفائق للزمخشری ص۶۵ ج۱. و غریب الحدیث لابن جوزی ص۵۸ ج۱. ولسان العرب لابن منظور ص۲۵ ج۶۔

(۲) چنانچہ مشہور محدث اور فقیہ امام اوزاعیؒ نے اس حدیث کی یہی تشریح فرمائی ہے. کہ اس سے مراد حکام کی طرف سے لوگوں کے اموال پر قبضہ کرنا ہے۔ (دیکھئے. لسان العرب ص۲۵ ج۶)

جب وہ یہ غصب ذاتی عیش و عشرت کے لئے نہ کر رہی ہو، بلکہ بزعم خود "مصالح عامہ" کے نام پر کر رہی ہو، کیونکہ اسی وقت یہ کہا جا سکتا ہے کہ لوگوں سے یہ مال اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے لیا جا رہا ہے جس مقصد کے لئے زکوٰۃ شریعت نے فرض کی ہے، اس کے باوجود حدیث میں اسے "بخس" قرار دے کر مذکورہ آیت قرآنی کے عموم میں داخل فرمایا گیا ہے، اور حلال قرار دینے کی مذمت فرمائی گئی ہے، جس سے صاف واضح ہے کہ مذکورہ آیت قرآنی حکومت کی طرف سے لوگوں کی جائز املاک کو بلا معاوضہ لینے کی حرمت پر دلالت کر رہی ہے۔

۶۵۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو عظیم الشان خطبہ دیا، اس میں اسلامی تعلیمات کا نچوڑ اور اسلام کے سیاسی، معاشی اور سماجی اصولوں کا امتیاز نہایت واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا، اس خطبے کا ایک اہم حصہ یہ ہے:

«فان دماءکم و أموالکم و أعراضکم علیکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا فی بلدکم ھذا فی شھرکم ھذا»

پس تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری آبرو تم پر ایسی ہی حرمت کی حامل ہے جیسے اس (مبارک) مہینے، اور اس (مبارک) شہر میں تمہارے اس دن (یعنی یوم حج) کی حرمت ہے۔ (۱)

۶۶۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

کل المسلم علی المسلم حرام، دمہ و مالہ و عرضہ۔

ہر مسلمان پورے کا پورا دوسرے مسلمان کے لئے حرام ہے، اس کا خون بھی، اس کا مال بھی، اور اس کی آبرو بھی۔ (۲)

حضرت صخر بن عیلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں:

إن القوم إذا أسلموا أحرزوا أموالھم و دماءھم۔

بلاشبہ جب کوئی قوم مسلمان ہو جائے تو وہ اپنے مال اور اپنے خون کو محفوظ کر لیتی

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب العلم، باب لیبلغ العلم الشاھد الغائب، حدیث نمبر ۱۰۵، و صحیح مسلم، ج ۲ ص ۶۰، کتاب القسامہ، باب تغلیظ تحریم الدماء والاعراض والاموال۔

(۲) صحیح مسلم، ج ۲ ص ۳۱۷، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ واحتقارہ و دمہ و عرضہ و مالہ۔

ہے۔ (۱)

۶۸۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من ظلم قید شبر من الأرض طوقه من سبع أرضین.

جو شخص کسی کی بالشت بھر زمین بھی ناحق لے لے، اس کے گلے میں سات زمینوں کا طوق ڈالا جائے گا۔ (۲)

۶۹۔ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من ظلم من الأرض شیئا طوق من سبع أرضین.

جو شخص کسی کی بالشت بھر زمین بھی ناحق لے لے، اس کے گلے میں سات زمینوں کا طوق ڈالا جائے گا۔ (۲)

۷۰۔ حضرت عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من أخذ من الأرض شیئا بغیر حقه خسف به یوم القیامة إلی سبع أرضین.

جو شخص زمین کا کوئی بھی حصہ حق کے بغیر لے لے، اسے قیامت کے دن سات زمینوں میں دھنسایا جائے گا۔ (۱)

۷۱۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا یأخذ أحد شبراً من الأرض بغیر الحق إلا طوقه الله تعالی إلی سبع ارضین.

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ، باب اقطاع الارضین، حدیث نمبر ۳۰۶۷ وسنن الدارمی ص ۱۴۶ ج ۲، حدیث نمبر ۲۴۸۳۔

(۲) صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب نمبر ۱۳، حدیث نمبر ۲۴۵۳، وکتاب بدء الخلق، حدیث نمبر ۳۱۹۵۔

(۳) صحیح بخاری، کتاب المظالم، حدیث نمبر ۲۴۵۲، وبدء الخلق، حدیث نمبر ۳۱۹۸۔

(۱) صحیح بخاری، کتاب المظالم، حدیث نمبر ۲۴۵۴، وبدء الخلق ۔ حدیث نمبر ۳۱۹۶۔

کوئی بھی شخص بالشت بھر زمین ناحق نہیں لیتا، مگر اللہ تعالیٰ اس کے گلے میں سات زمینوں کا طوق ڈال دیں گے۔ (۲)

۷۲۔ حضرت ابو حمید ساعدی نے رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا يحل لمسلم أن يأخذ مال أخيه بغير حق، و ذالك لما حرم الله مال المسلم على المسلم عصا أخيه بغير طيب نفس.

کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کا مال کسی حق کے بغیر لے. اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کا مال مسلمان پر حرام کیا ہے. اور اس کو بھی حرام کیا ہے کہ کوئی اپنے بھائی کی لاٹھی بھی اس کی خوش دلی کے بغیر لے۔ (۳)

۷۳۔ حضرت عمر بن یثربی روایت فرماتے ہیں کہ:

سمعت خطبة النبي ﷺ بمنى، فكان فيما خطب به أن قال: لا يحل لامرى من مال أخيه إلا ما طابت به نفسه.

میں نے منیٰ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ سنا، اس خطبے میں آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ کسی شخص کے لئے اپنے بھائی کے مال سے کوئی چیز بھی حلال نہیں ہے، سوائے اس کے جو وہ خود خوش دلی سے دیدے۔ (۱)

۷۴۔ حضرت واثلہ بن اسقع روایت فرماتے ہیں کہ:

سمعت رسول الله ﷺ يقول: المسلم على المسلم حرام دمه، و عرضه، وماله.

میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا مسلمان مسلمان پر حرام ہے، اس کا خون بھی، اس کی آبرو بھی، اور اس کا مال بھی۔ (۲)

---

(۲) صحیح مسلم۔ کتاب المساقات۔ باب تحریم الظلم و غصب الارض و غیرها۔

(۳) (موارد الظمآن للہیثمی ص ۲۸۳ و مسند احمد ج ۵ ص ۴۲۵ و کشف الاستار للہیثمی ص ۱۳۴ ج ۲. و رجال الجمیع رجال الصحیح. کمافی مجمع الزوائد ص ۱۷۱ ج ۴)

(۱) مجمع الزوائد. ص ۱۷۱ ج ۴. بحوالہ مسند احمد. ج ۵ ص ۱۱۳. و معجم کبیر طبرانی. و رجال احمد ثقات۔

(۲) رجالہ ثقات. کمافی مجمع الزوائد. ص ۱۷۲ ج ۴. و مسند احمد. ج ۳ ص ۴۹۱۔

۷۵۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

حرمة مال المسلم كحرمة دمه

مسلمان کے مال کی حرمت اس کے خون کی حرمت کی طرح ہے۔ (۳)

۷۶۔ ابو حرہ الرقاشی اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه

کسی مسلمان شخص کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں۔ (۱)

۷۷۔ حضرت سائب بن یزید روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:

لا يأخذ أحدكم متاع صاحبه لاعباً ولا جاداً، وإذا أخذ أحدكم متاع صاحبه فليردها إليه.

تم سے کوئی شخص اپنے ساتھی کا کوئی سامان نہ مزاق میں لے، نہ سنجیدگی سے، اور اگر کسی کا کوئی سامان کبھی لیا ہو تو اسے اسی کو لوٹا دے۔ (۲)

۷۸۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ:

قلت: يا رسول الله! أي الظلم أظلم؟ فقال: ذراع من الأرض ينتقصها المرء المسلم من حق أخيه، إلا طوقها يوم القيامة إلى قعر الأرض ولا يعلم قعرها إلا الله الذي خلقها.

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! سب سے بڑا ظلم کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: اگر ایک گز زمین بھی کوئی مسلمان شخص اپنے بھائی کے حق میں سے کم کرے، تو اسے قیامت کے دن زمین کی تہہ تک اس کے گردن میں طوق بنا دیا جائے گا، اور زمین کی تہہ کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں جس نے اسے پیدا کیا ہے۔ (۱)

---

(۳) مجمع الزوائد، ص ۱۷۲ ج ۴، و کشف الاستار للہیثمی، ج ۲ ص ۱۳۴۔

(۱) مجمع الزوائد، ص ۱۷۲ ج ۴، بحوالہ مسند ابویعلی۔

(۲) مجمع الزوائد، ص ۱۷۲ ج ۴، بحوالہ المعجم الکبیر للطبرانی۔

(۱) مجمع الزوائد، ص ۱۷۴، ج ۴، و مسند احمد، ج ۱ ص ۳۹۷، و معجم الکبیر للطبرانی، و اسناد احمد حسن۔

۷۹۔ حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أعظم الغلول عند الله عز و جل ذراع من الأرض ، تجدون الرجلين جارين فی الأرض أو فی الدار ، فیقتطع أحدهما من حظ صاحبه ذراعا إذا اقتطعه طوقه من سبع أرضين إلی یوم القیامة.

اللہ تعالیٰ کے نزدیک عظیم ترین خیانت ایک گز زمین (میں خیانت) ہے، تم اگر دیکھو کہ دو آدمی کسی زمین یا کسی گھر میں پڑوسی ہیں، پھر ان میں سے ایک شخص اپنے ساتھی کے حصے سے ایک گز کاٹ کر لے لیتا ہے تو جب وہ ایسا کرے گا تو قیامت کے دن اس کے گلے میں سات زمینوں کا طوق ڈالا جائے گا۔ (۲)

۸۰۔ حضرت سعد بن ابی وقاص روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من أخذ شیئا من الأرض بغیر حقه طوقه من سبع أرضين لا یقبل منه صرف ولا عدل.

جو شخص زمین کا کچھ حصہ کسی جائز وجہ کے بغیر لے لے تو اسے سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا، اور اس سے کوئی معاوضہ یا فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ (۱)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من غصب رجلا أرضا ظالما لقی الله و هو علیه غضبان.

جو شخص کسی دوسرے شخص سے کوئی زمین ظلماً چھین لے، وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہو گا۔ (۲)

---

(۲) اسنادہ حسن، کمافی مجمع الزوائد، ص۱۷۵ ج۴، و مسند احمد، ج۵ ص۳۴۱

(۱) مجمع الزوائد، ص۱۷۵ ج۴، و کشف الاستار، ج۲ ص۱۳۵۔

(۲) مجمع الزوائد، ص۱۷۶ ج۴، بحوالہ المعجم الکبیر للطبرانی، وفی یحییٰ بن عبدالحمید الحمانی، وھو ضعیف، وقد وثق۔

۸۲۔ حضرت سعید بن زید روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من أحیا أرضا میتة فهی له۔ ولیس لعرق ظالم حق

جو شخص مردہ (غیر مملوک و غیر آباد) زمین کو آباد کرے تو وہ زمین اسی کی ہے، اور دوسرے کی زمین میں ناجائز طور پر آباد کاری کرنے والے کو کوئی حق حاصل نہیں ہوتا۔ (۳)

۸۳۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

إن من قضاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أنه لیس لعرق ظالم حق۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں سے ایک فیصلہ یہ ہے کہ کسی ناحق آباد کار کو کوئی حق نہیں۔ (۱)

۸۴۔ حضرت یعلی بن مرہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أیما رجل ظلم شبرا من الأرض کلفه اللہ أن یحفرہ حتی یبلغ آخر سبع أرضین، ثم یطوقه إلی یوم القیامة حتی یقضی بین الناس۔

جو شخص بالشت بھر زمین بھی "ظلما" لے تو اللہ تعالیٰ اسے مامور کریں گے کہ وہ اس زمین کو کھودے، یہاں تک کہ سات زمینوں کے آخر تک پہنچ جائے، پھر وہ اس کے گلے کا طوق بنایا جائے گا، یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان مکمل فیصلہ ہو جائے۔ (۲)

۸۵۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو انہیں بہت سی نصیحتیں فرمائیں، ان میں سے ایک نصیحت یہ تھی:

فإن هم أطاعوا لك بذالك فأخبرهم أن اللہ قد فرض علیهم صدقة تؤخذ

---

(۳) تلخیص سنن ابی داؤد للمنذری۔ ص۲۶۵ ج۴، حدیث نمبر ۲۹۴۹، و ترمذی، کتاب الاحکام، باب ذکر فی احیاء ارض الموات، حدیث نمبر ۱۳۷۸۔

(۱) مجمع الزوائد، ص۱۷۴ ج۴، مسند احمد، ج۵ ص۳۲۷، والمعجم الکبیر للطبرانی۔

(۲) مجمع الزوائد، ص۱۷۵ ج۴، مسند احمد، ج۴ ص۱۷۳، ورجال بعض اسانیدہ رجال صحیح۔

من أغنياء هم ، فترد على فقراء هم ، فإن أطاعوا لك بذالك فإياك وكرائم أموالهم.

پس اگر وہ لوگ (یعنی یمن کے باشندے) تمہاری اس بات کو مان لیں (کہ پانچ نمازیں ان پر فرض ہیں) تو انہیں بتلایئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کے مال میں صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے مالدار لوگوں سے لیا جائے گا، اور ان کے حاجت مند افراد میں تقسیم کیا جائے گا. پس اگر وہ اس بارے میں تمہاری اطاعت کر لیں تو ان کی عمدہ اور حرمت والی املاک (میں دست اندازی) سے مکمل پرہیز کرنا۔ (۱)

اس حدیث میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یہ حکم بحیثیت حاکم دیا گیا ہے کہ "ان کی عمدہ اور حرمت والی املاک سے مکمل پرہیز کرنا" اس سے صاف واضح ہے کہ لوگوں کی انفرادی ملکیت کا احترام صرف افراد ہی کی ذمہ داری نہیں، بلکہ حکومت اور اس کے عمال بھی ان تمام احکام کے یکساں طور پر مخاطب ہیں، اور ان کے لئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ لوگوں کی جائز املاک کسی معاوضے کے بغیر ان کی ملکیت سے نکالیں۔

۸۶۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر نظر ڈالی جائے تو اس میں یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے کہ آپ کے عہد مبارک میں مسلمان معاشی اعتبار سے مختلف حیثیتوں کے مالک تھے. بعض حضرات مثلاً حضرت عثمان غنیؓ، حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ وغیرہ معاشی طور پر خوشحال صحابہ میں شمار ہوتے تھے، اور بعض حضرات کو نان جویں بھی مشکل سے میسر آتی تھی. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تنگ دست طبقے کو اوپر لانے اور بیجا ارتکاز دولت کو ختم کرنے کے لئے بہت سے اقدامات فرمائے، جن کا اثر بعد میں عام خوشحالی کی صورت میں ظاہر ہوا، لیکن پوری حیات طیبہ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں آپ نے خوشحال صحابہ سے ان کی املاک زبردستی لے کر تنگ دست صحابہ کو دی ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسب معاش کا نظام ایسا بنایا کہ اس میں ہر شخص کو اس کی محنت کا صلہ پورا پورا ملے. ناجائز ذرائع آمدنی پر پابندی عائد فرمائی، محض دولت کے بل بوتے پر دوسروں پر ظلم کرنے کے راستے بند فرمائے، زکوٰۃ، عشر اور میراث کے احکام پر ٹھیک ٹھیک عمل کرایا، لوگوں کو تنگ دست افراد کی مالی امداد کے لئے ترغیب کا راستہ بھی اختیار فرمایا، اور سب سے

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، وکتاب المغازی، باب نمبر ۶۰، حدیث نمبر ۴۳۴۷۔

بڑھ کر یہ کہ دنیوی مال و متاع کو مقصد زندگی قرار دینے والی ذہنیت کا خاتمہ فرما کر لوگوں میں آخرت کی بہبود کی فکر پیدا فرمائی، جس کے نتیجے میں لوگوں نے خوش دلی سے اپنی ضرورت سمجھ کر تنگ دست افراد کی مالی امداد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، لیکن کسی بھی موقع پر لوگوں کو اپنی جائز املاک سے دستبردار ہونے پر سرکاری حکم کے ذریعہ مجبور نہیں فرمایا۔

یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسلام معاشی توازن اور منصفانہ تقسیم دولت کے لئے جائز املاک کی کمیاتی تحدید یا لوگوں کی جائز املاک کو زبردستی قبضے میں لینے کا راستہ اختیار نہیں کرتا، بلکہ اس سلسلے میں اس کا طریق کار بالکل دوسرا ہے، جس کی کچھ تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔

۸۷۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سرکاری سطح پر جائز طریقے سے حاصل شدہ ملکیت کے احترام کی ایک واقع مثال غزوۂ حنین کا واقعہ ہے، اس جہاد میں مسلمانوں کو کافی مال غنیمت حاصل ہوا تھا، جس میں اس زمانے کے دستور کے مطابق غلام اور کنیزیں بھی شامل تھے، عام طور سے مال غنیمت کا قاعدہ یہ ہے کہ اس کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل کرنے کے بعد باقی سارا مال مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، اور تقسیم کے نتیجے میں جو چیز جس شخص کے حصے میں آ جائے وہ اس کا مالک سمجھا جاتا ہے، بنو ہوازن جن سے حنین کے مقام پر جنگ ہوئی تھی، ان کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو توقع تھی کہ شاید وہ شکست کے بعد مسلمان ہو کر آ جائیں گے، اس لئے آپ نے مال غنیمت تقسیم کرنے میں اس لئے جلدی نہیں فرمائی کہ اگر وہ لوگ مسلمان ہو کر آ جائیں تو ان کا مال انہی کو واپس کر دیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریباً دو ہفتے ان کا انتظار کیا، اور مال غنیمت تقسیم نہیں کیا، لیکن جب وہ اس پوری مدت میں نہ آئے، تو آخر جعرانہ کے مقام پر مال غنیمت (غلاموں اور کنیزوں سمیت) مجاہدین کے درمیان تقسیم فرما دیا۔

اتفاق سے جب مال غنیمت تقسیم ہو چکا تو بنو ہوازن مسلمان اور تائب ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور خواہش ظاہر کی کہ ان کا مال اور غلام کنیزیں واپس کر دی جائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تو شروع ہی سے یہ تھی کہ یہ لوگ مسلمان ہو کر آئیں، اور ان کا مال انہیں واپس کر دیا جائے، واپس کرنے میں بہت سی دینی اور سیاسی مصلحتیں بھی تھیں، لیکن چونکہ مال تقسیم ہو چکا تھا، اس لئے آپ نے بنو ہوازن کے وفد سے فرمایا: کہ میں نے تو دس دن سے زیادہ آپ کے انتظار میں مال غنیمت تقسیم نہیں کیا، لیکن اب جب کہ مال غنیمت تقسیم ہو چکا ہے، تو سارے مال کی واپسی تو مشکل ہے، البتہ آپ دو چیزوں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیں، یا

تو مال کا، یا غلاموں اور کنیزوں کا، جس چیز کو آپ پسند کریں، وہ آپ کو واپس کرنے کی کوشش کی جائے گی، انہوں نے غلام اور کنیزوں کی واپسی کو پسند کیا، (جن کی تعداد روایتوں میں چھ ہزار بیان کی جاتی ہے) آپ نے فرمایا جہاں تک میرے اور میرے خاندان کے حصے کا تعلق ہے، وہ تو میں آپ کو واپس دیتا ہوں، لیکن جہاں تک دوسرے مسلمانوں کے حصے کا تعلق ہے، آپ ان سے مل کر بات کر لیں، اور ان پر یہ بات ظاہر کر دیں کہ آپ مسلمان ہو چکے ہیں، میں بھی آپ کی سفارش کروں گا چنانچہ نماز ظہر میں جب تمام مسلمان جمع تھے، بنو ہوازن کے بعض افراد نے کھڑے ہو کر تقریریں کیں، اور مسلمانوں کو ترغیب دی کہ وہ اپنے اپنے حصے میں آئے ہوئے غلام اور کنیز واپس کر دیں، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے، اور حمد و ثنا کے بعد ارشاد فرمایا:

أما بعد، فإن إخواننا جاؤا تائبين، و إني قد رأيت أن أرد إليهم سبيهم . فمن أحب منكم أن يطيب ذلك فليفعل ، و من أحب منكم أن يكون على حظه حتى نعطيه إياه من أول ما يفيئي الله علينا فليفعل.

اما بعد، ہمارے بھائی (بنو ہوازن) ہمارے پاس تائب ہو کر آئے ہیں، اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان کے جنگی قیدی ان کو لوٹا دوں، اب آپ لوگوں میں سے جو شخص خوش دلی سے اپنے حصے کے غلام یا کنیز (بلامعاوضہ) لوٹانا پسند کرے وہ (بلامعاوضہ) لوٹا دے، اور جو شخص اپنے حصے کو باقی رکھنا چاہے، اس شرط پر اپنے حصے کے غلام کنیز واپس کر دے کہ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو پہلا مال فیئی (بغیر جنگ کے حاصل ہونے والا دشمن کا مال) ہمیں ملے گا، اس میں سے ہم اس کو معاوضہ دیں گے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سن کر لوگوں نے عرض کیا:

قد طيبنا ذلك يا رسول الله!

یا رسول اللہ ہم نے خوش دلی سے غلام اور کنیز واپس کر دیئے۔

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اجتماعی منظوری پر بھی اطمینان نہیں ہوا، اور یہ خیال رہا کہ ایسا نہ ہو کہ بعض لوگوں نے مجمع عام میں شرما شرمی منظوری دے دی ہو، یا کچھ لوگ شرم کی وجہ سے خاموش ہو گئے ہوں، اس لئے آپ ؐ نے فوراً ہی فرمایا:

إنا لا ندري من أذن منكم في ذلك ممن لم يأذن . فارجعوا حتى يرفع إلينا عرفاؤكم أمركم.

ہمیں ابھی یہ پتہ نہیں چلا کہ آپ میں سے کس نے اجازت دی ہے، اور کس نے نہیں دی، لہٰذا لوگ اپنی اپنی جگہ واپس چلے جائیں، یہاں تک کہ آپ کے نمائندے آپ کی بات ہم تک پہنچائیں۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، صحیح بخاری میں ہے:

فرجع الناس، فکلمھم عرفاؤھم، ثم رجعوا الی رسول اللہ ﷺ، فأخبروہ أنھم قد طیبوا و أذنوا.

چنانچہ لوگ واپس چلے گئے، اور ان کے قبائلی نمائندوں نے ان سے علیحدگی میں گفتگو کی، پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس آئے، اور بتایا کہ لوگوں نے خوش دلی سے واپسی کی اجازت دے دی ہے۔ (۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور سیرت نگار محمد بن اسحاق نے اب واقعے کی مزید تفصیلات مختلف سندوں سے بیان کی ہے، ان میں بتایا ہے کہ اقرع بن حابس، عیینہ بن حصن، عباس بن مرداس اور بنو تمیم اور بنو فزارہ کے بعض لوگوں نے اپنے حصے بلا معاوضہ لوٹانے سے انکار کیا، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس پر ادنیٰ سی ناگواری کا بھی اظہار نہیں فرمایا، بلکہ ان سے وعدہ کیا کہ آئندہ پہلے مالِ فیئ سے انہیں ان کے حصوں کا معاوضہ ادا کر دیا جائے گا۔

(ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام مع الروض الانف ص ۳۰۶ ج ۲ و فتح الباری ص ۳۴ ج ۸)

اس واقعہ کا ایک ایک جزء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے انفرادی ملکیت کے مکمل احترام کا شاہد ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امت کے مجموعی مصالح کے پیش نظر یہ چاہتے تھے کہ بنو ہوازن کو ان کے قیدی واپس کر دیئے جائیں، ان قیدیوں کو مسلمانوں کی ملکیت میں آئے ہوئے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی، ابھی وہ ان کو اپنے گھروں تک بھی نہیں لے جا سکے تھے، یہ غلام اور کنیز ایسی ضروریات زندگی میں بھی شامل نہیں تھے کہ ان کے بغیر مسلمانوں کا گزارہ نہ ہو، یا ان کے بغیر کوئی سخت دشواری پیش آئے، بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کو آزاد کرنے کی بیشمار فضائل بیان فرما کر ہمیشہ صحابہ کرامؓ کو غلام آزاد کرنے کی جا بجا ترغیب دی تھی۔۔۔۔ اگر ایک اسلامی ریاست کے لئے کسی مسلمان کی جائز ملکیت کو زبردستی چھین لینا جائز ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے شاید اس سے زیادہ آسان اور موزوں موقع کوئی اور نہ تھا۔

---

(۱) صحیح بخاری۔ کتاب المغازی، حدیث نمبر ۴۳۱۸ و ۴۳۱۹۔ مع فتح الباری، ص ۳۳ ج ۸۔

لیکن چونکہ قاعدہ کے مطابق یہ غلام اور کنیز مال غنیمت کی تقسیم کے ذریعے مجاہدین کی ملکیت میں آ چکے تھے، اور مالک کی خوش دلی کے بغیر کوئی چیز اس سے زبردستی لینا جائز نہ تھا، اس لئے آپ نے مسلمانوں سے منظوری لی، اور محض اجتماعی طور پر منظوری لینے کو بھی کافی نہیں سمجھا، کیونکہ یہ اندیشہ تھا کہ یہ اجتماعی منظوری محض ظاہرداری اور ضابطے کی خانہ پری ہو کر نہ رہ جائے، اس لئے عرفاء (قبائلی نمائندوں) کے ذریعہ فرداً فرداً ہر شخص سے اس کی حقیقی منظوری معلوم کی گئی، اور اس کے نتیجے میں جن لوگوں نے معاوضے کا مطالبہ کیا، انہیں کسی ادنیٰ ناگواری کے بغیر معاوضہ دیا گیا۔

اس واقعے سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جائز املاک کو بلا معاوضہ لے لینا جس طرح افراد کے لئے جائز نہیں، اسی طرح حکومت کے لئے ناجائز ہے، اور وہ مصالح عامہ کے تحت بھی اس کی مجاز نہیں ہے، کیونکہ اگر کوئی حکومت اس کی مجاز ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اس کا حق دار کوئی نہ تھا۔

۸۸۔ اسی غزوۂ حنین کا ایک اور واقعہ بھی اس سلسلے میں قابل ذکر ہے، جس وقت فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ بنو ہوازن کے سردار مالک بن عوف نے مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے ایک لشکر جرار اکٹھا کر لیا ہے، اور بعض دوسرے قبائل بھی اس کے ساتھ آ ملے ہیں تو آپ نے مسلمانوں کو جنگ کی تیاری کا حکم دیا، مسلمانوں کے پاس ہتھیاروں کی کمی تھی، ایسے میں آپ کو اطلاع ملی کہ صفوان بن امیہ کے پاس بہت سے ہتھیار ہیں، صفوان بن امیہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، لیکن ایک غیر مسلم شہری کی حیثیت سے مطیع ہو چکے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے وہ زرہیں اور ہتھیار مانگے، اور فرمایا کہ ہمیں بنو ہوازن کے مقابلے کے لئے ان ہتھیاروں کی ضرورت ہے، صفوان بن امیہ نے پوچھا:

أغصباً یا محمد؟

اے محمد! کیا آپ یہ ہتھیار مجھ سے چھیننا چاہتے ہیں؟

آپ نے جواب دیا:

بل عاریة مضمونة

نہیں، بلکہ ہم یہ عاریۃً لینا چاہتے ہیں جن کی واپسی کی ضمانت ہو گی۔ (۱)

(۱) سنن ابی داؤد۔ و سیرت ابن ہشام. ص۲۸۸ ج۲۔

یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح دفاعی ضرورت سے ایک غیر مسلم شہری کا ایک ہتھیار بھی بلا معاوضہ لینا پسند نہیں فرمایا، اور ان کی واپسی کی ضمانت دے کر وہ ہتھیار استعمال فرمائے۔

۸۹۔ مدینہ طیبہ میں وسائل پیداوار کے درمیان عدم توازن کا سب سے بڑا مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب مسلمانوں نے جوق در جوق مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ ہجرت شروع کی، اس وقت مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے کو نہ صرف ایک دینی فریضہ، بلکہ ایمان کی علامت قرار دیا گیا تھا، اور قرآن کریم کی کئی آیتیں اس سلسلے میں نازل ہو چکی تھیں، مکہ مکرمہ کے یہ باعزت افراد اپنے گھر بار اور زمین و جائیداد چھوڑ کر آ رہے تھے، اور انہیں معاشی طور پر بحال کرنا مدینہ طیبہ کی اسلامی ریاست کا ایک بہت بڑا مسئلہ تھا، مدینہ طیبہ کے انصار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے لیلۃ العقبہ میں جو معاہدہ فرمایا تھا، اس میں ایک معاہدہ یہ بھی تھا کہ انصار مدینہ مہاجرین کی ہر ممکن مدد اور غم خواری کریں گے۔ (۱)

لما قدم المهاجرون المدينة من مكة و ليس بأيديهم ، وكانت الأنصار أهل الأرض و العقار .

جب مہاجرین مکہ مکرمہ سے مدینہ آئے تو وہ خالی ہاتھ تھے، اور انصار مدینہ زمین جائیداد کے مالک تھے۔ (۲)

اس موقع پر اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انصار مدینہ سے ان کی زائد از ضرورت زمینیں لے کر مہاجرین میں تقسیم فرماتے تو نہ صرف یہ کہ اس سے مہاجرین کا معاشی مسئلہ پوری طرح حل ہو جاتا، بلکہ یہ انصار مدینہ کے جذبہ ایثار کے عین مطابق ہوتا، لیکن بات صرف اتنی نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلے کے حل کا یہ طریقہ سوچا تک نہیں، بلکہ ایک مرحلے پر انصار مدینہ نے خود یہ پیشکش کی کہ آپ ہمارے کھجوروں کے باغات کو ہمارے اور مہاجرین کے درمیان تقسیم فرما دیجئے، لیکن آپ نے اس پیشکش کو بھی قبول نہیں فرمایا، اس کے بعد انصار مدینہ نے متبادل تجویز یہ پیش کی کہ ہمارے مہاجر بھائی ہمارے باغوں میں بٹائی پر کام کریں، اور پھل آدھا آدھا تقسیم کر لیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین نے اس تجویز کو قبول فرما لیا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

---

(۱) فتح الباری ص۹ ج۵۔

(۲) صحیح بخاری، کتاب الہبۃ، باب المنیحۃ، حدیث نمبر ۲۶۳۱۔

قالت الأنصار للنبی ﷺ : اقسم بیننا و بین إخواننا النخیل ، قال : لا ۔ فقالوا : تکفونا المؤنة ونشرککم فی الثمرة ۔ قالوا : سمعنا و أطعنا.

انصار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے درمیان نخلستان تقسیم فرما دیجئے، آپ نے فرمایا: نہیں، اس پر انصار نے کہا: اچھا آپ لوگ (یعنی مہاجرین) ہمیں باغوں میں کام کرنے سے بے فکر کر دیں، اور ہم آپ کو پھل میں شریک کر لیں گے، مہاجرین نے کہا: یہ ہمیں بخوشی منظور ہے۔ (۱)

چنانچہ ایسا ہی ہوا. اکثر مہاجرین انصار کے باغات میں بٹائی پر کام کرتے رہے. اور پھل دونوں کے درمیان تقسیم ہوتا رہا. اس کے باوجود بعض مہاجرین ایسے تھے جو بٹائی پر کسی وجہ سے کام نہیں کر سکتے تھے. ایسے حضرات کو انصار کی زمینیں تو نہیں دی گئیں. لیکن انصار نے اپنی خوشی سے اپنے باغوں کے بعض درخت ان کے لئے مخصوص کر دیئے. کہ ان کا پھل وہ استعمال کر لیا کریں. چنانچہ وہ پھل استعمال کرتے رہے. لیکن جب غزوۂ خیبر کے بعد مسلمانوں کو وسعت حاصل ہوئی. اور مہاجرین کو مال غنیمت سے حصہ ملا تو ایسے تمام حضرات نے وہ درخت بھی انصار کو واپس کر دیئے. حضرت انس کی والدہ ام سلیم نے ایک درخت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پیش کیا تھا. اور آپ نے اپنے والد کی حبشی کنیز ام ایمن کو (جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش کی تھی۔) عطا فرمایا. جب دوسرے مہاجرین نے اپنے اپنے درخت واپس کئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی وہ درخت اس کی اصل مالک یعنی حضرت ام سلیم کو واپس کرنے کا فیصلہ فرمایا. لیکن حضرت ام ایمن یہ سمجھی تھیں کہ یہ درخت انہیں ہمیشہ کے لئے مالکانہ حقوق کے ساتھ دے دیا گیا ہے. اور چونکہ یہ درخت انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا تھا. اس لئے وہ اسے ایک تبرک بھی سمجھتی تھیں، اور اسے واپس کرنے پر راضی نہ تھیں. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنے ایک باغ سے دس گنا زائد درخت دے کر راضی کیا. حضرت انس فرماتے ہیں:

إن النبی ﷺ لما فرغ من قتال أهل خیبر فانصرف إلی المدینة رد المهاجرون إلی الأنصار منائحهم من ثمارهم ، فرد النبی ﷺ إلی أمه عذاقها . فأعطی رسول الله ﷺ أم أیمن مكانهن من حائطه.

---

۱) صحیح بخاری. کتاب المزارعۃ. باب نمبر ۵۔ حدیث نمبر ۲۳۲۵. و کتاب الشروط. حدیث نمبر ۲۷۱۹۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اہل خیبر سے جنگ کر کے فارغ ہوئے، اور مدینہ تشریف لائے، تو مہاجرین نے انصار کو ان کے عاریۃً دیئے ہوئے پھل دار درخت واپس کر دیئے۔ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میری والدہ کو ان کا دیا ہوا درخت بھی واپس کر دیا، اور ام ایمن کو اس کے بدلے اپنے باغ سے عطا فرمایا۔ (۱)

خلاصہ یہ کہ مہاجرین کے معاشی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے بے مثال جذبہ ایثار کے باوجود ان کی زمینوں یا درختوں کو مالکانہ حقوق کے ساتھ لینا یا مہاجرین کے قبضے میں باقی رکھنا گوارا نہیں فرمایا۔

اس تفصیل سے صاف واضح ہے کہ جو حضرات مہاجرین اور انصار کے درمیان "مواخات" کے معاملے کو تحدید ملکیت یا نیشنلائزیشن کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں، وہ کس قدر غلطی پر ہیں، مذکورہ بالا تفصیلات کے بعد یہ واقعہ تو تحدید ملکیت کے حق میں نہیں، بلکہ واضح طور پر اس کے خلاف جاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ سے یہ چند واقعات اس بات کا ناقابل انکار ثبوت ہیں کہ آپ نے انفرادی ملکیت کے احترام کا جو بنیادی اصول بار بار کھلے الفاظ میں بیان فرمایا، وہ محض ایک نظریہ ہی نہیں تھا، بلکہ آپ نے قدم قدم پر اس پر عمل کر کے دکھایا ہے۔ اور انتہائی نازک اور مشکل حالات میں بھی غیر معمولی باریک بینی کے ساتھ اس کی نگہداشت فرمائی ہے، تاکہ آپ کے کسی عمل سے انفرادی ملکیت کو نظر انداز کرنے والے کوئی ادنیٰ سہارا نہ لے سکیں۔

قرآن و سنت کے مذکورہ بالا دلائل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے تعامل کی وجہ سے اس مسئلے پر فقہاء امت کا اجماع اور اتفاق ہے کہ کسی شخص کی جائز ملکیت کو اس سے زبردستی چھیننا کسی کے لئے بھی جائز نہیں، خواہ وہ کوئی فرد ہو یا حکومت، عہد حاضر کے ایک محقق ڈاکٹر سعدی ابو جیب نے "موسوعۃ الاجماع" کے نام سے انسائیکلوپیڈیا مرتب کی ہے، جس میں ان تمام مسائل کو جمع کیا ہے جن پر فقہاء امت کا اجماع اور اتفاق رہا ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں:

أجمع جمیع الخاصة و العامة علی أن اللہ عزو جل حرم أخذ مال امری مسلم

(۱) صحیح بخاری، کتاب الہبۃ، باب فضل المنیحۃ، حدیث نمبر ۲۶۳۰، مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: کتاب المغازی، باب حدیث بنی النضیر، حدیث نمبر ۴۰۳۰، وباب مرجع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الاحزاب، حدیث نمبر ۴۱۲۰، وصحیح مسلم، کتاب الجہاد، ص ۹۶ ج ۲، حدیث نمبر ۴۳۶۶ و ۴۳۶۷۔

أو معاهد بغير حق . إذا كان المأخوذ منه ماله غير طيب النفس بأن يؤخذ منه ما أخذ و قد أجمعوا جميعا على أن أخذه على السبيل التي وصفنا آثم و ظالم.

تمام خاص وعام کا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مسلمان یا ذمی کا مال ناحق لینے کو حرام قرار دیا ہے، جب کہ وہ شخص جس سے مال لیا جا رہا ہے اس بات پر خوش دلی سے راضی نہ ہو کہ اس سے مال لیا جائے. نیز اس بات پر بھی اجماع ہے کہ جو شخص مذکورہ طریقے پر کسی کا مال لے. وہ ظالم اور گناہ گار ہے۔ (۱)

علامہ ابن حزم اندلسی نے بھی اپنی کتاب میں ان مسائل کو جمع کیا ہے جن پر امت کے تمام علماء اور فقہاء کا اتفاق رہا ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں:

«و اتفقوا أن أخذ أموال الناس كلها ظلما لا يحل»

اس بات پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ لوگوں کے کسی بھی قسم کے مال کو ناحق لے لینا حلال نہیں ہے۔ (۱)

علامہ ابن رشد اندلسی فقہاء کرام کے اختلافات کے مستند ترین شارحین میں سے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

لا يحل مال أحد إلا بطيب نفس منه . كما قال عليه الصلاة و السلام و انعقد عليه الإجماع.

کسی شخص کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں ہے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، اور اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ (۲)

قاضی محمد بن علی الشوکانی، جو عموماً علمائے اہل حدیث کی ترجمانی کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

ولا شك أن من أكل مال مسلم بغير طيبة نفسه ، أكل له بالباطل و مصرح به في عدة أحاديث . منها حديث «إنما أموالكم و دمائكم عليكم حرام» و

---

(۱) موسوعۃ الاجماع. ص۹۶۸. ج۲ مولفہ سعدی ابوجیب. مطبوعہ دار الفکر، دمشق. ۱۴۰۴ھ
(۱) مراتب الاجماع لابن حزم. ص۵۹ مطبوعہ دار الکتاب العربی، بیروت
(۲) بدایۃ المجتہد. ص۱۶۶ ج۲. مطبوعہ مصر. کتاب البیوع. باب ۴. فصل فی النجش۔

قد تقدم و مجمع علیه عند کافة المسلمین۔ و متوافق علی معناه العقل و الشرع۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو شخص کسی مسلمان کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر کھائے، وہ ناحق کھاتا ہے۔ اس کی تصریح متعدد احادیث میں موجود ہے۔ جن میں سے وہ حدیث بھی ہے کہ "تمہارے مال اور تمہارے خون تم پر حرام ہیں"، اور یہ حدیث پیچھے گزر چکی ہے، اور اس مسئلہ پر تمام مسلمانوں کا اجماع بھی ہے، اور عقل و شریعت دونوں اسی کی تائید کرتی ہیں (۱)

۹۱۔ مذکورہ مستند ماخذ میں اس مسئلہ پر اجماع امت نقل کیا گیا ہے۔ فقہاء امت کا کسی مسئلے پر اجماع و اتفاق بذات خود ایک مستقل دلیل ہے، جس کو قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر میں اور اسلامی احکام کی صحیح فہم حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ ترین مقام حاصل ہے۔ لہٰذا اجماع کی مذکورہ بالانقول کے بعد فقہاء کرام کے انفرادی اقوال نقل کرنے کی اگرچہ ضرورت نہیں رہتی، تاہم مختلف فقہی مکاتب فکر کے چند اقوال جو ہمارے زیر بحث مسئلے کے بارے میں زیادہ واضح ہیں، ذیل میں نقل کرتا ہوں:

امام ابو یوسف رحمہ اللہ علیہ مشہور امام مجتہد ہیں، اسلامی حکومت کے قاضی القضاۃ بھی رہے ہیں، انہوں نے خلیفہ وقت ہارون رشید کے سوالات کے جواب میں اپنی مشہور کتاب "کتاب الخراج" تصنیف فرمائی ہے، اس کتاب کا بنیادی موضوع اسلام کا نظام محاصل (Public Fin ancce) ہے، لیکن ساتھ ہی انہوں نے اسلامی حکومت کے فرائض اختیارات پر بھی قرآن و سنت کی روشنی میں بڑی سیر حاصل بحثیں کی ہیں، اس میں وہ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہیں کہ پچھلی اسلامی حکومتوں نے جو بنجر زمین کسی شخص یا اشخاص کو بطور عطیہ دی ہوں، وہ ان کی ملکیت میں آ جاتی ہیں، اس مسئلے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے دلائل پیش کرنے کے بعد وہ تحریر فرماتے ہیں:

«وکل من أقطعه الولاة المهدیون أرضا من أرض السواد و أرض العرب و الجبال من الأصناف التي ذکرنا أن للإمام أن یقطع منها۔ فلا یحل لما یأتی بعدهم من الخلفاء أن یرد ذالك۔ ولا یخرجه من یدی من هو فی یده وارثا

(۱) نیل الاوطار للشوکانی، ص ۲۶۸ ج ۵۔ مطبوعہ مصطفیٰ البابی، مصر ۱۳۴۷ھ۔

أومشتريا. فأما إن أخذ الوالی من يد واحد أرضا وأقطعها آخر. فهذا بمنزلة الغاصب غصب واحداً وأعطى آخر فلا يحل للإمام ولا يسعه أن يقطع أحدا من الناس حق مسلم ولا معاهد. ولا يخرج من يده من ذالك شيئا إلا بحق يجب له عليه. فيأخذه بذالك الذی وجب له عليه. فيقطعه من أحب من الناس بذالك جائزله. والأرض عندی بمنزلة المال. فللإمام أن يجيز من بيت المال من كان له غناء فی الإسلام و من يقوی به علی العدو. و يعمل فی ذالك بالذی يری أنه خير للمسلمين وأصلح لأمرهم. وكذالك الأرضون يقطع الإمام منها من أحب من الأصناف التی سميت ولا أری أن يترك أرضا لا ملك لأحدفيها، ولا عمارة حتی يقطعها الإمام. فإن ذالك أعمر للبلاد وأكثر للخراج»

اور زمین کی جن قسموں کے بارے میں میں نے پیچھے ذکر کیا ہے کہ امام (اسلامی حکومت) وہ زمینیں کسی کو بطور عطیہ دے سکتا ہے، ان میں سے جو زمینیں پچھلے ہدایت یافتہ سربراہان حکومت نے جن لوگوں کو دی ہیں، خواہ وہ سواد (عراق) کی زمینیں ہوں، یا عرب کی، یا پہاڑوں کی، بعد کے آنے والے خلفاء کے لئے حلال نہیں کہ وہ ان زمینوں کو ان سے واپس لیں، اور نہ یہ جائز ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اب وہ زمینیں ہیں، خواہ انہیں بطور وراثت ملی ہوں، یا انہوں نے اصل مالکوں سے خرید کر حاصل کی ہوں، ان کے قبضے سے انہیں نکالا جائے، رہی یہ بات کہ سربراہان حکومت ایک شخص سے زمین لے کر دوسرے کو دیدے تو یہ بالکل غصب کے حکم میں ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک کا مال غصب کر کے دوسرے کو دیدیا، امام (حکومت) کے لئے حلال نہیں ہے، اور اس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان یا اسلامی ریاست کے کسی غیر مسلم شہری کا حق چھین کر کسی اور کو دیدے، اور نہ اس کے لئے جائز ہے کہ اس زمین کو اس کے قبضے سے نکالے، ہاں اگر حکومت کا کوئی حق کسی کے ذمہ واجب ہے، اور وہ اس واجب حق کی بنا پر کوئی زمین اس سے لے لے، اور پھر وہ زمین کسی

اور شخص کو اپنی صوابدید سے دے دے تو یہ اس کے لئے جائز ہے۔ اور زمین میرے نزدیک عام اموال کی طرح ہے۔ امام کو یہ حق حاصل ہے کہ جس کسی شخص سے اسلام کو فائدہ پہنچتا ہو۔ یا جس سے دشمن کے خلاف قوت حاصل ہوتی ہو، اس کو بیت المال سے کوئی عطیہ دے دے۔ اور ہر وہ اقدام کرے جس میں مسلمانوں کی بھلائی۔ اور ان کے معاملات کی مصلحت ہو۔ یہی حال زمین کا ہے۔ زمین کی جن قسموں کا میں نے شروع میں ذکر کیا ہے، امام وہ زمینیں مصلحت کے مطابق جسے چاہے دے سکتا ہے۔ اور میری رائے یہ ہے کہ امام کو کوئی زمین یا عمارت ایسی نہ چھوڑنی چاہئے جس پر کسی شخص کی ملکیت نہ ہو۔ بلکہ ایسی زمین لوگوں میں تقسیم کر دینی چاہئے۔ کیونکہ اس سے ملک زیادہ آباد ہو گا، اور اس سے آمدنی زیادہ ہو گی۔ (۱)

اسی اصول کو امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

لا يزول ملك المالك إلا أن يشاء. ولا يملك رجل شيئا إلا في الميراث .... قال الله عزّ و جلّ: لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم ..... فلم أعلم أحدا من المسلمين خالف في أنه لا يكون على أحد أن يملك شيئاً إلا أن يشاء أن يملكه إلا الميراث .... و لم أعلم أحدا من المسلمين اختلفوا في أن لا يخرج ملك المالك المسلم من يديه إلا بإخراجه إياه بنفسه ببيع. أو هبة. أو غير ذالك.

کسی مالک کی ملکیت زائل نہیں ہو سکتی جب تک وہ خود نہ چاہے، اور کسی شخص کو کسی چیز کا زبردستی مالک نہیں بنایا جا سکتا جب تک وہ خود نہ چاہے، اس میں صرف میراث کا مال مستثنیٰ ہے ••••••• اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر مت کھاؤ، الا یہ کہ تمہاری باہمی رضا مندی سے کوئی تجارت ہو۔ ••••• لہٰذا مجھے مسلمانوں میں کوئی ایک شخص بھی ایسا معلوم نہیں ہے جس نے اس مسئلے میں اختلاف کیا ہو، کہ کسی شخص کو اس کی خواہش کے بغیر کسی چیز کا مالک نہیں

---

(۱) کتاب الخراج للامام ابی یوسف، ص ۶۰، ۶۱ فصل فی ذکر القطائع۔

بنایا جا سکتا۔ ۰۰۰۰۰۰ اسی طرح مسلمانوں میں کوئی ایک شخص بھی مجھے ایسا معلوم نہیں ہے جس نے اس مسئلے میں اختلاف کیا ہو کہ کسی مالک کی ملکیت اس کے ہاتھوں سے اس وقت تک نہیں نکالی جا سکتی جب تک وہ خود اسے نہ نکالے۔ خواہ بیع کے ذریعہ۔ یا ہبہ کے ذریعہ۔ (۱)

عالم اسلام کے مایہ ناز فقیہ۔ صوفی اور مفکر بزرگ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اس مسئلے پر مفصل بحث کی ہے کہ کیا کوئی حکومت مصالح عامہ کے تحت لوگوں کی املاک ان سے زبردستی چھین سکتی ہے یا نہیں؟

«فإن قال قائل: إذا رأى الإمام جمعا من الأغنياء يسرفون في الأموال ويبذرون. ويصرفونها إلى وجوه من الترفة و التنعم و ضروب الفساد. فلو رأى المصلحة في معاقبتهم بأخذ شيئ من أموالهم ورده إلى بيت المال. وصرفه إلى وجوه المصالح فهل له ذالك؟ قلنا: لا وجه له. فإن ذالك عقوبة بنتقص الملاك وأخذ المال. والشرع لم يشرع المصادرة في الأموال عقوبة على جناية. مع كثرة العقوبات و الجنايات .... والزجر حاصل بالطرق المشروعة».

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جب امام (سربراہ حکومت) مال داروں کے ایک گروہ کو دیکھ رہا ہو کہ وہ اپنی املاک میں اسراف اور فضول خرچی سے کام لے رہے ہیں، اور ان کو عیش و آرام کے مختلف طریقوں اور طرح طرح کے اسباب فساد میں خرچ کر رہے ہیں۔ تو اگر وہ مصلحت اس میں سمجھے کہ اس عمل کی سزا کے طور پر ان سے ان کے کچھ اموال چھین لے۔ اور انہیں بیت المال میں داخل کر کے ان کو مصالح عامہ میں خرچ کرے تو کیا اسے یہ اختیار ہے؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ اس کا کوئی جواز نہیں۔ اس لئے کہ یہ سزا ملکیت میں کمی اور اموال کو چھین کر دی جا رہی ہے۔ اور شریعت نے کسی کے مال پر زبردستی قبضہ کرنے کو کسی جرم کی سزا کے طور بھی مقرر نہیں کیا۔ حالانکہ شرعی سزاؤں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ۰۰۰۰۰ جہاں تک فساد سے

---

(۱) کتاب الام للامام الشافعیؒ۔ ج ۳ ص ۲۱۸ و ۲۱۹۔

لوگوں کو روکنے کا تعلق ہے۔ یہ مقصد ان طریقوں کو اختیار کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے جو شرعاً جائز نہیں ہے۔ (۱)

تاریخ اسلام کے دوسرے عظیم مفکر علامہ ابن خلدون جن کو عمرانی علوم کا مدون اول کہنا چاہئے، اپنے شہرہ آفاق مقدمے میں اس بات پر مفصل بحث کرتے ہیں کہ حکومت کو بلامعاوضہ لوگوں کی املاک چھیننے کا اختیار دینے سے سیاسی اور معاشی اعتبار سے کیا فساد رونما ہوتا ہے؟ ان کے مقدمہ کی چھتیسویں فصل اسی موضوع کے لئے مختص ہے۔ اور پوری مطالعہ کے لائق ہے تاہم اس کے چند فقرے ذیل میں پیش کرتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں:

"اعلم أن العدوان على الناس فى أموالهم ذاهب بآمالهم فى تحصيلها واكتسابها لما يرونه حينئذ من أن غايتها و مصيرها انتهابها من أيديهم و اذا ذهبت آمالهم فى اكتسابها و تحصيلها انقبضت أيديهم عن السعى فى ذالك . و على قدر الاعتداء و نسبته يكون انقباض الرعايا عن السعى فى الاكتساب .... و العمران. و وفوره و نفاق أسواقه انما هو بالأعمال و سعى الناس فى المصالح و المكاسب ذاهبين و جائين. فاذا قعد الناس عن المعاش و انقبضت أيديهم عن المكاسب كسدت أسواق العمران.

یاد رکھو کہ لوگوں کی املاک پر دست درازی سے مال کی تحصیل و اکتساب کی امنگ لوگوں کے دل سے ختم ہو جاتی ہے. اس لئے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خواہ کتنا مال کما لیں. بہرصورت وہ ہمارے ہاتھ سے چھن جائے گا. اور جب کسب مال کے سلسلے میں ان کی امنگ ختم ہو جاتی ہے تو ان کے ہاتھ معاشی جدوجہد سے رک جاتے ہیں. چنانچہ مال پر دست درازی جتنی ہو گی اسی نسبت سے عوام کی معاشی جدوجہد میں رکاوٹ پیدا ہو گی. ..... اور عمرانی اور بازاروں کی سرگرمی دراصل لوگوں کی معاشی جدوجہد سے وابستہ ہوتی ہے. جب لوگ معاشی جدوجہد میں سست پڑ جائیں. اور ان کے ہاتھ کمائی سے رک جائیں. تو آبادی کے بازار ویران ہو جاتے ہیں۔ (۱)

---

(۱) شفاء الغلیل للامام الغزالی ص ۲۴۳ تا ۲۴۵ بحوالہ "الملکیۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ" للدکتور عبدالسلام العبادی ص ۲۸۲ ج ۲

(۱) مقدمہ ابن خلدون. ص ۲۸۶. فصل نمبر ۳۶. مطبوعہ مکتبہ تجاریہ. مصر۔

یہ چند اقتباسات محض نمونے کے طور پر پیش کئے گئے ہیں، ورنہ ہر فقہ کی کتاب میں یہ صراحت موجود ہے کہ کسی بھی شخص کی ملک کو بلامعاوضہ لے لینا کسی کے لئے جائز نہیں ہے۔ خواہ وہ کوئی فرد ہو یا حکومت، اور جیسا کہ پیچھے متعدد حوالوں سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس مسئلے پر ہر دور میں اور ہر مکتب فکر کے فقہاء متفق رہے ہیں۔

۹۲۔ تاریخ اسلام میں بھی بعض واقعات ایسے پیش آئے ہیں کہ بعض حکومتوں نے مصالح ہی کے نام پر لوگوں کی اراضی پر بلامعاوضہ قبضہ کرنے کی کوشش کی، لیکن اس زمانہ کے فقہاء نے نہ صرف یہ کہ اسے ناجائز قرار دیا، بلکہ اس پر احتجاج کیا، یہاں تک کہ انہیں یہ ارادہ ترک کرنا پڑا، ایک مرتبہ مصر کے حکمران سلطان ظاہر بیبرس نے اراضی کو لوگوں سے چھیننے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ جو لوگ صدیوں سے اراضی کے مالک چلے آ رہے تھے، ان کو اس بات کا پابند کیا کہ وہ اپنی اپنی اراضی کی اسناد ملکیت دکھائیں، اور ارادہ یہ تھا کہ جو لوگ ملکیت کا کوئی دستاویزی ثبوت پیش نہ کر سکیں، ان سے زمین چھین کر بیت المال میں داخل کر دی جائے، حالانکہ معروف شرعی اصول یہ ہے کہ جو شخص عرصہ دراز سے کسی چیز پر مالکانہ تصرفات کرتا چلا آ رہا ہو، اور کسی بھی قرینے سے اس کی ملکیت مشتبہ نہ ہو، اس کی ملکیت کا بار ثبوت (Onus of Proof) اس کے ذمہ نہیں، بلکہ اگر کوئی شخص اس کی ملکیت کو چیلنج کرتا ہے، تو بار ثبوت اس کے ذمے ہے۔

اس دور میں مصر کے معروف شافعی عالم جو اپنے علم و فضل، تفقہ اور تقویٰ میں معروف ہیں، علامہ محی الدین نوری رحمتہ اللہ علیہ تھے، انہوں نے اس پر شدید احتجاج کیا یہاں تک کہ شاہ ظاہر بیبرس کو اپنا یہ ارادہ ترک کرنا پڑا، علامہ ابن عابدین شامیؒ اس واقعے کی تفصیل ان الفاظ میں بتاتے ہیں:

«وسبقه إلى ذالك الملك الظاهر بيبرس، فإنه أراد مطالبة ذوى العقارات بمستندات تشهد لهم بالملك، وإلا انتزعها من أيديهم متعاللا بما تعلل به ذالك الظالم، فقام عليه شيخ الإسلام الإمام النووى رحمه الله تعالى و أعلمه بأن ذالك غاية الجهل و العناد، وأنه لا يحل عند أحد من علماء المسلمين، بل من في يده شيئى فهو ملكه، لا يحل لأحد اعتراض عليه ولا يكلف إثباته ببينة، ولا زال النووى رحمه الله تعالى يشنع على السلطان و يعظه إلى أن كف عن ذالك».

اس سے پہلے شاہ ظاہر بیبرس نے بھی ایسا ہی کیا تھا. ان کا ارادہ ہوا تھا کہ وہ زمین کے مالکوں سے ایسی دستاویزات کا مطالبہ کریں جو ان کی ملکیت کی شہادت دیتی ہوں. ورنہ وہ زمینیں ان سے چھین لی جائیں. اس غرض کے لئے اس ظالم نے متعدد وجوہ کا سہارا لیا تھا. لیکن شیخ الاسلام امام نووی اس کے مقابلے پر کھڑے ہو گئے. اور اسے بتایا کہ ایسا کرنا انتہا درجے کی جہالت اور دھاندلی ہے. مسلمان علماء میں سے کسی کے نزدیک بھی ایسا کرنا حلال نہیں. بلکہ جو چیز جس شخص کے قبضے میں ہوتی ہے. وہ اس کی ملکیت ہے. کسی شخص کو اس پر اعتراض کر کے مالک کو ملکیت کی گواہی پیش کرنے کا حق نہیں پہنچتا. امام نووی سلطان کے اس ارادے کی تردید اور اسے نصیحت کرنے میں اس وقت تک مشغول رہے. جب تک وہ اپنے ارادے سے باز نہیں آ گیا۔ (۱)

بہرصورت. قرآن و سنت. اجماع امت اور فقہاء اسلام کی تصریحات کی روشنی میں اس بات کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ جس شخص کی ملکیت کسی زمین پر جائز طریقے پر ثابت ہو. اس سے وہ زمین بلامعاوضہ زبردستی ضبط کر لی جائے۔

۹۳۔ اب میں ان روایات کا مختصر جائزہ لینا چاہتا ہوں. جن کی بنیاد پر وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں یا ہمارے سامنے بحث کے دوران یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ مصالح عامہ کے پیش نظر کسی کی ملکیت بلا معاوضہ لے لینا اسلامی حکومت کے لئے جائز ہے:

حضرت عمرؓ کی پالیسی

۹۴۔ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں اس ضمن میں سب سے پہلے حضرت عمرؓ کا ایک ارشاد پیش کیا گیا ہے. جس کا ترجمہ اس فیصلے میں اس طرح مذکور ہے:

"If I had an opportunity to do what I had already done (to continue my policies) I would have taken from the rich their surplus wealth and distributed it aming the needy"

یعنی: "اگر مجھے (اپنی پالیسی جاری رکھتے ہوئے) وہ کچھ کرنے کا موقع ملا جو میں

---

(۱) رد المحتار لابن عابدین. ص ۲۸۱ ج ۳. مطبوعہ کوئٹہ. کتاب الجہاد باب العشر والخراج۔

پہلے سے کرتا رہا ہوں، تو میں مال دار لوگوں سے ان کی فاضل دولت لے کر اسے
محتاج لوگوں میں تقسیم کر دوں گا"

حضرت عمرؓ کے اس مبینہ ارشاد کے بارے میں چند وضاحتیں ضروری ہیں:

(۱) اس ارشاد کا جو ترجمہ فاضل وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں کیا گیا ہے، وہ درست نہیں ہے، کیونکہ اس ترجمے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مال داروں سے ان کا فاضل مال لے کر غریبوں میں تقسیم کرنا حضرت عمرؓ کی مسلسل پالیسی تھی جس پر وہ عمل کرتے رہے۔ اور آئندہ بھی اسی پالیسی کو جاری رکھنے کا عزم ظاہر کیا، حالانکہ واقعہ ایسا نہیں ہے۔ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں حضرت عمر کا یہ فقرہ نجات اللہ صدیقی صاحب کی کتاب "اسلام کا نظریہ ملکیت" سے نقل کیا گیا ہے۔ انہوں نے تاریخ طبری کے حوالے سے اس اصل عربی الفاظ بھی لکھ دیئے ہیں، جو اس طرح ہیں:

«لو استقبلت من أمري ما استدبرت لأخذت فضول أموال الأغنياء فقسمتها على فقراء المهاجرين».

عربی محاورے کی رو سے اس فقرے کا صحیح ترجمہ یہ ہو گا:

"اگر شروع میں میری رائے وہ ہو جاتی جو بعد میں ہوئی تو میں مال داروں کا فاضل
مال لے کر اسے محتاج مہاجرین میں تقسیم کر دیتا"

تاریخ طبری کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے، اس مترجم نے مذکورہ جملے کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

"اگر مجھے ان باتوں کا پہلے پتہ چل جاتا جو مجھے بعد میں معلوم ہوئیں، تو میں دولت
مندوں کے زائد مال و دولت کو حاصل کر کے انہیں غریب مہاجرین میں تقسیم کر
دیتا" (۲)

اگرچہ عربی دان حضرات سمجھ سکتے ہیں کہ یہ ترجمہ بھی عربی محاورے کے پوری طرح مطابق نہیں ہے، تاہم اس ترجمے کے مقابلے میں بہتر ہے جو وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے یا نجات اللہ صدیقی صاحب کی کتاب میں کیا گیا ہے، اور اس ترجمہ سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حضرت عمرؓ کا صرف ایک خیال تھا، ان کی ایسی پالیسی نہیں تھی، جس پر وہ عمل کرتے رہے ہوں، اور جیسا کہ میں آگے ذکر کروں گا، حضرت عمرؓ نے حالات کے جس پس منظر میں یہ بات ارشاد فرمائی، اس کے پیش

---

(۱) تاریخ طبری، ص ۲۹۱ ج ۳، مطبوعہ قاہرہ، ۱۳۵۷ھ واقعات ۲۳ھ

(۲) تاریخ طبری اردو، مترجم حافظ رشید ارشد، ص ۲۸۶ ج ۳۔ مطبوعہ نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۷ء

نظر ترجمے کی اس غلطی سے بڑی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں یہ تنبیہ مناسب ہے کہ یوں تو پیش کردہ حوالوں کی صحت ہر علمی اور تحقیقی کام میں انتہائی ضروری ہے، لیکن عدالتی فیصلوں، بالخصوص اس اہم اختیار سماعت (Jurisdiction) میں جو وفاقی شرعی عدالت یا سپریم کورٹ کی شریعت اپیلیٹ بینچ کو حاصل ہے، اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، لہٰذا جہاں تک ممکن ہو، اس میں بالواسطہ حوالوں (Indirect References) اور غیر مستند ترجموں پر پرہیز کرنا چاہئے۔

(۲) حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد حدیث کی معروف اور مستند کتابوں میں سے کسی کتاب میں مجھے نہیں ملا، یہ ایک تاریخی روایت ہے جو تاریخ طبری میں بیان ہوئی ہے، علامہ ابن حزمؒ نے بھی محلی (۱) میں اسے نقل کیا ہے، لیکن انہوں نے اس کی پوری سند ذکر نہیں کی، بلکہ اپنے سے تقریباً دو صدی پہلے کے محدث عبدالرحمٰن بن مہدی سے اسے نقل کیا ہے، تاریخ طبری میں اس کی پوری سند مذکور ہے، اس کی استنادی حیثیت کو بعض محققین نے مشکوک بتایا ہے۔ (۲)

(۳) اگر حضرت عمرؓ کا یہ قول مستند طریقے پر ثابت ہو جائے تو یہاں یہ قول سیاق و سباق سے کاٹ کر نہایت مجمل طریقے پر بیان ہوا ہے، حضرت عمرؓ نے یہ بات کن حالات میں ارشاد فرمائی، کیا وہ دولت مند افراد کا سارا مال غریبوں میں تقسیم کرنا چاہتے تھے، یا اس کی کوئی حد ان کے ذہن میں تھی؟ مذکورہ روایت میں ان میں سے کوئی بات بھی واضح نہیں ہے۔

رمادہ کی قحط سالی

حضرت عمرؓ کے زمانے کے حالات اور ان کے دوسرے ارشادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عمر نے یہ بات اس شدید قحط سالی کے بعد ارشاد فرمائی تھی جو "عام الرمادہ" کے نام سے مشہور ہے، اور جس میں ہزار ہا افراد کے بھوک سے مر جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا، امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کر کے اس قحط کے حالات اور اس کے بارے میں حضرت عمرؓ کا ارشاد اس طرح بیان فرمایا ہے:

---

(۱) محلی لابن حزم ص ۲۲۷ ج ۶۔

(۲) ملاحظہ ہو: ڈاکٹر عبدالسلام العبادی کی کتاب "الملکیۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ"۔ ظ ۲۶۶ ج ۲۔ بحوالہ "نظرات فی کتاب اشتراکیۃ الاسلام" للشیخ محمد الحامد۔ ص ۱۲۹ و ۱۳۰۔

"إن عمر بن الخطاب رضي الله عنه قال عام الرمادة. وكانت سنة شديدة ملمة بعد ما اجتهد في إمداد الأعراب بالإبل و القمح و الزيت من الأرياف كلها حتى بلحت الأرياف كلها مما جهدها ذالك. فقام عمر يدعو، فقال: اللهم اجعل رزقهم على رئوس الجبال. فاستجاب الله له و للمسلمين. فقال: حين نزل به الغيث: الحمد لله. فوالله لو أن الله لم يفرجها ما تركت بأهل بيت المسلمين لهم سعة إلا أدخلت معهم أعدادهم من الفقراء فلم يكن إثنان يهلكان من الطعام على ما يقيم واحداً"

"حضرت عمر بن خطابؓ نے رمادہ کے سال میں فرمایا اور یہ بڑا سخت مصیبت کا سال تھا، اور حضرت عمرؓ نے زرخیز علاقوں سے اونٹ، گندم اور زیتون منگوا کر دیہات کے لوگوں کی مدد فرمائی تھی، یہاں تک کے زرخیز علاقے اس امداد کے بار کی وجہ سے خشک ہو گئے، اس موقع پر حضرت عمرؓ نے دعا کی کہ یااللہ! ان کے لئے پہاڑوں کی چوٹیوں پر (برسنے والی بارش کے ذریعہ) رزق مہیا فرما، اللہ تعالیٰ نے ان کی اور مسلمانوں کی دعا قبول فرمائی، چنانچہ جب بارش ہو گئی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا، الحمد للہ، خدا کی قسم اگر اللہ تعالیٰ اس مصیبت کو دور نہ فرماتا تو میں کسی بھی کشادہ حال گھرانے کو نہ چھوڑتا جس میں اس کے افراد خاندان کی تعداد کے برابر فقرا کو ان کے ساتھ شامل نہ کر دیتا، کیونکہ جتنا کھانا ایک آدمی کے لئے کافی ہو سکتا ہے، اگر اس پر دو آدمی گزارہ کرتے تو ان میں کوئی ہلاک نہ ہوتا" (۱)

"الادب المفرد" کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے، اس میں بھی یہ روایت دیکھی جا سکتی ہے۔(۱)

امام ابن سعد نے بھی حضرت عمرؓ کا یہ قول ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

---

(۱) (الادب المفرد، للامام البخاری ص۸۲، ۸۳ باب نمبر ۲۵۳، فضل اللہ الصمد ص ۲۴، ۲۵ ج۲)

(۱) الادب المفرد، ترجمہ مولانا خلیل الرحمٰن نعمانی، ص۲۷۲، مطبوعہ دارالاشاعت، کراچی ۱۹۶۹ء

«لو لم أجد للناس من المال ما يسعهم إلا أن أدخل على كل أهل بيت عدتهم، فيقاسمونهم أنصاف بطونهم حتى يأتي الله بحيا فعلت، فإنهم لن يهلكوا عن أنصاف بطونهم».

اگر مجھے اتنا مال نہ ملتا جو لوگوں کی ضرورت پوری کر دے، اور لوگوں کی حاجت روائی کے لئے اس کے سوا کوئی صورت نہ ہوتی کہ میں ہر گھرانے میں اس کے افراد کے برابر دوسرے افراد کو داخل کر دوں، تاکہ وہ سب آدھی آدھی خوراک تقسیم کر کے کھائیں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ بارش عطا فرمائے، تو میں ایسا ہی کر گزرتا، کیونکہ لوگ آدھا پیٹ کھانے کی وجہ سے ہلاک نہ ہو جاتے۔ (۲)

یہ ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا ارشاد کا پس منظر، یعنی شدید قحط سالی کے اس زمانے میں جب ہزار ہا افراد کے بھوکے مرنے کا اندیشہ تھا، آپ نے یہ ارادہ فرمایا تھا کہ خوشحال لوگوں کو اس بات کا پابند بنا دیں کہ وہ اپنے افراد خاندان کے برابر دوسرے افراد کو بھی اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیا کریں، لیکن چونکہ یہ خیال آپ کو اس وقت آیا جب قحط سالی ختم ہو چکی تھی، اس لئے آپ کو اس پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔

یہ صورت حال ہمارے زیر بحث مسئلے سے بالکل مختلف ہے، ہماری گفتگو اس صورت میں ہو رہی ہے جب مالکان اراضی نے اپنے تمام شرعی واجبات ادا کر دیئے ہوں، اور ان کی ملکیت بھی جائز ہو، سوال یہ ہے کہ کیا اس صورت میں ان کی زمینیں بلامعاوضہ ان سے لی جا سکتی ہیں؟ حضرت عمرؓ کے اس ارشاد سے ایسے مواقع پر بلامعاوضہ زمینیں لے لینے کا کوئی جواز معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ حضرت عمرؓ نے دولت مند افراد پر جو ذمہ داری عائد کرنے کا ارادہ فرمایا تھا، وہ ان کے شرعی واجبات کا ایک حصہ تھی۔

بھوک مٹانے کی شرعی ذمہ داری

۹۵۔ قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کی تصریحات میں یہ بات واضح ہے کہ اگر کسی بھی مسلمان کو کوئی ایسا انسان ملے جو بھوک سے بیتاب ہو، اور اس کے پاس بھوک مٹانے کا کوئی سامان نہ ہو، تو اس پر شرعاً واجب ہے کہ اس کی بھوک مٹانے کا سامان کرے، یہ محض اس کا احسان

---

(۲) طبقات ابن سعد، ص ۳۱۶ ج ۳، مطبوعہ دار صادر، بیروت، احوال سیدنا عمر بن خطابؓ۔

نہیں ہے، بلکہ اس کی شرعی ذمہ داری ہے، چنانچہ قرآن کریم نے جا بجا اس کا حکم دیا ہے، مثلاً ارشاد ہے:

«فلا اقتحم العقبة وما أدراك ما العقبة فك رقبة أو إطعام في يوم ذي مسغبة يتيماً ذا مقربة أو مسكيناً ذا متربة».

پس وہ شخص گھاٹی میں کیوں نہ گھس گیا؟ اور تمہیں کیا معلوم کہ گھاٹی کیا ہے؟ کسی کی گردن چھڑانا، یا کسی بھوک والے دن میں کسی قرابت دار یتیم یا کسی خاک آلود مسکین کو کھانا کھلانا۔ (۱)

اسی طرح قرآن کریم نے جہنمیوں کی زبانی ان کے جہنم میں جانے کے اسباب بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

«لم نك من المصلين و لم نك نطعم المسكين».

ہم نماز پڑھنے والوں میں نہ تھے، اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ (۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد احادیث میں اس کا حکم دیا ہے، حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

فكوا العاني، يعني الأسير، أطعموا الجائع.

(جنگی) قیدی کو چھڑاؤ، اور بھوکے کو کھانا کھلاؤ۔ (۱)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أيما أهل عرصة أصبح فيهم امرؤ جائع فقد برئت منهم ذمة الله تعالى.

جس کسی احاطے کے لوگ اس حالت میں صبح کو بیدار ہوں کہ ان کے درمیان کوئی شخص بھوکا ہو تو ایسے لوگوں سے اللہ تعالیٰ کا ذمہ بری ہے۔ (۲)

اسی طرح حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) سورۃ البلد، آیت ۱۱ تا ۱۶۔

(۲) سورۃ المدثر ۷۴: ۴۳ و ۴۴۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجہاد، باب نمبر ۱۷۱، حدیث نمبر ۳۰۴۶۔

(۲) مسند احمد، ص ۳۳ ج ۲ مطبوعہ دار صادر، بیروت۔

«ليس بمؤمن من بات شبعان . وجاره جائع إلى جنبه»

وہ شخص مومن نہیں ہے جو رات کو پیٹ بھر کر سوئے اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا ہو۔ (۳)

قرآن و سنت کے ان ارشادات کی بنا پر امت کے تقریباً تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ جو شخص بھی کسی کو بھوکا پائے، اسے کھانا کھلانا اس پر واجب ہے، اور اگر قحط کا زمانہ ہو جس میں بہت سے لوگ بھوکے ہوں تو ان کی بھوک مٹانا اس علاقے کے خوش حال لوگوں پر فرض کفایہ ہے، اس سلسلے میں چند فقہاء کی تصریحات درج ذیل ہیں:

امام ابو بکر جصاص رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

«إن المفروض إخراجه هو الزكاة . إلا أن تحدث أمور توجب المساواة و الإعطاء . نحو الجائع المضطر . والعاري المضطر . أوميت ليس له من يكفنه أو يواريه .

مال کا جو حصہ نکالنا مالک کے ذمہ واجب ہے، وہ زکوٰۃ ہی ہے، الا یہ کہ ایسے امور پیش آ جائیں جو غم خواری اور دینے کو واجب کر دیں، مثلاً کوئی بھوکا اضطرار کی حالت میں سامنے آ جائے، یا کوئی ننگا مضطر ہو، یا کوئی میت ہو جس کے کفن دفن کا کوئی انتظام نہ ہو۔ (۱)

فقہ حنفی کی مشہور کتاب "الاختیار" میں علامہ موصلیؒ لکھتے ہیں:

من اشتد جوعه حتى عجز عن طلب القوت . ففرض على كل من علم به أن يطعمه . أو يدل عليه من يطعمه . صونا له عن الهلاك . فإن امتنوا عن ذالك حتى مات اشتركوا فى الإثم» .

کوئی شخص شدید بھوک میں مبتلا ہو، اور گزارے کے لائق غذا کی تلاش سے عاجز ہو چکا ہو، تو ہر وہ شخص جسے اس بات کا علم ہو، اس پر فرض ہے کہ اسے کھانا کھلائے، تاکہ وہ ہلاکت سے بچ سکے، اگر تمام لوگ اس فریضہ کی ادائیگی سے باز رہے، یہاں تک کہ وہ شخص مر گیا، تو گناہ میں سب شریک ہوں گے۔ (۲)

---

(۳) مشکوٰۃ شریف۔ ص ۴۲۴، کتاب الادب۔ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق، بحوالہ بیہقی فی شعب الایمان۔

(۱) احکام القرآن للجصاص۔ ص ۱۰۶ ج ۳، مطلب فی زکاۃ الذہب والفضۃ۔

(۲) الاختیار لتعلیل المختار۔ ص ۱۷۵ ج ۴، کتاب الکراہیۃ۔ فصل فی الکسب۔

شافعی مذہب کے مشہور عالم علامہ رملیؒ ان افعال کی فہرست شمار کراتے ہوئے جو مسلمانوں پر فرض کفایہ ہیں، تحریر فرماتے ہیں:

ودفع ضرر المسلمين و أهل الذمة ككسوة عار ما يستر عورته . أو يقي بدنه مما يضره . و إطعام جائع إذا لم يندفع ذالك الضرر بزكاة وسهم المصالح من بيت المال . لعدم شيئي فيه . أو لمنع متولية ولو ظلماً .... و منه يؤخذ أنه لو سئل قادر في دفع ضرر لم يجزله الامتناع و إن كان هناك قادر آخر».

اسی طرح مسلمانوں اور ذمیوں (اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں) سے ضرر دفع کرنا بھی فرض کفایہ ہے، مثلاً کسی ننگے کو اتنا لباس دینا جس سے وہ ستر عورت کر سکے، یا اپنے بدن کو مضر اثرات (گرمی یا سردی) سے بچا سکے، اور بھوکے کو کھانا کھلانا، جب کہ یہ ضرر زکوۃ سے اور بیت المال کے مصالح عامہ کی مد سے دور نہ ہو سکتا ہو، یا تو اس لئے کہ بیت المال میں کچھ موجود نہ ہو، یا اس لئے کہ اس کا منتظم دیتا نہ ہو، خواہ وہ ظلماً ایسا کر رہا ہو، ...... اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اگر کوئی شخص جو اس ضرر کو دفع کرنے پر قادر ہے، اگر اس سے اس بات کا مطالبہ کیا جائے (کہ اس ضرر کو دور کرنے پر خرچ کرے) تو اس کے لئے انکار کرنا جائز نہیں، خواہ وہاں کوئی دوسرا شخص بھی موجود ہو، جو خرچ کرنے پر قادر ہے۔ (۱)

اور امام غزالیؒ تحریر فرماتے ہیں:

إذا أصاب المسلمين قحط أو جدب . وأشرف على الهلاك جمع . فعلى الأغنياء سد مجاعتهم و يكون فرضا على الكفاية.

جب مسلمانوں کو قحط یا خشک سالی کا سامنا ہو، اور بہت سے لوگ ہلاکت کے کنارے پہنچ جائیں، تو ان کی بھوک کا انتظام کرنا مالدار لوگوں کی ذمہ داری ہے، اور یہ فرض کفایہ ہے۔ (۱)

---

(۱) نهاية المحتاج للرملی ص ۴۲ ج ۸، کتاب الجہاد، مطبوعہ بیروت

(۱) شفاء الغليل ص ۲۴۲، بحوالہ "الملكية في الشريعة الاسلامية" از ڈاکٹر عبدالسلام العبادی، ص ۸۲ ج ۳۔

بہرصورت! بھوکے ننگے شخص کی فوری ضرورت کی تکمیل یا قحط سالی کے زمانے میں قحط زدہ افراد کی امداد تو ہر مسلمان کا شرعی فریضہ ہے. اگر کوئی شخص اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو وہ گناہ گار ہے. اور ایسی صورت میں اسلامی حکومت اسے اس فریضے کی ادائیگی پر مجبور بھی کر سکتی ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے جس ارادے کا اظہار فرمایا وہ اس اصول کے عین مطابق ہے. جو قرآن و سنت کی روشنی میں فقہاء امت کے درمیان طے شدہ ہے. لیکن اس سے مذکورہ ایمرجنسی کے بغیر کسی شخص کی جائز املاک پر بلا معاوضہ زبردستی قبضہ کرنے کا جواز ہرگز ثابت نہیں ہوتا. کیونکہ ہماری تمام تر گفتگو دو مفروضات کی بنیاد پر ہو رہی ہے. ایک یہ کہ مالک کی ملکیت شرعی اعتبار سے جائز ہو. اور دوسرے یہ کہ وہ اپنی املاک پر عائد ہونے والے تمام شرعی واجبات ادا کرتا ہو. قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کے جو دلائل پیچھے بیان کئے گئے ہیں، ان کی رو سے ایسے شخص کی کسی بھی مملوکہ چیز کو بلا معاوضہ زبردستی اس کی ملکیت سے نکالنا جائز نہیں. ہاں اس کو تمام شرعی واجبات ادا کرنے پر بزور قانون مجبور کیا جا سکتا ہے، جن میں قحط زدہ افراد کی خوراک بھی شامل ہے۔

فاضل مال کو خرچ کرنے کا حکم۔

۹۶۔ یہیں سے ایک اور نکتے کی بھی وضاحت ہو سکتی ہے، جو ہمارے سامنے بحث کے دوران اٹھایا گیا. اور وہ یہ کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

«یسئلونك ماذا ینفقون قل العفو»

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجئے جو (ضرورت سے فاضل ہو" (۱)

نکتہ یہ اٹھایا گیا کہ اس آیت سے تمام لوگوں کو ضرورت سے زائد مال خرچ کرنے کا حکم دیا ہے. اگر لوگ از خود اس حکم کی تعمیل نہ کر رہے ہوں، اور حکومت اس پر عمل کرانے کے لئے ان کا فاضل مال ان سے لے کر غریبوں میں تقسیم کر دے تو اس میں کیا حرج ہے؟

اس سوال کا جواب اس بات پر موقوف ہے کہ قرآن کریم کا یہ ارشاد (کہ زائد از ضرورت مال خرچ کر دو) کوئی وجوبی حکم (Maneatory order) ہے. یا استحبابی حکم ہے؟ اگر وجوبی حکم ہے تو بلاشبہ زائد از ضرورت مال کا خرچ کرنا شرعی واجبات میں شامل ہو گیا. اس لئے بزور قانون اس کی تعمیل کرانے کا اختیار حکومت کو ہو گا. لیکن اگر یہ کوئی استحبابی حکم ہے، جسے مالکان کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے، تو پھر یہ شرعی واجبات میں داخل نہ ہو گا. اس لئے حکومت کو اس پر بزور

(۱) البقرة ۲: ۲۱۹۔

قانون مجبور کرنے کا اختیار نہیں ہو گا. لہٰذا پہلے اس بات کی تحقیق کر لینا مناسب ہے، کہ یہ حکم کس نوعیت کا ہے؟

"قل العفو" کا صحیح مطلب

اس آیت قرآنی کا سیاق و سباق، اور اسکے نزول کا پس منظر واضح طور پر بتا رہا ہے کہ یہ کوئی وجوبی حکم نہیں ہے، ترغیبی اور استحبابی نوعیت کا حکم ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ حکم از خود نازل نہیں ہوا، بلکہ صحابہ کرام کے سوال کے جواب میں نازل ہوا ہے، چنانچہ آیت کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے، "لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟" یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ کچھ لوگ اپنا مال اپنی مرضی سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہتے تھے، لیکن وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ کتنا مال خرچ کرنا اجر و ثواب کا موجب ہے؟ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ جو مال تمہاری ضرورت سے زائد ہو، اس کی جو مقدار بھی خرچ کرو گے، موجب اجر و ثواب ہو گی، اس سوال کے جواب کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ جب قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے فضائل نازل ہوئے، تو بعض صحابہ کرام ان فضائل کو حاصل کرنے کے جوش میں اپنا سارے کا سارا مال خرچ کر دیتے تھے، اور خود ان کے اور ان کے اہل و عیال کے لئے کچھ نہ بچتا تھا، ان کا یہ جذبہ تو بلاشبہ قابل قدر تھا، لیکن اس طرح نفلی صدقہ کرنے کی بنا پر چونکہ خود اپنے نفس اور اپنے بیوی بچوں کا واجب حق پامال ہوتا تھا، اس لئے قرآن و سنت نے انہیں اس سے روکا، اور یہ بتایا کہ نفلی صدقہ اسی مال سے خرچ کرو جو تمہارے اور تمہارے اہل و عیال کی ضرورت سے زائد ہو۔

یہ بات ان حدیثوں سے مزید واضح ہو جاتی ہے، جو حافظ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں ذکر فرمائی ہیں:

(۱) عن جابر بن عبداللہ قال: أتی رسول اللہ ﷺ رجل ببیضة من ذهب أصابها في بعض المعادن. فقال: یا رسول اللہ! خذ هذه مني صدقة. فواللہ ما أصبحت أملك غیرها. فأعرض عنه. فأتاه من رکنه الأیمن. فقال له مثل ذالك. فأعرض عنه. ثم قال له مثل ذالك. فأعرض عنه. ثم قال له مثل ذالك. فقال: هاتها مغضباً. فأخذها

فحذفه بها حذفة لو أصابه شجه، أو عقره، ثم قال: يجيئى أحدكم بماله كله يتصدق به، و يجلس يتكفف الناس، إنما الصدقة عن ظهر غنى.

حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص سونے کا ایک انڈا لے کر آیا جو اس نے کسی کان سے حاصل کیا تھا، آکر عرض کیا یا رسول اللہ: یہ مجھ سے صدقہ کے طور پر (خرچ کے لئے) لے لیجئے، کیونکہ خدا کی قسم آج کی صبح میں اس کے سوا کسی چیز کا مالک نہیں ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا، پھر وہ دائیں جانب سے آیا، اور وہی بات پھر کہی، آپ نے پھر منہ موڑ لیا، اس نے پھر وہی بات دہرائی، آپ نے پھر منہ موڑ لیا، اس شخص نے پھر وہی بات کہی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناراضگی کے انداز میں فرمایا: "لاؤ" یہ کہہ کر سونا اس سے لے لیا، پھر اسے اسی کی طرف اس انداز میں پھینکا کہ اگر وہ اسے لگ جاتا تو اسے چوٹ لگ جاتی، پھر فرمایا: تم میں سے بعض لوگ اپنا سارے کا سارا مال صدقہ کرنے کے لئے اٹھا لاتے ہیں، پھر دوسروں کے دست نگر بن کر بیٹھ جاتے ہیں، (قابل ثواب) صدقہ تو وہ ہے جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد ہو۔

(۲) عن جابر بن عبداللہ، قال: قال رسول اللہ ﷺ: إذا كان أحدكم فقيراً فليبدأ بنفسه، فإن كان له فضل فليبدأ مع نفسه بمن يعول، ثم إن وجد فضلا بعد ذالك فليتصدق على غيرهم.

حضرت جابرؓ ہی روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص محتاج ہو تو سب سے پہلے اپنے نفس پر خرچ کرے، اگر اپنے نفس پر خرچ کرنے کے بعد کچھ بچ جائے تو اپنے نفس کے ساتھ ان لوگوں سے شروع کرے جن کی کفالت اس کے ذمہ ہے، اگر پھر بھی کچھ بچ جائے تو اسے صدقہ کرے۔

(۳) عن أبي هريرة قال: قال رجل: يا رسول الله! عندي دينار. قال: أنفقه على نفسك، قال: عندي آخر، قال: أنفقه على أهلك،

قال : عندی آخر، قال : أنفقه علی ولدك ، قال : عندی آخر ، قال : فأنت أبصر.

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میرے پاس ایک دینار ہے، آپ نے فرمایا کہ اسے اپنے اوپر خرچ کر، اس نے کہا کہ میرے پاس اس کے علاوہ ایک اور بھی ہے، آپ نے فرمایا کہ اپنے گھر والوں پر خرچ کر، اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور ہے، آپ نے فرمایا کہ اسے اپنی اولاد پر خرچ کرو، اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور بھی ہے، آپ نے فرمایا کہ اس کے بارے میں تم ہی بہتر فیصلہ کر سکتے ہو۔ (۱)

ان تمام احادیث سے واضح ہے کہ حالات کے جس پس منظر میں یہ آیت نازل ہوئی ہے، وہاں صورت حال یہ نہیں تھی کہ لوگ کم خرچ کر رہے تھے، اور انہیں زیادہ خرچ کرنے کا حکم دینے کے لئے یہ فرمایا گیا کہ تم فاضل مال صدقہ کر دو، بلکہ صورت حال یہ تھی کہ لوگ اپنی استطاعت سے کہیں زیادہ صدقہ کر رہے تھے، اور انہیں اعتدال کی اس کم ترین حد پر لانا مقصود تھا کہ وہ کم از کم اپنے اور اپنے گھر والوں کی ضروریات کو پورا کر لیں ـــــ دوسرے الفاظ میں سوال کرنے والوں کا منشا یہ نہیں تھا کہ ہمارے اوپر کتنا خرچ کرنا واجب ہے؟ بلکہ پوچھنا یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ کتنا صدقہ ہمارے لئے جائز ہے؟ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ "جتنا ضرورت سے زائد ہو" اس کا خرچ کرنا جائز ہے، اس سے آگے اپنے زیر کفالت بیوی بچوں کا حق مار کر خرچ کرنا جائز نہیں۔

چنانچہ حافظ ابن جریر طبری رحمتہ اللہ علیہ اس آیت پر مفصل بحث کے بعد فرماتے ہیں:

«الصواب من القول فی ذالك ما قاله ابن عباس علی ما رواه عنه عطیه من أن قوله «قل العفو» لیس بإیجاب فرض فرض من الله حقاً فی ماله ، ولکنه إعلام منه ما یرضیه من النفقة مما یسخطه جوابا منه لمن سأل نبیه محمداً ﷺ عما فیه له رضا ، فهو أدب من الله لجمیع خلقه علی ما أدبهم به فی الصدقة غیر المفروضات ، ثابت الحکم غیر ناسخ لحکم کان قبله بخلافه ، ولا

---

(۱) تفسیر ابن جریر، ص ۳۶۱ ج ۲، مطبوعہ بیروت، طبع جدید۔

منسوخ بحكم حدث بعده، فلا ينبغي لذى ورع و دين أن يتجاوز في صدقات التطوع و هباته و عطايا النفل و صدقته ما أدبهم به نبيه ﷺ بقوله «إذا كان عند أحدكم فضل فليبدأ بنفسه، ثم بأهله، ثم بولده، ثم يسلك حينئذ في الفضل مسالكه التي ترضي الله ويحبها» و ذلك هو القوام بين الإسراف و الإقتار الذي ذكره الله عز و جل في كتابه إن شاء الله تعالى»

اس آیت کی تفسیر میں صحیح بات وہ ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمائی، اور جو ان سے امام عطیہ نے روایت کی ہے، وہ بات یہ ہے کہ قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ "قل العفو" (کہہ دو جو زائد ہو) اس کا مقصد کوئی ایسا فریضہ عائد کرنا نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے مال پر وجوبی طور پر مقرر فرمایا ہو، بلکہ اس کا مقصد لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ کونسا صدقہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور کونسا اللہ کی ناراضی کا موجب ہے، اور یہ بات ان لوگوں کے سوال کے جواب میں ارشاد فرمائی گئی ہے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھا تھا کہ کونسا صدقہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہے، لہٰذا اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی تمام مخلوق کو وہ ادب سکھایا گیا جس کی رعایت ان کو تمام غیر واجب صدقات میں رکھنی چاہئے، اس آیت کا حکم اب بھی برقرار ہے، نہ اس نے کسی سابقہ حکم کو منسوخ کیا، اور نہ اس کو کسی بعد والے حکم سے منسوخ کیا گیا، لہٰذا جو شخص بھی دیانت اور تقویٰ کا حامل ہو، اسے چاہئے کہ اپنے نفلی صدقات، ہبہ اور نفلی عطیات میں اس ادب کی رعایت رکھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں سکھایا ہے کہ "جب تم میں سے کسی کے پاس فاضل مال ہو تو وہ پہلے اپنے آپ سے ابتدا کرے، پھر اپنے گھر والوں سے، پھر اپنی اولاد سے، اس کے بعد بھی کچھ بچے تو پھر اس میں وہ راستے اختیار کرے جو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے والے ہیں، اور جنہیں وہ پسند کرتا ہے۔" ـــ یہی اعتدال کا وہ راستہ ہے جو اسراف اور بخل کے درمیان ہے، اور جسے اختیار کرنے کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حکم دیا ہے" (۱)

---

(۱) تفسیر ابن جریر، ص۳۶۸ ج۲، طبع بیروت ۱۴۰۵ھ۔

اس تفصیل سے یہ بات کسی ادنیٰ اشتباہ کیئے بغیر واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم کا مذکورہ بالا ارشاد ہے "جو ضرورت سے زائد ہو" واجب صدقہ کے ابتدائی حد کا نہیں، بلکہ جائز صدقے کی انتہائی حد کا بیان ہے۔ یعنی جائز طور سے جتنا مال نفلی صدقات میں خرچ کر سکتے ہو، اس کی آخری حد یہ ہے کہ وہ تمہاری ذاتی ضروریات سے زائد ہو، اس سے آگے بڑھ کر اتنا خرچ کرنا جس سے اپنے بیوی بچوں کا حق مارا جائے، تمہارے لئے جائز نہیں، کیونکہ ان کے حق کی ادائیگی تم پر واجب ہے، اور یہ صدقہ (جو زکوٰۃ کے علاوہ ہو۔) نفل اور مستحب ہے، اور نفل اور مستحب کی خاطر واجب کو چھوڑنا کسی طرح جائز نہیں۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ "زائد از ضرورت خرچ کرنے" کا مذکورہ حکم وجوبی نہیں، بلکہ استحبابی ہے، یعنی ہر شخص کے ذمے شرعاً یہ لازم نہیں ہے کہ وہ ضرورت سے زائد ہر چیز صدقہ کر دے، بلکہ ایسا کرنا مستحب ہے، تو اب اس کام کو بزور قانون لازم کرنا درست نہیں ہو سکتا۔

۹۷۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلامی حکومت مصالح عامہ کی خاطر کسی مباح کو لازم کر سکتی ہے، تو ایک مستحب کام کو لازمی قرار دینا تو اور زیادہ جائز ہونا چاہئے۔ لہٰذا اگر کسی قانون کے ذریعہ لوگوں پر یہ لازم کر دیا جائے کہ وہ اپنی فاضل دولت ضرور صدقہ کریں تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہ ہونا چاہئے۔

میں اس مسئلے پر پہلے بحث کر چکا ہوں کہ ایک اسلامی حکومت کے لئے مباحات کو لازم کرنے کا اختیار کن حدود کا پابند ہے؟ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مستقل طور پر کسی حلال کو حرام کرنا یا کسی مباح کو واجب قرار دینا کسی کے لئے جائز نہیں، البتہ کسی وقتی مصلحت کی خاطر ایک اسلامی حکومت کسی مباح کام کے کرنے کا وقتی حکم جاری کر سکتی ہے، جس کی تعمیل واجب ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس حکم سے قرآن و سنت کے کسی دوسرے ارشاد کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو۔

بالکل یہی اصول مستحب امور میں بھی جاری ہو گا، یعنی کسی مستحب کام کو مستقل طور پر واجب قرار دینا کسی کے لئے جائز نہیں، لیکن کسی وقت مصلحت کی خاطر اسلامی حکومت کی طرف سے عارضی طور پر کسی مستحب کام کا حکم دیا جا سکتا ہے، لیکن یہاں بھی شرط وہی ہو گی کہ اس سے قرآن و سنت کے کسی ارشاد کی خلاف ورزی لازم نہ آئے۔

زکوٰۃ کے علاوہ فاضل مال کو غریبوں پر خرچ کرنا بلاشبہ مستحب ہے، لیکن اگر کوئی حکومت اس مستحب کو بزور قانون لازم کرنے کے لئے ایک خاص حد سے زائد املاک لوگوں سے زبردستی چھینے تو اس سے احترام ملکیت سے متعلق قرآن و سنت کے ارشادات کی خلاف ورزی لازم آتی ہے جن کو

پیچھے تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، اور وہاں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اعلیٰ درجے کی مصلحتوں کی خاطر بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فاضل دولت کو زبردستی لینا گوارا نہیں فرمایا، مثلاً بنو ہوازن کو غلام باندیاں لوٹانے کے لئے آپ نے لوگوں کو ترغیب ضرور دی، لیکن ساتھ ہی یہ واضح فرما دیا کہ جو شخص بلا معاوضہ دینے پر راضی نہ ہو تو وہ بلا تکلف کہہ دے، تاکہ اسے معاوضہ ادا کیا جائے۔ چنانچہ جو لوگ بلا معاوضہ دینے پر راضی نہ ہوئے، ان کو معاوضہ ادا کیا گیا، حالانکہ وہ غلام اور باندیاں "فاضل مال" کی تعریف میں یقیناً داخل تھیں، اور ان کو بنو ہوازن کی طرف لوٹانا یقینی طور پر مستحب تھا، اور آپ امت کے مجموعی مصالح کے پیش نظر اس کو ضروری بھی سمجھ رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے مالی حقوق کے سلسلے میں واجب اور مستحب کی جو واضح درجہ بندی فرمائی ہے، وہ ابدی حکمتوں پر مبنی ہے، مالی حقوق کا ایک حصہ فرض یا واجب ہے، اور اس کی ادائیگی پر مالک کو بزور قانون مجبور کیا جا سکتا ہے، یہ حصہ زکوٰۃ، عشر، صدقۃ الفطر، نفقات واجبہ وغیرہ پر مشتمل ہے، اور اسی میں کسی بھوکے ننگے شخص کی فوری ضرورت کی تکمیل بھی داخل ہے، جیسا کہ پیچھے بیان ہوا، ان حقوق واجبہ کے علاوہ لوگوں کی ہمدردی اور غم خواری کے لئے زیادہ سے زیادہ مال خرچ کرنے کو مستحب قرار دیا گیا ہے، اس کی ترغیب دی گئی ہے، لیکن اسے لازم نہیں کیا گیا۔

جہاں تک لوگوں کی ایسی لازمی ضروریات کا تعلق ہے، جن کے بغیر زندگی ممکن نہ ہو، وہ زکوٰۃ وغیرہ کے لازمی واجبات کے ذریعہ پورے ہو جاتے ہیں، بلکہ اگر زکوٰۃ و عشر کا نظام ٹھیک ٹھیک نافذ ہو تو نادار افراد کی صرف جینے کے لائق ضروریات ہی نہیں، بلکہ اس سے کچھ زیادہ ضروریات بھی پوری ہو جاتی ہیں، اب دولت کے تفاوت کو اعتدال پر لانے کا سوال رہ جاتا ہے، اس کے لئے ایک طرف تو آمدنی کے ذرائع پر پابندی عائد کر کے اور فضول خرچی پر پابندی لگا کر ایسا ماحول پیدا کیا گیا ہے جس میں بیجا ارتکاز دولت کم سے کم ہو، (جس کی کچھ تفصیل انشاءاللہ آگے آئے گی) اور دوسری طرف لوگوں کو رضا کارانہ طریقے سے اپنے بھائیوں پر خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی، اور اس پر آخرت کے اجر و ثواب کے عظیم وعدے کئے گئے ہیں، یہ دنیا چونکہ دارالامتحان ہے، اس لئے اس دائرے میں خرچ کرنے کو لازمی کرنے کی بجائے اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ لوگ قانون کے خوف سے نہیں، بلکہ اختیار اور اپنی خوشی سے یہ خدمت انجام دیں، اسے اللہ کی خوشنودی اور آخرت کے ثواب کا ذریعہ بنائیں، اور اس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں — اگر خرچ کے اس حصے کو بھی قانونی طور پر لازم کر دیا جائے تو اس سے یہ مقصد بھی فوت ہو جاتا ہے، اور احترام ملکیت کا وہ اصول جس کی شریعت نے قدم قدم پر باریک بینی سے رعایت رکھی ہے، وہ

بھی پامال ہو جاتا ہے جس سے اسلام کا بنایا ہوا پورا معاشی ڈھانچہ تلپٹ ہو سکتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حمیٰ

۹۸۔ فاضل وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں مصالح عامہ کی خاطر انفرادی جائیدادوں کو بلامعاوضہ ضبط کر لینے پر حضرت عمرؓ کے ایک اور عمل سے استدلال کیا گیا ہے۔ مذکورہ فیصلے کے متعلقہ فقرے کا ترجمہ یہ ہے:

"کم از کم ایک مثال ایسی موجود ہے جس میں حکومت کی طرف سے حاصل کی ہوئی جائیداد پر کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا گیا، یہ وہ واقعہ ہے جس میں حضرت عمرؓ نے شخصی ملکیت کی زمینوں کو عام چراگاہ کے طور پر استعمال کرنے کے لئے ضبط کیا۔ مالکان زمین نے اس عمل پر صرف احتجاج ہی نہیں کیا، بلکہ یہ بات زور دے کر کہی کہ ہم اسلام قبول کرنے سے پہلے کئی نسلوں سے ان زمینوں کے لئے لڑتے آئے ہیں، لیکن خلیفہ (حضرت عمرؓ) نے اس احتجاج کو رد کر دیا"

یہاں فاضل وفاقی شرعی عدالت نے جس واقعے کا ذکر کیا ہے، وہ حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے، لیکن مذکورہ بالا فقرے میں اسے جس طرح بیان کیا گیا ہے، اس میں چند در چند غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، جن کی بنا پر واقعے کا مفہوم ہی بدل گیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے نہ کسی شخصی ملکیت کی جائیداد پر قبضہ کیا تھا، اور نہ اسے "چراگاہ" بنایا تھا، بلکہ انہوں نے غیر آباد اور غیر مملوک زمین کو گھیر کر اسے "حمی" بنالیا تھا، یعنی اسے بیت المال کے مویشیوں کی چراگاہ کے لئے مخصوص کر لیا تھا، اور جن لوگوں نے ان پر اعتراض کیا، ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ غیر آباد زمین کسی کی ملکیت نہیں ہے، ہر شخص اس سے نفع اٹھا سکتا ہے، اور ہم کئی نسلوں سے اس سے اسی طرح فائدہ اٹھاتے چلے آئے ہیں، اب اسے بیت المال کے مویشیوں کے لئے مخصوص کر لینا آپ کے لئے جائز نہیں، حضرت عمرؓ نے ان کے اس موقف کی تردید فرمائی۔

اس واقعے کے پورے الفاظ صحیح بخاری وغیرہ میں موجود ہیں، لیکن اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے اس دور کے نظام اراضی کی چند باتیں ذہن میں رکھنی ضروری ہیں:

۹۹۔ اس دور میں کچھ زمینیں تو شخصی ملکیت میں ہوتی تھیں، ایسی زمینوں پر ان کے مالکان پوری طرح قابض اور متصرف ہوتے تھے، اور انہیں جس طرح چاہتے استعمال کرتے تھے، دوسری طرف زمینوں کا بیشتر حصہ غیر آباد اور غیر مملوک ہوتا تھا، اس میں خود رو گھاس اور جھاڑیاں وغیرہ ہوتیں، لیکن کھیتی باڑی نہیں ہوتی تھی، ایسی زمینوں کو "موات" (مردہ زمینیں) کہتے تھے، اور

ان کے بارے میں اصول یہ تھا کہ وہ نہ کسی فرد کی ذاتی ملکیت میں ہیں، نہ حکومت کی سرکاری ملکیت میں، ہاں جو شخص بھی محنت کر کے ان زمینوں کے کسی حصے کو کاشت وغیرہ کر کے آباد کر لیتا. وہ اس کا مالک قرار پاتا تھا. لیکن جب تک انہیں کسی نے آباد نہیں کیا، اس وقت تک وہ کسی کی ملکیت نہیں تھیں، بلکہ ہر شہری کو اس کی خود رو گھاس کی جھاڑیوں سے فائدہ اٹھانے کا حق ہوتا تھا. جو لوگ چاہتے وہاں اپنے مویشی چراتے. اور اس میں پائے جانے والے پانی سے اپنے مویشیوں کو سیراب کرتے، اور جو چاہتے. وہاں کی خود رو گھاس. جھاڑیوں یا درختوں کی لکڑیوں کو ایندھن کے طور پر استعمال کرتے. کسی پر روک ٹوک نہیں تھی. اس لئے ایسی زمینوں کو "اراضی مباحہ" یا "مباح عام" (Lands of Common public use) بھی کہا جاتا تھا. البتہ اسلام سے پہلے مذکورہ اصول کے ساتھ ساتھ ایک رواج یہ بھی تھا کہ اگر کوئی باثر زمین دار یا کسی قبیلے کا رئیس ایسی "اراضی مباحہ" میں سے کسی زمین کو زیادہ سرسبز دیکھتا تو اس کی حد بندی کر کے یہ اعلان کر دیتا کہ میں نے اس زمین کو اپنے جانوروں کے لئے مخصوص کر دیا ہے. اب کسی اور کو یہاں مویشی چرانے کی اجازت نہیں ہوگی، عموماً حدبندی کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا تھا کہ ایک کتے کو کسی بلند جگہ پر کھڑا کر دیا جاتا، وہاں سے اس کے بھونکنے کی آواز جتنی دور تک جاتی، وہاں تک کا علاقہ دوسروں کے لئے "ممنوعہ علاقہ" (Prohibited Area) قرار دیدیا جاتا تھا. اس "ممنوعہ علاقے" کو "حمی" کہا جاتا تھا. اور جب کوئی رئیس کسی "ارض موات" یا "ارض مباحہ" کو "حمی" بنالیتا تو دوسروں کو اس سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ (۱)

اسلام کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست قائم فرمائی تو "اراضی مباحہ" کا مذکورہ بالا اصول تو باقی رکھا، کہ غیر آباد غیر مملوک زمینوں میں تمام شہریوں کا حق ہے. لیکن "حمی" بنانے کے مذکورہ طریقے کو ناجائز قرار دیدیا. اور اعلان فرمایا کہ آئندہ کسی شخص کو بھی اس بات کا حق نہیں ہوگا کہ وہ "ارض مباحہ" کے کسی حصے کو "حمی" بنا کر دوسروں کو اس سے روک دے۔

البتہ ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول میں ایک استثناء کا بھی اعلان فرمایا، اور وہ یہ کہ جب کبھی اسلامی ریاست کو مصالح عامہ کے تحت کسی "ارض مباحہ" کو سرکاری ضرورت کے لئے "حمی بنانے کے لئے ضرورت پیش آئے گی. وہ ایسا کر سکے گی، ایسی صورت میں اس "ارض مباحہ" سے وہی کام لیا جا سکے گا جس کے لئے اسے سرکاری طور پر مخصوص کر لیا گیا

---

(۱) فتح الباری. ص ۴۴ ج ۵۔

ہے، اور دوسروں کو سرکاری اجازت کے بغیر اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا، یہ اصول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ:

لا حمی إلا للہ ولرسولہ

"اب کوئی حمی نہیں ہوگی، سوائے اللہ اور اس کے رسول کی حمی کے" (۲)

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں کسی بھی شخص کی ذاتی "حمی کو تسلیم نہیں کیا گیا، لیکن مصالح عامہ اور سرکاری ضرورت کے تحت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "نقیع" نامی علاقے کی زمین کو "حمی" بنایا۔ (۳)

۱۰۰۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد مبارک میں اسی اصول کے تحت شرف اور ربذہ کے مقامات پر ایک "ارض مباحہ" (یعنی غیر آباد غیر مملوک) زمین کو صدقہ کے اونٹوں کی مخصوص چراگاہ قرار دے کر اسے حمی بنایا، اس موقع پر ان بستیوں کے بعض باشندوں نے اعتراض کیا کہ "ارض مباحہ" سے تمام شہریوں کو نفع اٹھانا جائز ہوتا ہے، اور ہم لوگ اس علاقے کے باشندے ہیں، اس علاقے کو دشمن سے محفوظ رکھنے کے لئے ہم نے جنگیں لڑی ہیں، اس لئے خاص طور پر ہمیں اس زمین سے "مباح عام" کے طور پر فائدہ اٹھانے کا حق ضرور پہنچنا چاہئے، اور اسے صرف بیت المال کے مویشیوں کے لئے مخصوص کرنا درست نہیں، لیکن چونکہ حضرت عمرؓ کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اور عمل دونوں موجود تھے، جن کی رو سے ایک اسلامی حکومت کو مصالح عامہ کی خاطر مباح زمین کو "حمی" بنانا جائز ہے، اس لئے بیت المال کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے اس اعتراض کو قبول نہیں فرمایا، اور اس زمین کو بدستور "حمی" بنائے رکھا، البتہ ساتھ ہی "حمی" کے نگران کو یہ تاکید بھی فرمادی کہ غریب لوگ اپنی تھوڑی بہت بکریاں چرانے کے لئے لائیں تو انہیں اجازت دیدیا کرو، مگر دولت مندوں کو آنے سے روکو۔

۱۰۱۔ یہ ہے اصل واقعہ اور اس کا صحیح پس منظر، اب میں صحیح بخاری سے اس واقعے کے الفاظ نقل کرتا ہوں:

«إن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنه استعمل مولی له یدعی هنیا علی الحمی،

فقال: یا هنی اضمم جناحك عن المسلمین، و اتق دعوة المسلمین، فإن

---

(۲) صحیح البخاری، کتاب المساقات، باب نمبر ۱۱، حدیث نمبر ۲۳۷۰، و کتاب الجهاد، باب نمبر ۱۴۶، حدیث نمبر ۳۰۱۲۔

(۳) صحیح البخاری، حدیث نمبر ۲۳۷۰

دعوة المظلوم مستجابة، أدخل رب الصرية و الغنية، و اٍیای و نعم ابن عوف. ونعم ابن عفان، فإنهما إن تهلك ما شيتهما يرجعا إلى نخل وزرع، و إن رب الصرية ورب الغنيمة إن تهلك ما شيتهما يأتني ببنيه. فيقول: يا أمير المومنين! أفتاركهم أنا لا أبالك؟ فالماء و الكلاء أيسر عليّ من الذهب و الورق. و أيم الله أنهم ليرون أني قد ظلمتهم، إنها لبلادهم. فقاتلوا عليها في الجاهلية و أسلموا عليها في الإسلام. والذی نفسی بيده. لو لا المال الذی أحمل عليه في سبيل الله ماحميت عليهم من بلادهم شبراً »

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک آزاد کردہ غلام کو جس کا نام "ھنی" تھا. حمی پر نگران مقرر کیا تھا. چنانچہ اسے (نصیحت کرتے ہوئے) فرمایا کہ اے ہنی! تم مسلمانوں سے نرمی کا معاملہ کرنا. اور مسلمانوں کی دعاؤں سے بچنا. کیونکہ مظلوم کی دعا قبول ہوتی ہے. اور چھوٹے موٹے اونٹ بکری والوں کو اندر آنے دیا کرو. لیکن عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور عثمان بن عفانؓ (جیسے دولت مند لوگوں) کے مویشیوں سے مجھے بچاؤ. اس لئے کہ اگر ان کے مویشی ہلاک ہو گئے. تو وہ اپنے نخلستانوں اور کھیتیوں کی طرف لوٹ جائیں گے. (اور اپنے نقصان کی تلافی کر لیں گے.) لیکن اگر کسی چھوٹے موٹے اونٹ بکری والے کے مویشی ہلاک ہو گئے تو وہ میرے پاس اپنے بیٹوں کو لا کھڑا کرے گا. اور آ کر اے امیر المومنین کہے گا (یعنی اپنے نقصان پر فریاد کرے گا) تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں انہی ویسے ہی چھوڑ دوں گا؟ (نہیں؟ بلکہ مجھے ان کے نقصان کی تلافی کے لئے کچھ نقد رقم دینی پڑے گی) لہٰذا ان کی تھوڑی بہت بکریوں کو پانی اور گھاس مہیا کر دینا زیادہ آسان ہے. بہ نسبت اس کے کہ انہیں سونا چاندی دینا پڑے. خدا کی قسم! یہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ میں نے (حمی بنا کر) ان پر ظلم کیا ہے. یہ ان کا وطن ہے. جس پر انہوں نے جاہلیت میں لڑائیاں کیں. اور اس پر عہد اسلام میں وہ اسلام لائے. قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے. اگر یہ مال (مویشی) میرے پاس نہ ہوتے جو میں لوگوں کو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے سواری کی خاطر مہیا کرتا ہوں. (اور ان کے لئے مستقل چراگاہ کی ضرورت نہ ہوتی) تو میں ان کے

لئے مستقل چراگاہ کی ضرورت نہ ہوتی) تو میں ان کے وطن سے ایک بالشت زمین کو بھی حمی نہ بناتا" (۱)

۱۰۲۔ مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہے کہ جس زمین کو حضرت عمرؓ نے حمی بنایا، وہ کسی کی شخصی ملکیت میں نہیں تھی، بلکہ غیر آباد اور غیر مملوک زمین تھی، جو شریعت کی اصطلاح میں "مباح عام" کہلاتی ہے، اس سے تمام بستی کے لوگ فائدہ اٹھاتے تھے، مگر وہ ملکیت کسی کی نہیں تھی، اور جن بستی والوں سے اس اقدام پر اعتراض کیا، ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ہماری مملوک زمین ہم سے کیوں چھین لی گئی؟ بلکہ اعتراض یہ تھا کہ یہ ہمارا وطن ہے، اور اس کی مباح عام اراضی سے فائدہ اٹھانا ہمارا حق ہے، کیونکہ ہم نے اپنے اس وطن کے دفاع کے لئے لڑائیاں لڑی ہیں، اوپر صحیح بخاری کی جو روایت پیش کی گئی ہے، اس میں حضرت عمرؓ نے اس زمین کے بارے میں یہ فرمایا کہ "انہا لبلادھم" (یعنی یہ انکا وطن ہے/ان کا ملک ہے/ان کا علاقہ ہے) یہ نہیں فرمایا کہ یہ ان کی مملوک زمین ہے، امام ابو عبیدؒ نے بستی والوں کے ساتھ حضرت عمرؓ کا مکالمہ زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ روایت کیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں:

قال أسلم: فسمعت رجلا. من بني ثعلبة يقول: يا أمير المومنين! حميت بلادنا قاتلنا عليها فى الجاهلية وأسلمنا عليها فى الاسلام، يرددها عليه مرارا، و عمر واضع رأسه، ثم أنه رفع رأسه إليه. فقال: البلاد بلاد الله و تحمى لنعم مال الله، يحمل عليها فى سبيل الله.

اسلم رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے قبیلہ بنو ثعلبہ کے ایک شخص کو سنا کہ وہ حضرت عمرؓ سے یہ کہہ رہا تھا کہ "اے امیر المومنین! آپ نے ہمارے علاقے/ہمارے ملک/ہمارے وطن کو حمی بنا لیا ہے، ہم نے اس علاقے کی خاطر جاہلیت میں لڑائیاں لڑیں، اور عہد اسلام میں اسی علاقے پر مسلمان ہوئے" یہ بات وہ صاحب بار بار کہتے رہے، حضرت عمرؓ نے سر جھکایا ہوا تھا، پھر انہوں نے سر اٹھا کر ان سے فرمایا: وطن/علاقہ/ملک اللہ کا تھا، اور اسے اللہ تعالیٰ کے مال مویشی

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب نمبر ۱۸۰، حدیث نمبر ۳۰۵۹۔

(بیت المال) کے لئے حمی بنایا جارہا ہے، ان مویشیوں پر اللہ ہی کی راہ میں سواری کی جائے گی" (۱)

ان الفاظ سے یہ بات صاف واضح ہے کہ بنو ثعلبہ کے اس صاحب کا دعوی یہ نہیں تھا کہ وہ زمین ہماری شخصی ملکیت میں تھی، بلکہ ان کی شکایت یہ تھی کہ یہ ہمارے وطن/علاقے/ملک کی مباح زمین تھی، جس سے ہم فائدہ اٹھایا کرتے تھے، اب ہمیں اس سے محروم کر دیا گیا ہے، پھر جواب میں حضرت عمرؓ نے صاف ارشاد فرمایا کہ وہ علاقہ کسی کی ملکیت نہ تھا، بلکہ اللہ ہی کا تھا، (یعنی مباح اور غیر مملوک تھا) اب اسے اللہ تعالیٰ ہی کے مویشیوں کی حفاظت کے لئے مخصوص کر لیا گیا ہے۔

۱۰۳۔ یہ واقعہ حدیث اور تاریخ کی بہت سی کتابوں میں اسی طرح مذکور ہے، جس میں شخصی ملکیت کو حمی بنانے کا دور دور کوئی تصور موجود نہیں ہے، دراصل "حمی" بنانے کی اصطلاح کا مطلب ہی یہ ہے کہ جو اراضی غیر مملوک اور مباح عام ہوں، ان سے عام لوگوں کو فائدہ اٹھانے سے روک کر انہیں کسی کام کے لئے خاص کر لیا جائے۔ امام ابو عبیدؒ تحریر فرماتے ہیں:

«و تاویل الحمی المنهی عنه فیما نری، واللہ أعلم، أن تحمی الأشیاء التی جعل رسول اللہ ﷺ الناس فیها شرکاء، وهی الماء و الکلاء و النار»

> حمی بنانا جس سے شریعت میں (عام لوگوں کو) منع کیا گیا ہے، اس کا مطلب ہمارے علم کی حد تک یہ ہے کہ ان اشیاء سے لوگوں کو منع کر دیا جائے جس میں تمام لوگ شریک ہیں، اور وہ ہیں: پانی، خود رو گھاس، اور آگ۔ (۱)

لہٰذا حضرت عمرؓ کے حمی بنانے کا مطلب یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ شخصی ملکیت کی اراضی کو چھین کر انہیں بیت المال کی چراگاہ بنایا گیا، بلکہ اصل واقعہ وہی ہے جس کی تفصیل اوپر بیان کی گئی اور ہر وہ شخص جسے اس دور کے نظام اراضی اور "حمی" بنانے کی اصطلاح کا علم ہے، اس کے سوا واقعے کی دوسری کوئی تشریح نہیں کرے گا، چنانچہ حدیث کے شارحین نے اس کی یہی تشریح کی ہے، یہاں میں صرف نمونے کے لئے حافظ ابن حجرؒ کے الفاظ نقل کرتا ہوں، جو صحیح بخاری کے مستند ترین شارح ہیں، اور جن کی حالت یہ ہے کہ پورا ذخیرہ حدیث ہمیشہ کھلی کتاب کی طرح ان کے سامنے رہتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

---

(۱) کتاب الاموال لابی عبید، ص ۲۹۹، فقرہ نمبر ۷۴۰، باب حمی الارض۔

(۱) کتاب الاموال، ص ۲۹۴ فقرہ نمبر ۷۲۷۔

و إنما ساغ لعمر ذلك لأنه كان مواتاً ۔ فحماه لنعم الصدقة لمصلحة عموم المسلمين۔

حضرت عمرؓ کے لئے یہ اقدام اس لئے جائز ہوا کہ وہ زمین "موات" (غیر آباد غیر مملوک) تھی، پس حضرت عمرؓ نے اسے عام مسلمانوں کی مصلحت کے پیش نظر صدقہ کے مویشیوں کے لئے حمی بنایا۔

آگے اس زمین کے شخصی ملکیت میں ہونے کی صراحۃً تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

و إنما حمى عمر بعض الموات مما فيه نبات من غير معالجة أحد ، وخص إبل الصدقة و خيول المجاهدين ، و أذن لمن كان مقلاً أن يرعى فيه مواشيه رفقا به .... و أما قوله «يرون أني ظلمتم» فأشار به إلى أنهم يدعون أنهم أولى به ، لا أنه منعوا حقهم الواجب لهم۔

حضرت عمرؓ نے "موات" (غیر آباد غیر مملوک) زمین کا کچھ حصہ حمی بنایا تھا، جس میں کسی کی کوشش کے بغیر (خود رو) گھاس موجود تھی، اس جگہ کو آپ نے صدقے کے اونٹوں اور مجاہدین کے گھوڑوں کے لئے مخصوص کر لیا، اور جو لوگ کم مال والے تھے، ان کو اس میں مویشی چرانے کی از راہ ہمدردی اجازت دیدی، ..... رہا حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد کہ "یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں نے ان پر ظلم کیا ہے" سو آپ کا اس سے اشارہ اس طرف ہے کہ اس بستی کے لوگوں کا دعوی یہ ہے کہ (زمین کے قرب کی وجہ سے) وہ اس سے فائدہ اٹھانے کے زیادہ مستحق ہیں، یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ کے اس اقدام سے ان کے حق واجب (یعنی ملکیت) سے انہیں محروم کر دیا گیا ہے۔ (۱)

میں سمجھتا ہوں کہ اس وضاحت کے بعد "حمی" کے اس واقعے سے شخصی ملکیت کو بلا معاوضہ سرکاری تحویل میں لینے کا کوئی دور دراز کا بھی تعلق نہیں ہے، لہٰذا فاضل وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں جس ایک واقعے کو معاوضے کے بغیر جائیداد لے لینے کا تنہا واقعہ قرار دیا گیا ہے، وہ بھی مسئلہ زیر بحث سے قطعی غیر متعلق ہے، اور اس سے استدلال درست نہیں۔

---

(۱) فتح الباری، ص ۱۷۷ ج ٦، کتاب الجہاد، مطبوعہ لاہور۔

بلال بن حارثؓ کی جاگیر کا قصہ۔

۱۰۴۔ فاضل وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں حضرت بلال بن حارثؓ کی جاگیر کا قصہ ذکر کیا گیا ہے، اگرچہ ساتھ ہی اس فیصلے میں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ اس واقعے کا تعلق شخصی ملکیت کی زمینوں سے نہیں ہے، تاہم چونکہ اس واقعہ سے بعض اوقات زمینوں کو بلامعاوضہ ضبط کرنے پر استدلال کیا جاتا ہے، اس لئے مختصراً اس واقعے پر بھی ایک نظر ڈال لینا مناسب ہو گا۔

۱۰۵۔ یہ واقعہ اگرچہ حدیث اور فقہ کی متعدد کتابوں میں مذکور ہے، لیکن اس کی وہ روایت جس سے جائیداد کی ضبطی پر استدلال کیا جاتا ہے، صرف یحییٰ بن آدمؒ کی کتاب الخراج میں آئی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں۔

«عن عبدالله بن أبي بکر قال: جاء بلال ابن الحارث المزني إلى رسول الله ﷺ فاستقطعه أرضا، فأقطعها له طويلة عريضة، فلما ولي عمر قال له: يا بلال! إنك استقطعت رسول الله ﷺ أرضا طويلة عريضة فقطعها لك، وإن رسول الله ﷺ لم يكن يمنع شيئا يسأله، وأنت لا تطيق ما في يدك، فقال: أجل، فقال: فانظر ما قويت عليه منها فأمسكه، وما لم تطق وما لم تقو عليه فادفعه إلينا نقسمه بين المسلمين فقال: لا أفعل والله شيئا، أقطعنيه رسول الله ﷺ، فقال عمر: والله لتفعلن، فأخذ منها ما عجز عن عمارته، فقسمه بين المسلمين».

عبداللہ بن ابی بکر کہتے ہیں کہ حضرت بلال بن حارث مزنیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے، اور آپ سے ایک قطعہ زمین طلب کیا، آپ نے ان کو ایک لمبی چوڑی زمین جاگیر کے طور پر دے دی، جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو انہوں نے حضرت بلال بن حارثؓ سے کہا کہ اے بلال! آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک لمبی چوڑی زمین مانگی تھی، جو آپ نے دے دی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ جب کوئی شخص آپؐ سے کچھ طلب کرتا تو آپؐ اسے روکتے نہیں تھے، لیکن اب جو زمین آپ کے قبضے میں ہے، اس (کو آباد کرنے) کی طاقت آپ میں نہیں ہے، حضرت بلالؓ نے کہا: ہاں! حضرت عمرؓ نے

فرمایا: پھر تو آپ جائزہ لے کر دیکھیں، زمین کے جتنے حصے (کو آباد کرنے) کی آپ میں طاقت ہو اسے تو اپنے پاس رکھ لیں، اور جس کی طاقت نہ ہو، وہ ہمیں دیدیں، تاکہ ہم اسے مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیں۔ انہوں نے کہا: خدا کی قسم میں کچھ نہیں دونگا۔ یہ زمین مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی تھی، حضرت عمرؓ نے فرمایا: خدا کی قسم تمہیں ایسا ہی کرنا ہوگا، چنانچہ آپ نے حضرت بلالؓ سے اتنی زمین لے لی جسے آباد کرنے سے وہ عاجز تھے، پھر اسے مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیا" (۱)

اس واقعہ سے استدلال کیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت بلال بن حارثؓ کی وہ زمین جو عطائے نبوی سے ان کی ملکیت میں آچکی تھی، ان سے بلامعاوضہ لے لی، اس سے معلوم ہوا کہ مصالح عامہ کے تحت شخصی املاک کو بلا معاوضہ لیا جا سکتا ہے۔

اس دلیل کے سلسلے میں چند نکات قابل ذکر ہیں:

(۱) یہ واقعہ حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی مذکور ہے، اور اکابر آئمہ حدیث میں سے امام مالکؒ، امام احمدؒ، امام ابوداؤدؒ، امام حاکمؒ وغیرہ نے بھی روایت کیا ہے، لیکن انہوں نے صرف اتنا ذکر فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال بن حارثؓ کو ایک زمین بطور جاگیر عطا فرمائی تھی، لیکن ان میں سے کسی نے حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس جاگیر یا اس کے کچھ حصے کی واپسی کا ذکر نہیں فرمایا، واپسی کی جو تفصیل اوپر بیان ہوئی، وہ صرف یحییٰ بن آدمؒ نے روایت کی ہے، لیکن یہ روایت بھی اس لحاظ سے محل نظر ہے کہ اس کے راوی عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن خرم خود واقعے کے وقت موجود نہیں تھے، کیونکہ ان کی وفات ۱۳۵ھ میں ستر سال کی عمر میں ہوئی (تہذیب التہذیب) جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ۶۵ھ میں پیدا ہوئے تھے، جب کہ بلال بن حارثؓ کا انتقال ۶۰ھ میں ہو چکا تھا، (۱) لہٰذا یہ روایت محدثین کی اصطلاح کے مطابق "منقطع" ہے، جو زیادہ قابل اعتماد نہیں ہوتی۔

(۲) اگر یہ واقعہ درست ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان سے جاگیر کا کچھ حصہ لے لیا تھا تو اسی یحییٰ بن آدمؒ والی روایت میں صراحت موجود ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت بلالؓ سے صرف اتنی زمین لی تھی جسے وہ آباد کرنے سے عاجز تھے، اور شرعی قاعدہ یہی ہے کہ جس کسی شخص کو بنجر زمین

---

(۱) کتاب الخراج یحییٰ بن آدمؒ، ص ۹۳، حدیث نمبر ۲۹۴، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۴۷ھ بتحقیق احمد شاکر۔

(۱) الاصابہ، ص ۱۶۸ ج ۱۔

بطور جاگیر دی گئی ہو، اگر وہ تین سال تک اسے آباد نہ کر سکے تو حکومت کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ زمین اس سے واپس لے لے۔ حضرت عمرؓ نے اسی قاعدہ کے مطابق صرف اتنی زمین ان سے واپس لی جسے نہ صرف یہ کہ وہ آباد نہ کر سکے تھے، بلکہ اسے آباد کرنے سے عاجز تھے۔

یہ بات کہ تحجر زمین کا جاگیر دار اگر تین سال تک زمین کو آباد کر سکے تو اس کے بعد اس زمین پر اس کا حق ختم ہو جاتا ہے، متعدد احادیث و آثار سے ثابت ہے۔ حضرت طاؤسؒ مرسلاً روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«عادی الأرض لله و للرسول ۔ ثم لكم من بعد ۔ فمن أحيا أرضا ميتة فهي له ۔ وليس لمحتجر حق بعد ثلاث سنين»۔

لاوارث زمین اللہ اور رسول کی ہے۔ پھر بعد میں تمہاری ہے، پس جو شخص کسی مردہ (غیر آباد غیر مملوک) زمین کو آباد کرے تو وہ زمین اسی کی ہے، اور کسی ایسے شخص کا جس نے (کسی مردہ زمین کو گھیرنے کے لئے) پتھر لگائے ہوں، تین سال کے بعد کوئی حق نہیں۔ (۱)

یہی الفاظ حضرت عمرؓ کے اپنے قول کے طور پر بھی مروی ہیں، انہوں نے فرمایا:

«ليس لمحتجر حق بعد ثلاث سنين»

پتھر لگانے والے کو تین سال کے بعد کوئی حق نہیں۔ (۲)

انہی احادیث کی بنا پر فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ جس شخص کو کوئی زمین آباد کرنے کے لئے دی گئی ہو، اگر وہ تین سال تک اسے آباد نہ کرے تو وہ اس سے واپس لے لی جائے گی، فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے:

«ومن حجر أرضا ولم يعمر ثلاث سنين أخذها الإمام و دفعها إلى غيره ۔ لأن الدفع إلى الأول كان ليعمرها فتحصل المنفعة للمسلمين من حيث العشر و الخراج ۔ فإذا لم يحصل يدفعه إلى غيره تحصيلا للمقصود ۔ ولأن التحجير ليس بإحياء ليملكه به ۔ لأن الإحياء إنما هو العمارة ۔

(۱) کتاب الخراج لابی یوسف، ص ۶۵، فصل فی موات الارض۔

(۲) کتاب الخراج، بحوالہ بالا، و نصب الرایہ للزیلعی، ص ۲۹۰ و ۲۹۱ ج ۴۔

والتحجير للإعلام. سمي به لأنهم كانوا يعلمونه بوضع الأحجار حوله. أو يعلمونه لحجر غيرهم عن إحياءه. فبقي غير مملوك كما كان»

اور جو شخص کسی زمین کی تحجیر کرے (یعنی اس میں پتھر لگائے) اور تین سال تک اسے آباد نہ کرے. تو امام (حکومت) اسے واپس لے کر دوسرے کو دے دیگی. اس لیئے کہ پہلے شخص کو جو زمین دی گئی تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسے آباد کرے. اور عشر و خراج کے ذریعہ اس کا فائدہ عام مسلمانوں کو بھی پہنچے. جب یہ فائدہ حاصل نہ ہوا تو امام وہ زمین دوسرے کو دے دیگا. تاکہ مقصد حاصل ہو سکے. دوسرے "تحجیر" بذات خود مردہ زمین کو زندہ کرنے کے مرادف نہیں ہے. کہ اس کے ذریعہ ملکیت حاصل ہو سکے. اس لئے زندہ کرنا تو اسی وقت صادق آئے گا جب زمین کو واقعتہً آباد کیا جائے. اور تحجیر تو صرف علامت لگانے کے لئے ہوتی ہے. اور اس کا نام "تحجیر" اس لئے رکھا گیا ہے کہ عام طور سے لوگ زمین (کو گھیرنے کے لئے) اس پر پتھر رکھ کر علامت لگا دیتے تھے. یا کوئی اور علامت رکھ دیتے تھے. تاکہ اس کے ذریعہ دوسروں کو زمین کے زندہ کرنے سے روکا جائے. لہٰذا یہ زمین (تحجیر کے بعد) اسی طرح غیر مملوک رہی جیسی وہ پہلے تھی۔ (۱)

اس اصول کے تحت حضرت بلال بن حارثؓ نے اس زمین کو آباد نہیں کیا تھا. اس لئے ابھی تک وہ ان کی ملکیت میں نہیں آئی تھی. اور تین سال گزرنے پر ان کا آباد کاری کا حق بھی ختم ہو گیا تھا. اگر حضرت عمرؓ اسے کسی نوٹس کے بغیر بھی واپس لے لیتے تو وہ مذکورہ بالا قاعدہ کے مطابق ہوتا. لیکن انہوں نے حضرت بلال بن حارثؓ کو بلا کر انہیں اور موقع دیا. کہ اگر اب بھی وہ اسے آباد کرنے کا وعدہ کریں تو زمین ان سے واپس نہ لی جائے. لیکن انہوں نے یہ یقین دھانی بھی نہ کرائی. اس موقع پر جتنی زمین کو آباد کرنے سے وہ عاجز تھے. اتنی زمین واپس لے لی گئی. یہی واقعہ امام ابو عبیدؒ نے زیادہ بہتر سند کے ساتھ روایت کیا ہے. اس میں مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا:

إن رسول الله ﷺ لم يقطعك لتحتجره عن الناس ، إنما أقطعك لتعمل فخذ منها ما قدرت على عمارته ، و ردّ الباقي.

---

(۱) ہدایہ. ص ۷۷ ۴ ج ۴۔ مطبوعہ مطبع یوسفی. لکھنؤ۔ انڈیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قطعہ زمین آپ کو اس لئے نہیں دیا تھا کہ آپ
صرف اس کی تحجیر کر کے لوگوں کو اسے آباد کرنے سے روک دیں، حضور نے
تو وہ زمین آپ کو اس لئے دی تھی کہ آپ اس میں کام کریں. لہٰذا جتنے حصے کی آباد
کاری پر آپ کو قدرت ہو، وہ تو آپ لے لیں، لیکن باقی واپس کر دیں۔ (۱)

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جو زمین حضرت عمرؓ نے حضرت بلال بن حارثؓ سے واپس لی وہ چونکہ انہوں نے آباد نہیں کی تھی، اس لئے ان کی ملکیت نہیں تھی، انہیں اس کی آباد کاری کا حق ضرور تھا. لیکن یہ حق بھی نہ صرف یہ کہ تین سال گزرنے پر ختم ہو گیا تھا، بلکہ وہ آئندہ بھی اسے آباد کرنے پر آمادہ نہیں تھے. لہٰذا اس زمین کو واپس لینے سے کسی ایسی زمین کی ضبطی کا کوئی جواز ثابت نہیں ہوتا جو مالک کی شخصی ملکیت میں ہو. یہی وجہ ہے کہ جو زمین حضرت بلال بن حارثؓ آباد کر چکے تھے. اور آباد کاری کی بنا پر ان کی ملکیت میں آ چکی تھی، حضرت عمرؓ نے اس کو واپس لینے کے لئے ایک حرف بھی نہیں فرمایا. وہ زمین بدستور انہیں کی ملکیت میں رہی. ان سے ان کی اولاد کی طرف منتقل ہو گئی. بالآخر ان کی اولاد نے خود وہ زمین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو فروخت کی. اور اس دوران اس زمین میں کچھ کانیں بھی نکل آئیں. جو انہیں کے استعمال میں رہیں، اور وہ ان کی زکوٰۃ ادا کرتے رہے۔ (۲)

عراق کی زمینوں کے بارے میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ

۱۰۵۔ فاضل وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں ایک دلیل یہ بھی پیش کی گئی ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانے میں جب عراق فتح ہوا تو بعض حضرات کی رائے یہ تھی کہ مفتوحہ اراضی کے بارے میں اب تک جو معمول رہا ہے اس پر اب بھی عمل کیا جائے. یعنی یہ اراضی فاتح لشکر کے مجاہدین کے درمیان مالکانہ حقوق کے ساتھ تقسیم کر دی جائیں. لیکن حضرت عمرؓ نے اس موقع پر بڑے وثوق کے ساتھ یہ موقف اختیار فرمایا کہ اگر ساری زمینیں اسی طرح مجاہدین کے درمیان تقسیم کی جاتی رہیں تو آنے والوں کے لئے کچھ بھی نہ بچے گا. اس لئے انہوں نے صحابہ کرام کے مشورے سے یہ فیصلہ فرمایا کہ یہ اراضی تقسیم نہ کی جائیں. بلکہ سابق مالکوں کی تحویل میں باقی رکھی جائیں، البتہ ان پر سالانہ خراج عائد کر دیا جائے۔

---

(۱) کتاب الاموال لابی عبید. ص ۲۹۰ فقرہ ۷۱۲۔

(۲) کتاب الاموال لابی عبید۔ ص ۳۳۸ و ۳۳۹. فقرہ نمبر ۸۶۳ تا ۸۶۶۔

۱۰۶۔ حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کی تشریح وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں یہ کی گئی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان زمینوں کو قومی ملکیت میں لے لیا. اور اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ امت کی مصلحت کے خاطر زمینوں کو نیشنلائز کرنا جائز ہے۔

۱۰۷۔ یہاں پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر بالفرض حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کی وہی تشریح اختیار کی جائے جو وفاقی شرعی عدالت نے کی ہے. یعنی یہ کہ فاروق اعظمؓ نے عراق کی زمینوں کو نیشنلائز کر لیا تھا. تب بھی یہ واقعہ ہمارے زیر بحث مسئلے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا. کیونکہ ہمارا زیر بحث مسئلہ ہر قسم کے نیشنلائزیشن کا جواز و عدم جواز نہیں ہے. بلکہ اس کی ایک خاص صورت ہے. اور وہ یہ کہ جو لوگ کسی زمین کے بجا طور پر مالک بن چکے ہوں. اور اپنے اوپر عائد ہونے والے شرعی واجبات بھی ادا کرتے ہوں. کیا ان سے بلا معاوضہ زمینیں لی جا سکتی ہیں؟

۱۰۸۔ اس کے برعکس عراق کی زمینوں کا جو واقعہ پیش آیا، وہ یہ تھا کہ جب مسلمانوں نے عراق فتح کر لیا تو ابھی وہاں کی زمینیں کسی کی شخص ملکیت میں آئی ہی نہیں تھیں. وہ مفتوحہ زمینیں تھیں. ان کے بارے میں اسلامی حکومت کو مکمل اختیار تھا کہ ان کے بندوبست کے لئے جو فیصلہ ملت کے مصالح کے لحاظ سے مناسب سمجھے. کر لے. چاہے مسلمانوں میں مالکانہ حقوق کے ساتھ تقسیم کر دے. چاہے تو انہیں (بعض فقہاء کے قول کے مطابق) مسلمانوں پر وقف کر دے. وہاں اس بات کا کوئی سوال نہیں تھا کہ کسی مسلمان کی جائز ملکیت کے قائم رہتے ہوئے اس سے بلامعاوضہ زمین لے لی جائے۔

۱۰۹۔ نیشنلائزیشن اس صورت میں ناجائز ہے جب اس کے لئے جائز مالکوں کو کسی معاوضے کے بغیر ان کی ملکیت سے محروم کرنا پڑے. یا اس کے شرعی مستحقین کا حق تلف کر کے یہ اقدام کیا جائے. لیکن اگر کوئی زمین کسی کی ملکیت نہیں ہے. اور اسے آباد کر کے کوئی اسلامی حکومت نیشنلائزیشن کر لیتی ہے. تو اس میں شرعی نقطہ نظر سے کوئی قباحت نہیں. بلکہ اسلامی فقہ میں ایسی اراضی کو "اراضی سلطانیہ" کہا گیا ہے ___ حضرت عمرؓ نے اگر عراق کی زمینوں کو وقف کیا تھا (جیسا کہ وفاقی شرعی عدالت یا بعض علماء کا خیال ہے) تو وہ کسی کی جائز ملکیت کو ختم کر کے وقف نہیں فرمایا تھا. اس لئے ہمارے زیر بحث مسئلے سے اس واقعے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱۱۰۔ جہاں تک کسی کی جائز ملکیت کو ختم کر کے اسے وقف کرنے یا نیشنلائزیشن کا تعلق ہے. اس کے بارے میں خود حضرت فاروق اعظمؓ نے عراق کی زمینوں ہی کے بارے میں کرتے ہوئے واضح طور پر یہ بیان فرمایا تھا کہ یہ صورت جائز نہیں ہے. چنانچہ آپ نے فرمایا:

«وإني أعوذ بالله أن أركب ظلماً. لئن كنت ظلمتهم شيئا هو لهم. وأعطيته غيرهم لقد شقيت»

اور میں اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ کسی ظلم کا ارتکاب کروں. اگر میں نے ظلماً اُن سے کوئی چیز لی ہوتی جو ان کی ملکیت ہوتی. اور وہ کسی اور کو دیدی ہوتی تو میں شقاوت کا مرتکب ہوتا۔ (۱)

اس سے صاف واضح ہے کہ حضرت عمرؓ نے نہ کسی کی ملکیت چھین کر کسی اور کو دی تھی. اور نہ وہ اسے جائز سمجھتے تھے. بلکہ انہوں نے مفتوحہ اراضی کو سابق مالکان کی تحویل میں رکھتے ہوئے ان پر سالانہ خراج عائد کر دیا تھا. تاکہ اس خراج کی آمدنی آئندہ ہر دور کے مسلمانوں کے کام آتی رہے۔

بلکہ انہی عراق کی زمینوں کا کچھ حصہ مذکورہ فیصلے سے پہلے آپ نے بعض مجاہدین میں تقسیم کر دیا تھا. اور وہ اس کے مالک بن گئے تھے. بعد میں جب آپ کی یہ رائے ہوئی کہ ان زمینوں کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جائے جو عراق کی عام زمینوں کے ساتھ کیا گیا ہے تو آپ نے ان لوگوں کو راضی کرنے کی کوشش کی کہ وہ یہ زمینیں واپس لیں. اور ان کو بھی عراق کی دوسری زمینوں کے ساتھ شامل فرما دیا۔

چنانچہ حضرت جریر بن عبداللہ البجلی (جو عراق کی فتوحات میں شریک تھے.) فرماتے ہیں:

«كانت بجيلة ربع الناس، فقسم لهم ربع السواد، فاستغلوا ثلاثاً أو أربع سنين. أنا شككت، ثم قدمت على عمر بن الخطاب رضي الله عنه، ومعي فلانة بن فلان. امرأة منهم قد سماها لا يحضرني ذكر اسمها، فقال عمر ابن الخطاب رضي الله عنه: لو لا أني قاسم مسئول لتركتم على ما قسم لكم. ولكن أرى أن تردوا على الناس .... وعاضني من حقي فيه نيفا وثمانين، وقالت فلانة: شهد أبي القادسية وثبت سهمه، ولا أسلمه حتى تعطيني. كذا كذا، فأعطاه إياه»

بجیلہ کا قبیلہ عراق کا فاتح لشکر کا ایک چوتھائی حصہ تھا. حضرت عمرؓ نے سواد

(۱) کتاب الخراج لابي يوسف. ص ۲۵. یہ پوری عبارت آگے بھی آ رہی ہے۔

(عراق) کی چوتھائی زمینیں اس قبیلے میں تقسیم کر دی تھی، چنانچہ یہ لوگ تین چار سال تک اس سے آمدنی حاصل کرتے رہے۔ (راوی کہتے ہیں کہ مدت کے بارے میں مجھے شک ہے کہ وہ تین سال تھی یا چار سال تھی) پھر میں حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوا۔ میرے ساتھ قبیلۂ بجیلہ کی ایک خاتون اور بھی تھیں۔ (راوی کہتے ہیں ان کا نام حضرت جریرؓ نے بتایا تھا، لیکن مجھے اب یاد نہیں) حضرت عمر نے ہم سے فرمایا کہ: ''اگر میں ایسا تقسیم کرنے والا نہ ہوتا جسے اپنی ذمہ داری کا بھی احساس ہے تو میں تم لوگوں کو سابقہ تقسیم ہی پر چھوڑ دیتا، لیکن اب میری رائے یہ ہے کہ تم لوگ اپنی زمینیں لوگوں پر لوٹا دو ۰۰۰۰۰ حضرت عمرؓ نے اس کے بعد مجھے میرے حصے کی زمین کے معاوضے میں اسی سے زیادہ دینار عطا فرمائے، اور وہ خاتون جو میرے ساتھ آئی تھیں، انہوں نے کہا کہ: میرے والد قادسیہ کی جنگ میں شامل تھے، اور ان کا حصہ تقسیم ہو چکا تھا، لہٰذا میں اپنی یہ زمین اس وقت تک آپ کے حوالے نہیں کروں گی جب تک آپ مجھے اتنا اتنا معاوضہ نہ دیں، چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسے مطلوبہ معاوضہ دے دیا۔ (۱)

ایک دوسری روایت میں ان خاتون کا نام ام کرز مذکور ہے، اور اس میں یہ تفصیل ہے کہ انہوں نے معاوضے میں ایک اونٹنی، ایک چادر، اور دونوں ہاتھ بھر کر سونا طلب کیا تھا، اور حضرت عمرؓ نے ان کو وہی معاوضہ دے دیا۔ (۲)

حضرت عمرؓ کے اس فعل کی تشریح کرتے ہوئے حافظ ابن رجب حنبلیؒ تحریر فرماتے ہیں:

"أنا نسلم أن جريرا و قومه من بجيله قسم لهم عمر رضي الله عنه ربع السواد لكونهم ربع المقاتلة، فإن الإمام يجوز له أن يقسم الأرض بين الغانمين و أن لا يقسم، كما سبق تقريره، فلما قسم لهم عمر رضي الله عنه ذالك ملكوه بالقسمة، ثم رأى عمر رضي الله عنه أن ترك السواد كله فيأ أصلح للمسلمين فاحتاج إلى استرضاءهم و تعويض من لم يرض بترك حقه مما ملكه بغير عوض".

(۱) السنن الکبریٰ للبیہقی، ص۱۳۵ ج۹، و کتاب الام للشافعی، ص۱۵۷ ج۲۔

(۲) سنن بیہقی، حوالہ بالا، و کتاب الاموال لابی عبید، ص۶۱ و ۶۲ فقرہ نمبر ۱۵۵۔

"ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت جریر اور ان کی قوم کو جو قبیلہ بجیلہ سے تعلق رکھتی تھی، حضرت عمرؓ سے سواد (عراق) کی چوتھائی زمینیں تقسیم کر دی تھیں، کیونکہ بجیلہ کے لوگ مجاہدین کا ایک چوتھائی حصہ تھے۔ کیونکہ جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے، امام کے لئے دونوں صورتیں جائز ہوتی ہیں، چاہے وہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم کر دے۔ اور چاہے تو تقسیم نہ کرے۔ لہٰذا جب حضرت عمرؓ نے (چوتھائی) زمینیں انہیں (یعنی قبیلہ بجیلہ کو) تقسیم کر دیں تو اس تقسیم کی وجہ سے وہ ان زمینوں کے مالک بن گئے۔ بعد میں حضرت عمرؓ کی یہ رائے ہوئی کہ اگر سواد (عراق) کی تمام زمینوں کو فیئی بنا دیا جائے تو یہ مسلمانوں کی مصلحت کے زیادہ مطابق ہو گا۔ اسی لئے حضرت عمرؓ کو یہ ضرورت پیش آئی کہ وہ بجیلہ کے لوگوں کو راضی کریں۔ یا ان لوگوں کو معاوضہ ادا کریں جو اپنے اس حق کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوں جو انہیں بلا معاوضہ ملا تھا"

اس تفصیل سے یہ بات کسی شک و شبہ کے بغیر ناقابل انکار طریقے پر ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے عراق کی زمینوں کا جو انتظام فرمایا، اس سے نہ صرف یہ کہ بلا معاوضہ مالکان اراضی سے زمینیں چھین لینے پر کسی طرح استدلال نہیں ہو سکتا، بلکہ اسی واقعے میں حضرت جریر بن عبداللہؓ اور ان کے قبیلے کے دوسرے افراد سے حضرت عمرؓ نے جو معاملہ فرمایا، وہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مصالح عامہ کے تحت بھی جائز مالکوں سے زبردستی زمینیں چھیننا جائز نہیں ہے، یہاں حضرت عمرؓ امت کے مجموعی مصالح کے پیش نظر یہ ضروری سمجھ رہے تھے کہ یہ زمینیں جو بعض مجاہدین کو مالکانہ حقوق کے ساتھ دے دی گئی ہیں، ان سے واپس لی جائیں، لیکن انہوں نے اس غرض کے لئے ان مالکوں سے زبردستی زمینیں نہیں لیں، بلکہ انہیں راضی کر کے معاوضہ ادا فرمایا، حافظ ابن رجب نے مذکورہ بالا اقتباس میں اس نکتے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ یہ زمینیں وہ تھیں جو ان مالکوں نے قیمت ادا کر کے نہیں خریدی تھیں، بلکہ خود حضرت عمرؓ ہی نے بحیثیت سربراہ حکومت ان کو مال غنیمت کے حصے کے طور پر عطا فرمائی تھیں۔ اس کے باوجود جب وہ بلامعاوضہ یہ زمینیں واپس دینے پر راضی نہیں ہوئے، تو انہیں معاوضہ ادا فرما کر راضی کیا، کیونکہ وہ ان زمینوں کے مالک بن چکے تھے، اگر زمینوں کو بلامعاوضہ لینا حکومت کے لئے جائز ہوتا تو ان زمینوں کو سب سے پہلے زبردستی لیا جاتا، کیونکہ انہیں حاصل کرنے کے لئے مالکوں کو کوئی قیمت ادا کرنی نہیں پڑی تھی، جب ان زمینوں کو واپس لینے کے لئے بھی معاوضہ ادا کرنا ضروری سمجھا گیا تو جو اراضی ان کے مالکوں نے قیمتاً خریدی ہوں، یا خود آباد کی ہوں، ان کو بلا معاوضہ لے لینا کسی طرح

جائز ہو سکتا ہے؟

۱۱۱۔ اگرچہ فاضل وفاقی شرعی عدالت کی دلیل کے جواب میں مذکورہ بالا تشریح بالکل کافی ہے، اور اس سلسلے میں اس واقعے کی مزید تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن چونکہ وفاقی شرعی عدالت نے جس طرح اس واقعے کو ذکر کیا ہے، اس سے کچھ دوسری غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں، اس لئے یہاں مختصراً اس واقعے کی پوری تفصیل ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔

۱۱۲۔ حضرت عمرؓ نے عراق کی اراضی کا جو انتظام فرمایا اس کو وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں "نیشنلائزیشن" سے تعبیر کیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے اس عمل کی یہ تشریح درست نہیں ہے۔

۱۱۳۔ اس واقعے کی یکجا طور پر مکمل تفصیل سب سے زیادہ جامعیت کے ساتھ امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں بیان کی ہے، میں پہلے ذیل میں اس روایت کا مکمل ترجمہ نقل کرتا ہوں۔ (۱)

"اللہ تعالیٰ نے عراق اور شام کی جو زمینیں مال غنیمت کے طور پر مسلمانوں کو عطا

---

(۱) اصل عربی متن یہ ہے:

وشاورهم في قسمة الأرضين التي أفاء الله على المسلمين من أرض العراق والشام. فتكلم قوم فيها، وأرادوا أن يقسم لهم حقوقهم وما فتحوا. فقال عمر رضي الله عنه: فكيف بمن يأتي من المسلمين فيجدون الأرض بعلوجها قد اقتسمت وورثت عن آباء وحيزت. ما هذا برأي. فقال له عبدالرحمن بن عوف: فما الرأي؟ ما الأرض والعلوج إلا مما أفاء الله عليهم. فقال عمر: ما هو إلا كما تقول. ولست أرى ذلك. والله لا يفتح بعدي بلد فيكون فيه أكبر نيل. بل عسى أن يكون كلا على المسلمين. فإذا قسمت أرض العراق بعلوجها، وأرض الشام بعلوجها، فما يسد به الثغور؟ وما يكون للذرية والأرامل بهذا البلد وبغيره من أرض الشام والعراق؟ فأكثروا على عمر رضي الله عنه وقالوا: أتقف ما أفاء الله علينا

فرمائی تھیں. ان کے بارے میں حضرت عمرؓ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا کہ ان کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے؟ بعض حضرات نے گفتگو کے دوران یہ رائے ظاہر کی کہ جن مسلمانوں نے وہ زمینیں فتح کی ہیں، وہ ان کے حق کے طور پر انہی میں تقسیم کر دی جائیں، اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: "جو مسلمان آئندہ آئیں گے (یعنی بعد میں پیدا ہوں گے) ان کا کیا ہو گا؟ وہ دیکھیں گے کہ تمام زمینیں اپنے مالکوں سمیت تقسیم ہو چکی ہیں. اور باپ دادوں سے میراث میں بٹتی آ رہی ہیں. اور لوگوں کے قبضے میں ہیں. یہ رائے تو مناسب نہیں معلوم ہوتی". حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا: "پھر آپ کی کیا رائے ہے؟ یہ زمینیں اور ان کے باشندے سب مال غنیمت ہی کا حصہ تو ہیں" (لہٰذا مال غنیمت کے عام قاعدے کے مطابق ہی ان کی تقسیم ہونی چاہئے) حضرت عمرؓ نے جواب دیا: "بات تو آپ کی صحیح ہے. (کہ یہ زمینیں مال غنیمت کا حصہ ہیں) لیکن میری رائے یہ نہیں ہے کہ انہیں مجاہدین میں تقسیم کیا جائے کیونکہ بخدا میرے بعد کوئی ایسا شہر فتح نہیں ہو گا

بأسيافنا على قوم لم يحضروا ولم يشهدوا، ولأبناء القوم وأبناء ابناءهم ولم يحضروا؟ فكان عمر لا يزيد على أن يقول: هذا رأى. قالو: فاستشر. قال: فاستشار المهاجرين الأولين. فاختلفوا. فأما عبدالرحمن بن عوف فكان رأيه أن تقسم لهم حقوقهم. ورأى عثمان وعلى وطلحة وابن عمر رضى الله عنهم رأى عمر. فأرسل إلى عشرة من الأنصار: خمسة من الأوس وخمسة من الخزرج. من كبراء هم وأشرافهم. فلما اجتمعوا حمد الله وأثنى عليه بما هو أهله. ثم قال: إنى لم أزعجكم إلا لأن تشتركوا فى أمانتى فيما حملت من أموركم. فإنى واحد كأحدكم. وأنتم اليوم تقرون بالحق. خالفنى من خالفنى. ووافقنى من وافقنى. ولست أريد أن تتبعوا هذا الذى هواى. معكم من الله كتاب ينطق بالحق. فوالله لئن كنت نطقت بأمر أريده ما أريده به إلا الحق. قالوا: قل نسمع يا أمير المؤمنين! قال:

جس سے کچھ زیادہ مال و جائیداد حاصل ہو، بلکہ بعید نہیں ہے کہ وہ نیا شہر مسلمانوں پر بوجھ ہی بنا رہے۔ اب اگر میں عراق اور شام کی زمینیں ان کے زمینداروں سمیت تقسیم کر دیں تو سرحدوں کی حفاظت کے لئے رقم کہاں سے آئے گی؟ شام اور عراق کے علاقوں میں جو یتیم اور بیوائیں موجود ہیں ان کی دیکھ بھال کیسے ہو گی؟"

بعض حاضرین نے حضرت عمرؓ کی اس رائے پر تنقید کی، اور کہا کہ: "کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری تلواروں کے ذریعہ جو مال غنیمت عطا فرمایا ہے وہ ایسے لوگوں کے لئے روک رکھیں جو اس معرکے میں نہ حاضر تھے، نہ موجود، اور

قد سمعتكم كلام هؤلاء القوم الذين زعموا أني أظلمهم حقوقهم، وإني أعوذ بالله أن أركب ظلما، لئن كنت ظلمتهم شيئا هو لهم، وأعطيته غيرهم لقد شقيت، ولكن رأيت أنه لم يبق شيئي يفتح بعد أرض كسرى، وقد غنمنا الله أموالهم وأرضهم وعلوجهم، فقسمت ما غنموا من أموال بين اهله وأخرجت الخمس فوجهته على وجهه وأنا في توجيهه، وقد رأيت أن أحبس الأرضين بعلوجها وأضع عليهم فيها الخراج وفي رقابهم الجزية يؤدونها فتكون فيئاً للمسلمين المقاتلة والذرية ولمن يأتي بعدهم. أرأيتم هذه الثغور لا بد لها من رجال يلزمونها، أرأيتم هذه المدن العظام كالشام والجزيرة والكوفة والبصرة ومصر، لا بدلها من أن تشحن بالجيوش، ولا إدرار العطاء عليهم، فمن أين يعطى هؤلاء إذا قسمت الأرضون والعلوج؟ فقالوا جميعا: الرأي رأيك، فنعم ما قلت وما رأيت، إن لم تشحن هذه الثغور وهذه المدن بالرجال وتجرى عليهم ما يتقوون به رجع أهل الكفر إلى مدنهم. فقال: قد بان لي الأمر، فمن رجل له جزالة وعقل يضع الأرض مواضعها، ويضع على العلوج ما يحتملون؟ فاجمعوا له على

ایسے لوگوں کی اولاد اور اولاد کی اولاد کے لئے روک رکھیں جو جنگ میں شامل نہیں تھے؟" اس کے جواب میں حضرت عمرؓ یہی فرماتے کہ "یہ ایک رائے ہے" لوگوں نے کہا "مزید مشورہ کر لیجئے"۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے مہاجرین اولین سے مشورہ فرمایا. ان کی رائیں بھی مختلف تھیں. حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی رائے یہی تھی کہ مجاہدین کے حقوق انہی میں تقسیم کر دیئے جائیں. لیکن حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، اور عبداللہ بن عمرؓ کی رائے حضرت عمرؓ کے موافق تھی. اب حضرت عمرؓ نے دس انصاری صحابہ کو بلوایا. جن میں سے پانچ قبیلہ اوس کے اور پانچ قبیلہ خزرج کے سردار اور معززین تھے. جب یہ حضرات جمع ہوئے تو حضرت عمرؓ نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

میں نے آپ حضرات کو صرف اس لئے زحمت دی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں کے معاملات کی جس امانت کا بوجھ مجھ پر ڈالا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس میں آپ بھی شریک ہوں. اس لئے کہ میں آپ لوگوں جیسا ہی ایک شخص ہوں. لہٰذا آپ حق بات کا برملا اظہار کریں. جو چاہے میری رائے کے خلاف رائے دے. اور جو چاہے میری موافقت کرے. میں یہ نہیں چاہتا کہ جو کچھ میری خواہش ہے آپ اس میں ضرور میری اتباع کریں. آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کتاب موجود ہے. جو حق بات ہی کہتی ہے. خدا کی قسم اگر میں اپنے کسی ارادے کا اظہار کروں گا. تو اس کا مقصد بھی حق تک پہنچنا ہی ہو گا. اس پر ان حضرات نے فرمایا: "امیر المومنین! آپ فرمایئے. ہم توجہ سے سنیں گے"

اب حضرت عمرؓ نے فرمایا: آپ نے ان لوگوں کی باتیں سنی ہوں گی جن کا خیال یہ ہے کہ میں (عراق اور شام کی زمینیں لوگوں میں تقسیم نہ کر کے) ان کے حقوق پر ظلم کر رہا ہوں. واقعہ یہ ہے کہ میں اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ

عثمان بن حنيف، وقالوا: تبعثه إلى أمر ذلك. فإن له بصراً و عقلاً و تجربةً. فأسرع إليه عمر فولاه مساحة أرض السواد. فأدت جباية سواد الكوفة قبل أن يموت عمر رضي الله عنه بعام مائة ألف درهم».

کسی ظلم کا ارتکاب کروں. اگر میں نے ان لوگوں سے کوئی ایسی چیز ظلماً" لی ہوتی جو ان کی ملکیت ہوتی. اور وہ میں ان سے چھین کر کسی اور کو دے دیتا تو یقیناً میں شقاوت کا مرتکب ہوتا. لیکن میں نے یہ سوچا ہے کہ کسری کی سر زمین کے بعد کوئی ایسی اہم سرزمین باقی نہیں رہی جو آئندہ فتح ہو. اللہ تعالیٰ نے آج ہمیں کسری کا مال و دولت. اس کی زمینیں اور اس کے لوگ مال غنیمت کے طور پر عطا فرما دیئے ہیں. جہاں تک مال و دولت کا تعلق ہے. جتنا مال غنیمت میں حاصل ہوا تھا. وہ میں نے اس کے مستحقین (یعنی مجاہدین) کے درمیان تقسیم کر دیا. اور اس کا پانچواں حصہ نکال کر بیت المال میں داخل کر دیا. اسے قاعدہ کے مطابق صرف کر دیا ہے. اور کچھ کرنے میں لگا ہوا ہوں. لیکن زمینوں کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ انہیں میں ان کے مالکوں کے ساتھ روک رکھوں. اور ان لوگوں کے ذمے ان زمینوں کا خراج عائد کر دوں. اور ان کی جانوں کے تحفظ کے لئے ان پر جزیہ عائد کروں. یہ لوگ جزیہ اور خراج ادا کرتے رہیں. اور یہ رقم مسلمانوں کے لئے فیئی (کفار سے حاصل شدہ مال جو رفاہ عام کے کاموں میں خرچ ہوتا ہے) بن جائے. اس مال سے مجاہدین بھی فائدہ اٹھائیں. ان کی اولاد بھی. اور آئندہ آنے والے مسلمان بھی۔

ذرا دیکھئے تو سہی ہماری ان سرحدوں کے لئے ایسے آدمی چاہیں جو ہمیشہ سرحدوں پر مقیم رہیں. اور ذرا ان بڑے بڑے شہروں، شام، جزیرہ، کوفہ، بصرہ اور مصر کو دیکھئے ان شہروں کو اس بات کی ضرورت ہے کہ انہیں فوج سے بھر دیا جائے. اور ان کو مسلسل تنخواہیں دی جائیں. اگر تمام زمینیں اور ان کے باشندے (غلاموں کے طور پر) تقسیم کر دیئے گئے تو اس فوج کو تنخواہیں کہاں سے دی جائیں گی؟

حضرت عمرؓ کی اس تشریح کے جواب میں سب نے اتفاق رائے سے کہا کہ آپ کی رائے صائب ہے. آپ نے اچھی بات سوچی ہے، اگر ان سرحدوں اور شہروں کو آدمیوں سے نہ بھر دیا گیا اور ان کی ایسی تنخواہیں جاری نہ کی گئیں جن سے انہیں قوت حاصل ہو تو کافر لوگ اپنے شہروں کو لوٹ جائیں گے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا: بات واضح ہو گئی ہے. اب کون ایسا شخص ہے جو عقل اور تجربہ رکھتا ہو. زمینوں کا صحیح انتظام کرے. اور زمینداروں پر اتنا خراج عائد کرے

جو ان کے لئے قابل برداشت ہو. سب لوگوں نے حضرت عثمان بن حنیفؓ کے نام پر اتفاق کیا. اور کہا کہ ان کو اس کام کے لئے بھیج دیجئے. ان کو اس معاملے میں عقل و بصیرت اور تجربہ حاصل ہے. حضرت عمرؓ جلدی سے ان کے پاس گئے. اور انہیں سواد (عراق) کی زمین کی پیمائش کا حکم دیا. چنانچہ حضرت عمرؓ کی وفات سے ایک سال پہلے کوفہ کی زمینوں سے خراج کی آمدنی دس کروڑ درہم حاصل ہوئی" (۱)

یہ ہے واقعہ کی پوری تفصیل. اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے عراق کی زمینیں کسی سے چھینی نہیں تھیں. نہ وہ مملوک اراضی کو چھیننا جائز سمجھتے تھے. اس کے بجائے صورت حال یہ تھی کہ جو علاقہ فوجی طاقت استعمال کر کے فتح کیا جائے. اس میں اسلامی حکومت کو شرعاً دو باتوں کا اختیار حاصل ہوتا ہے. ایک یہ کہ وہ مفتوحہ اراضی ان کے سابق غیر مسلم مالکوں سے لے کر مجاہدین میں تقسیم کر دے. اور دوسرے یہ کہ وہ انہیں غیر مسلم مالکوں کے استعمال میں رہنے دے. البتہ ان پر خراج اور جزیہ عائد کر دے. یہ دونوں صورتیں اسلامی حکومت کے لئے یکساں طور پر جائز ہوتی ہیں. لیکن عراق اور شام کی فتوحات سے پہلے عموماً پہلے طریقے پر عمل کیا جاتا رہا. اور مفتوحہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم کی جاتی رہیں. اس بنا پر بعض حضرات کا خیال یہ تھا کہ عراق اور شام کی اراضی میں بھی یہی طریقہ اختیار کرنا چاہئے. لیکن حضرت عمرؓ نے محسوس فرمایا کہ اس طرح عالم اسلام کی بڑھتی ہوئی ضروریات اور روز افزوں آبادی کے مسائل حل کرنے میں دشواری پیش آئے گی. اس لئے دوسری صورت اختیار فرمائی. جو یکساں طور پر جائز تھی. لیکن سابقہ طرز عمل کے خلاف ہونے کی بنا پر آپ نے اپنی رائے سے یہ فیصلہ نہیں کیا. بلکہ صحابہ کرام کے مشورے سے یہ اقدام کیا۔

۱۱۴۔ پھر فقہاء کرام کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف رہا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ زمینیں جب ان کے سابق غیر مسلم مالکوں کی تحویل میں چھوڑ دیں تو کس حیثیت سے چھوڑیں؟ کیا ان کے مالکانہ حقوق برقرار رکھے؟ یا ان اراضی کو تمام مسلمانوں کے لئے وقف عام قرار دیا؟ بعض فقہاء کرام. مثلاً امام مالک اور امام احمد رحمتہ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے وہ زمینیں تمام مسلمانوں کے لئے وقف عام قرار دے دی تھیں. سابق مالکوں کو کاشتکار کے طور پر باقی رکھا گیا تھا. اور جو خراج وصول کیا جاتا تھا وہ زمینوں کا کرایہ تھا جو بیت المال میں جمع ہو کر مسلمانوں کی مصالح پر خرچ ہوتا تھا. چنانچہ ان مالکوں کے لئے یہ جائز نہیں تھا کہ وہ اپنی زمینیں فروخت کر

(۱) کتاب الخراج لابی یوسف. ص ۲۴ تا ۲۶۔

دیں، کیونکہ وہ مالک نہ تھے، اور وقف کی بیع جائز نہیں ہوتی۔ (۱)

۱۱۵۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ یہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے سابق مسلم مالکوں کی ملکیت برقرار رکھی تھی، ان کو ان اراضی پر مکمل مالکانہ حقوق حاصل تھے، وہ ان زمینوں کی خرید و فروخت کر سکتے تھے، البتہ ان زمینوں پر سالانہ خراج عائد کر دیا گیا تھا، جو بیت المال میں داخل ہو کر مسلمانوں کی ضروریات اور مصلحتوں کے مطابق خرچ ہوتا تھا، حضرت عمرؓ کے مذکورہ بالا واقعے میں جہاں زمینوں کے لئے "وقف" یا "حبس" کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کا مقصد ان کے نزدیک یہی ہے کہ ان زمینوں سے جو خراج حاصل ہو، وہ تمام مسلمانوں کی ضروریات پر خرچ ہو گا، یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اراضی اصطلاحی طور پر وقف ہو جائیں گی، چنانچہ علامہ ابن حزمؒ امام ابو حنیفہؒ کا مذہب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

«قال أبوحنيفة: الإمام مخير، إن شاء قسمها، و إن شاء أوقفها فإن أوقفها فهي ملك الكفار الذين كانت عليهم».

> امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ امام کو اختیار ہے، چاہے تو اراضی تقسیم کر دے، اور چاہے توانہیں وقف کر دے، پھر اگر وقف کرے گا تو وہ انہی کافروں کی ملکیت سمجھی جائے گی، جو فتح سے پہلے ان کے مالک تھے" (۱)

بلکہ علامہ ابن قیمؒ تو امام ابو حنیفہؒ کے علاوہ دوسرے ائمہ، جو اراضی عراق کے وقف ہونے کے قائل ہیں، ان کے بارے میں بھی یہی نقل کرتے ہیں کہ ان کی مراد بھی یہاں اصطلاحی "وقف" نہیں ہے، وہ فرماتے ہیں:

«فعلم أن الأرض لا تدخل في الغنائم، و الإمام يخير فيها بحسب المصلحة، وقد قسم رسول الله ﷺ، وترك عمر، ولم يقسم، بل أقرها على حالها، وضرب عليها خراجا مستمرا في رقبتها يكون للمقاتلة، فهذا معنى و قفها، ليس معناه الوقف الذي يمنع عن نقل الملك في الرقبة بل يجوز بيع هذه

---

(۱) المحلی لابن حزم، ص ۳۴۲ ج ۷۔

الأرض ، كما هو عمل الأمة ۔ وقد أجمعوا على أنها تورث ۔ والوقف لا يورث"

اس سے معلوم ہوا کہ زمین (اس) مال غنیمت میں داخل نہیں ہے، (جس کی تقسیم ضروری ہے) بلکہ امام کو اس بارے میں اختیار ہے کہ مصلحت کے مطابق عمل کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین تقسیم فرمائی تھی، حضرت عمرؓ نے چھوڑ دیا، اور تقسیم نہیں کیا، بلکہ اسے حسب سابق اپنے حال پر چھوڑ دیا، اور اس پر مسلسل خراج عائد کیا، جو مجاہدین پر خرچ ہوتا تھا، پس اراضی کے وقف ہونے کے یہ معنی ہیں، یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ ایسا وقف ہیں جو ملکیت کے انتقال سے مانع ہو، بلکہ ایسی زمینوں کی بیع جائز ہے، جیسا کہ امت کا عمل چلا آتا ہے، اور فقہاء کا اس پر اتفاق ہے، کہ ایسی خراجی زمین میں میراث بھی جاری ہوتی ہے، (۱) حالانکہ وقف میں میراث جاری نہیں ہوتی" (۲)

۱۱۶۔ اس سے واضح ہو گیا کہ امام ابو حنیفہؒ اور علامہ ابن قیمؒ وغیرہ کے نزدیک تو حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کا حاصل یہ تھا کہ پچھلے غیر مسلم مالکوں کی ملکیت زمینوں پر برقرار رکھی گئی تھی، (البتہ خراج عائد کر دیا گیا تھا) اگر ان کی تشریح کو اختیار کیا جائے تب تو اس فیصلے کو کسی بھی حال میں نیشنلائزیشن سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ ان اراضی کو حضرت عمرؓ نے وقف کر دیا تھا، لیکن یہ وقف عام اوقاف سے مختلف تھا، لہٰذا اس میں میراث بھی جاری ہوتی تھی، البتہ بعض فقہاء اس کو مکمل وقف قرار دیتے ہیں۔

۱۱۷۔ اگر بالفرض ان فقہاء کا موقف بھی اختیار کیا جائے جو ان اراضی کو "مکمل وقف" قرار دیتے ہیں، تب بھی حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کو نیشنلائزیشن سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ نیشنلائزیشن کے معنی یہ ہیں کہ ان زمینوں پر حکومت کو مکمل اختیار حاصل ہو جائے، اور وہ ان کی مالک بن کر اگر چاہے تو کسی وقت انہیں فروخت بھی کر سکے، حالانکہ "وقف" قرار دینے کے بعد

---

(۱) علامہ ابن قیمؒ کا یہ فرمانا محل نظر ہے کہ اس قسم کی خراجی زمین میں میراث جاری ہونے پر تمام فقہاء متفق ہیں، حقیقت یہ ہے کہ بعض فقہاء کے نزدیک ان زمینوں میں میراث بھی جاری نہیں ہوتی (ملاحظہ ہو دسوقی علی شرح مختصر خلیل ص۱۸۹ ج۲)

(۲) زاد المعاد لابن قیم۔ ص۶۹ ج۲، مطبوعہ مصطفی البابی، ۱۳۴۷ھ بحث فتح مکہ۔

حکومت کا یہ اختیار ختم ہو جاتا ہے. کیونکہ وقف کی بیع نہیں ہو سکتی (جس کی بحث آگے آنے والی ہے). اور حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کی یہ تشریح فقہاء اور محدثین میں سے کسی نے نہیں کی کہ انہوں نے عراق کی زمینوں کو سرکاری زمینیں قرار دے دیا تھا. اوپر حضرت عمرؓ کے اس واقعے کی جو تفصیل امام ابو یوسفؒ کی کتاب الخراج سے نقل کی گئی ہے. اس میں بھی کہیں اس مفہوم کی گنجائش نہیں ہے. لہٰذا حضرت عمرؓ نے عراق کی زمینوں کے بارے میں جو فیصلہ کیا. اسے کسی بھی صورت میں نیشنلائزیشن قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۱۱۸۔ مذکورہ بالا بحث سے مندرجہ ذیل امور واضح ہوتے ہیں:

(۱) عراق کی زمینوں کو حضرت عمرؓ نے نیشنلائزیشن نہیں کیا تھا. بلکہ پچھلے مالکوں کی ملکیت باقی رکھ کر ان پر خراج عائد کر دیا تھا. اور بعض فقہاء کہتے ہیں کہ انہیں وقف کر دیا تھا۔

(۲) یہ زمینیں کسی جائز مالک سے چھینی نہیں گئیں. نہ ان کو بلامعاوضہ ان سے لیا گیا، بلکہ یہ مفتوحہ زمینیں تھیں. ان کے بارے میں اسلامی حکومت کو وہ اختیارات حاصل ہیں جو اوپر بیان کئے گئے۔

(۳) حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ کرتے وقت صاف لفظوں میں فرمایا کہ ''اگر میں نے ان لوگوں سے کوئی ایسی چیز ظلماً لی ہوتی جو ان کی ملکیت ہوتی. اور وہ میں ان سے چھین کر کسی اور کو دے دیتا تو میں یقیناً شقاوت کا مرتکب ہوتا.'' جس سے صاف واضح ہے کہ کسی مالک کو اس کی ملکیت سے اس کی مرضی کے بغیر بلامعاوضہ محروم کرنا ان کے نزدیک ہرگز جائز نہیں تھا۔

(۴) بجیلہ کے لوگوں کو حضرت فاروق اعظمؓ نے اس فیصلے سے پہلے زمینیں مالکانہ حقوق کے ساتھ دے دی تھیں. لیکن جب عراق کی تمام زمینوں میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے ان سے یہ اراضی واپس لینے کی رائے ہوئی تو آپ نے ان کو بلا کر پہلے راضی کیا، پھر ان کا مطلوبہ معاوضہ ادا کر کے وہ زمینیں واپس لیں۔

ان چار نکات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے عراق کی اراضی کے بارے میں جو فیصلہ فرمایا. اسے نہ صرف یہ کہ بلامعاوضہ زمینیں ضبط کر لینے کے جواز سے کوئی تعلق نہیں. بلکہ وہ صراحتاً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کسی حکومت کے لئے کسی جائز مالک سے اس کی مملوکہ زمین بلامعاوضہ لینا ہرگز جائز نہیں ہے۔

گورنروں کے ذاتی مال کی ضبطی:

۱۱۹۔ ہمارے دور کے بعض حضرات نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک اوعمل سے لوگوں کی املاک بلامعاوضہ لینے پر استدلال کیا ہے، اور وہ یہ کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے بعض گورنروں مثلاً حضرت عمرو بن عاصؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت حارثؓ کی ذاتی املاک میں سے آدھا حصہ ضبط کر کے بیت المال میں داخل کر لیا تھا، ان حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت مصالح عامہ کے تحت لوگوں کی املاک پر بلامعاوضہ قبضہ کر سکتی ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دلیل بھی انتہائی کمزور ہے، اور اس کا زیر بحث مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ مال کی یہ ضبطی اس بنیاد پر نہیں تھی کہ یہ مال چونکہ تم لوگوں کی ضرورت سے زائد ہے، اس لئے ضبط کیا جارہا ہے، بلکہ اس بنیاد پر تھی کہ حضرت عمرؓ کے خیال میں یہ مال ان گورنروں نے اپنی حدود اختیار سے تجاوز کر کے حاصل کیا تھا، چنانچہ اس واقعہ میں یہ تفصیل موجود ہے کہ حضرت عمرؓ نے پہلے ان سے پوچھا کہ یہ مال تمہارے پاس کہاں سے آیا؟ انہوں نے جواب میں مختلف وجوہ بیان کیں، جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ ہم تنخواہ کی بچت سے ذاتی تجارت بھی کرتے تھے، حضرت عمرؓ نے یہ عذر قبول نہیں کیا، اور فرمایا کہ "آپ لوگوں کو تجارت کے لئے وہاں نہیں بھیجا گیا تھا"۔ (۱)

غالباً حضرت عمرؓ کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد تھا کہ:

«من استعملنا علی عمل ، فرزقنا رزقا ، فما أخذ بعد ذلك فهو غلول».

ہم نے جس شخص کو کوئی کام سونپا ہو، اور اس پر اسے تنخواہ دی ہو، تو اس کے بعد وہ جو کچھ حاصل کرے وہ خیانت ہے۔ (۲)

اور اس ارشاد کی روشنی میں حضرت عمرؓ یہ سمجھتے تھے کہ ان گورنروں کے لئے تنخواہ کے علاوہ اپنے لئے کسب معاش کا کوئی اور راستہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے، لہٰذا جو مال انہوں نے اس ذریعہ سے کمایا ہے، وہ ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے کی بنا پر قابل ضبطی ہے۔

۱۲۰۔ یہ اصول متعدد فقہاء کرام نے بیان فرمایا کہ سرکاری ملازمین کی دولت اگر ان کے ظاہری وسائل سے زیادہ ہو تو حکومت اسے ناجائز ہونے کی بنا پر ضبط کر سکتی ہے، فقہاء حنفی کی مشہور

---

(۱) العقد الفرید، ص ۴۴ و ۴۵ ج ۱۔ طبع بیروت ۱۴۰۴ھ۔

(۲) سنن ابی داؤد، ص ۱۲۱ ج ۲۔

کتاب "الدر المختار" میں ہے:

«إن مصادرة السلطان لأرباب الأموال لا تجوز إلالعمال بيت المال مستدلاً بأن عمر رضي الله عنه صادر أبا هريرة».

سربراہ حکومت کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ مالکوں سے ان کے اموال بلامعاوضہ ضبط کر لے۔ البتہ بیت المال کے کارندوں کے مال کو اس طرح ضبط کرنا جائز ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوہریرہ کے مال کو ضبط کیا تھا۔ (۱)

اسی مسئلہ کو علامہ ابن فرحون مالکیؒ نے علامہ ابن حبیب کے حوالے سے زیادہ تفصیل کے ساتھ تحریر فرمایا ہے۔ وہ حضرت عمرؓ کے مذکورہ فعل ہی سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

«إن للإمام أن يأخذ من قضاته و عماله ما وجد في أيديهم زائداً على ما ارتزقوه من بيت المال و أن يحصي ما عند القاضي حين ولايته ، و يأخذ منه ما اكتسبه زائداً على رزقه».

امام (سربراہ حکومت) کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے قاضیوں اور کارندوں کے قبضے میں جو مال ایسا پائے جو بیت المال سے ان کی حاصل کی ہوئی تنخواہ سے زائد ہو، اسے ضبط کر لے۔ اسے چاہئے کہ قاضی کے تقرر کے وقت اس کی املاک کو شمار کرے۔ اس کے بعد تنخواہ کے علاوہ جو مال زائد نظر آئے وہ اس سے لے لے۔ (۲)

خلاصہ یہ کہ سرکاری ملازمین کی بدعنوانیوں کے سدباب کے لئے یہ طریق کار اختیار کرنا جائز ہے اس صورت میں جو مال ضبط کیا جائے گا، وہ اس کے ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے کی بنا پر کیا جائے گا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اسی بنیاد پر ان حضرات کا مال ضبط کیا۔ ـــــ ہم پیچھے بار بار لکھ چکے ہیں کہ اگر کسی شخص کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے کوئی جائیداد ناجائز طریقے سے حاصل کی ہے، تو اسے اصل مالک کو لوٹانا۔ اور مالک معلوم نہ ہونے کی صورت میں اسے بحق سرکار ضبط کر لینا جائز ہے۔ لیکن یہاں بحث اس صورت کے بارے میں ہو رہی ہے جب یہ بات طے شدہ ہو کہ مالک نے ملکیت جائز طریقے پر حاصل کی ہے۔ لہٰذا حضرت عمر کے مذکورہ بالا عمل کا

---

(۱) الدر المختار۔ ص ۳۱۷ ج ۴۔ کتاب الکفالۃ۔

(۲) تبصرۃ الحکام لابن فرحون۔ ص ۱۵۰ و ۱۵۱۔ ج ۲۔ طبع بیروت۔ قسم ۳۔ فصل ۹۔

ہمارے زیر بحث مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱۲۱۔ مذکورہ بالا تشریح سے واضح ہوگیا کہ حکومت کے لئے کسی شخص کی جائز ملکیت کو بلامعاوضہ اس سے لینا، خواہ مصالح عامہ کی غرض سے ہو، قرآن و سنت کے احکام کی رو سے جائز نہیں ہے، اور اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کے جتنے اقدامات سے مخالف استدلال کیا گیا ہے، ان میں سے کسی بھی اقدام سے بلامعاوضہ لے لینے کا جواز ثابت نہیں ہوتا، بلکہ حضرت عمرؓ نے (عراق کی زمینوں کے قصے میں) ایسے اقدام کو "ظلم" اور "شقاوت" سے تعبیر فرمایا ہے۔

معاوضہ دے کر املاک کی جبری وصولی

۱۲۲۔ اب میں مسئلے کے دوسرے حصے کی طرف آتا ہوں، یعنی "کیا کسی شخص کو جبراً معاوضہ دے کر اس سے اس کی کوئی ملکیت حاصل کی جا سکتی ہے؟"

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ معاوضہ دے کر زبردستی کسی سے اس کی ملکیت لے لینا درحقیقت ایک جبری بیع ہے، اور قرآن و سنت کے ارشادات کی روشنی میں شریعت کا اصل حکم یہی ہے کہ بیع فریقین کی باہمی رضامندی سے ہونی چاہئے، اور کوئی فریق دوسرے کو اس پر مجبور نہیں کر سکتا، اس سلسلے میں قرآن و سنت کے چند ارشادات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) سورۂ نساء میں اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے:

«یا أیہا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارة عن تراض منکم».

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر مت کھاؤ، الا یہ کہ وہ کوئی تجارت ہو، جو تمہاری باہمی رضامندی سے ہوئی ہو۔ (۱)

یہ آیت دوسرے کا مال لینے کے بارے میں یہ واضح حکم دے رہی ہے کہ اس کے جائز ہونے کے لئے دو شرطیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ وہ تجارت (یعنی بیع) کے ذریعہ ہو، اور دوسرے یہ کہ یہ بیع باہمی رضامندی سے ہوئی ہو، اور کسی بھی فریق نے دوسرے کو اس پر مجبور نہ کیا ہو۔

(۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

---

(۱) سورۃ نساء ۴، ۲۹۔

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب النہی عن بیع المضطر، حدیث نمبر ۳۳۸۲۔

(۲) جامع الترمذی، کتاب البیوع، باب نمبر ۲۶، حدیث نمبر ۱۲۴۸ء

«قد نہی رسول اللہ ﷺ عن بیع المضطر».

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیع سے منع فرمایا جس میں کسی شخص کو بیع پر مجبور کیا گیا ہو۔ (۱)

(۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لا یتفرقن عن بیع إلا عن تراض».

کوئی شخص بیع کر کے اس وقت تک نہ جائے جب تک باہمی رضامندی نہ ہو چکی ہو۔ (۲)

(۴) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«إنما البیع عن تراض»

بیع تو باہمی رضامندی ہی سے ہوتی ہے۔ (۳)

(۵) ابو حرہ الرقاشی اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منه»

کسی مسلمان شخص کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں۔ (۴)

(۶) حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لا یحل لمسلم أن یأخذ عصا أخیه بغیر طیب نفس منه».

کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے کہ اپنے بھائی کی لاٹھی بھی اس کی خوش دلی کے بغیر لے۔ (۱)

(۷) جبری بیع کے ناجائز ہونے کے سلسلے میں وہ واقعہ بطور خاص قابل ذکر ہے جس میں حضرت عمرؓ اور حضرت عباس بن عبد المطلبؓ کے درمیان مسجد نبوی کی توسیع کے سلسلے میں

---

(۳) سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، باب نمبر ۱۸، حدیث نمبر ۲۱۸۵۔

(۴) مجمع الزوائد، ص ۱۷۲ ج ۴، بحوالہ مسند ابو یعلی، و مشکوٰۃ المصابیح، ص ۲۵۵ ج ۱، بحوالہ شعب الایمان للبیہقی

(۱) موارد الظمآن للہیثمی، ص ۲۸۳، المطبوعۃ السلفیۃ الروضۃ۔

اختلاف رائے پیش آیا تھا. اس کا مفصل واقعہ امام بیہقیؒ نے روایت کیا ہے.

حضرت (۲) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے مسجد نبوی میں توسیع کا ارادہ فرمایا تو جس طرف آپ توسیع کرنا چاہتے تھے. وہاں حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ کا گھر بیچ میں آ گیا. حضرت عمرؓ نے اسے مسجد میں داخل کرنے کے لئے حضرت عباسؓ کو معاوضہ دینا چاہا. حضرت عباسؓ نے انکار کیا. اور کہا کہ یہ زمین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے عطا فرمائی تھی. دونوں میں اختلاف ہوا تو دونوں نے حضرت ابی بن کعبؓ کو ثالث مقرر کیا. اور حضرت ابی بن کعبؓ کے گھر پہنچے. حضرت ابی "سید المسلمین" (مسلمانوں کے سردار) کے لقب سے مشہور تھے. انہوں نے دونوں کو تکیہ پیش کیا. یہ حضرات ان کے سامنے بیٹھ گئے. حضرت عمرؓ نے ان سے اپنے ارادے کا اظہار فرمایا. اور دوسری طرف حضرت عباسؓ نے یہ عذر پیش کیا کہ یہ زمین مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی تھی۔

حضرت ابی بن کعبؓ نے دونوں کی بات سننے کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے اور اپنے نبی داؤد علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ اللہ کے لئے ایک گھر بنائیں. حضرت داؤد نے پوچھا "پروردگار" یہ گھر کہاں ہو؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس جگہ جہاں تم دیکھ رہے ہو کہ ایک فرشتہ تلوار سونتے کھڑا ہے" حضرت داؤد علیہ السلام نے فرشتے کو صخرہ کے مقام پر دیکھا. لیکن وہاں اس وقت بنی اسرائیل کے ایک لڑکے کا گھر تھا. حضرت داؤد علیہ السلام اس کے پاس گئے. اور اس سے کہا کہ "کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ یہ گھر مجھ سے میری رضامندی کے بغیر لے لیں؟ حضرت داؤدؑ نے فرمایا: "نہیں" اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت داؤد پر وحی آئی کہ

---

(۱) موارد الظمآن للهيثمي ، ص ۲۸۳ ، المطبوعة السلفية الروضة

(۲) عن أبي هريرة قال : لما أراد عمر بن الخطاب رضي الله عنه أن يزيد في مسجد رسول الله ﷺ وقعت زيادته على دار العباس بن عبدالمطلب رضي الله عنه . فأراد عمر أن يدخلها في مسجد رسول الله ﷺ و يعوضه منها . فأبى . وقال : قطيعة رسول الله ﷺ ، واختلفا ، فجعلا بينهما أبي بن كعب رضي الله عنه ، فأتياه في منزله . وكان يسمى «سيد المرسلين» ، فأمرلهما بوسادة . فألقيت لهما . فجلسا عليها بين يديه ، فذكر عمر ما أراد . وذكر

"میں نے تمہارے ہاتھ زمین کے خزانے دے دیئے ہیں. لہٰذا اسے راضی کرو." حضرت داوٗد پھر اسکے پاس تشریف لائے. اور اس سے فرمایا کہ "مجھے یہ حکم ملا ہے کہ تمہیں راضی کروں. لہٰذا میں اس زمین کے بدلے تمہیں ایک قنطار سونا پیش کرتا ہوں" اس نوجوان نے کہا. اے داوٗد. میں نے قبول کیا. لیکن یہ بتایئے کہ میری زمین بہتر ہے یا یہ قنطار؟ حضرت داوٗدؑ نے فرمایا کہ "تمہاری زمین بہتر ہے" نوجوان نے کہا کہ "پھر مجھے راضی کیجئے" حضرت داوٗد علیہ السلام نے فرمایا کہ "پھر تمہیں تین قنطار دیتا ہوں" اس کے بعد وہ نوجوان اپنے مطالبے میں سختی کرتا گیا. یہاں تک کہ نو قنطار پر راضی ہوا۔

جب حضرت ابی بن کعبؓ یہ واقعہ سنا چکے تو حضرت عباسؓ نے فرمایا. "کیا آپ نے میرے حق میں فیصلہ نہیں کر دیا؟ حضرت ابی کعبؓ نے فرمایا. "بیشک" حضرت عباسؓ نے یہ سن کر کہا کہ. اب میں آپ لوگوں کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنا وہ مکان کسی معاوضے کے بغیر فی سبیل اللہ مسجد کو دیدیا"

یہی واقعہ طبقات ابن سعد میں بھی مروی ہے. اور اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ شروع میں جب حضرت داوٗد علیہ السلام نے اس نوجوان کو زمین بیچنے کی ترغیب دی تو اس نے انکار کر دیا تھا. اس پر

العباس قطيعة رسول الله ﷺ . فقال أبي : إن الله عز و جل أمر عبده ونبيه داؤد عليه أن يبني له بيتاً . قال : أي رب ! و أين هذا البيت؟ قال : حيث ترى الملك شاهراً سيفه . فرآه على الصخرة . و إذا ما هناك يومئذ اندر لغلام من بني إسرائيل . فأتاه داؤد . فقال : إني قد أمرت أن أبني هذا المكان بيتا لله عز و جل . فقال له الفتى : آلله أمرك أن تأخذ مني بغير رضاي؟ قال : لا . فأوحى الله إلى داؤد عليه السلام : «إني قد جعلت في يدك خزائن الأرض فأرضه» فأتاه داؤد . فقال : إني قد أمرت برضاك فلك بها قنطار من ذهب . قال : قد قبلت يا داؤد ! و هي خير أم القنطار؟ قال : بل هي خير . قال : فأرضني . قال : فلك بها ثلاث قناطير . قال : فلم يزل يشدد على داؤد حتى رضي منه بتسع قناطير

انہوں نے اس سے زبردستی لینے کا ارادہ فرمایا تھا، لیکن وحی نازل ہوئی کہ "اے داؤد! میں نے تم کو اپنا گھر تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا، جس میں میرا ذکر کیا جائے، لیکن تم میرے گھر میں غضب کو داخل کرنا چاہتے ہو، حالانکہ غضب میری شان نہیں، تمہاری سزا یہ ہے کہ تم اب اس گھر کو نہیں بناؤ گے۔ حضرت داؤد نے فرمایا کہ "پھر میری اولاد میں سے کسی کو توفیق دے دی جائے۔" اللہ تعالیٰ نے فرمایا" ہاں! تمہاری اولاد بنائے گی" چنانچہ بعد میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس تعمیر کیا۔

ابن سعد کی روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ نے یہ بھی ذکر کیا تھا کہ انہوں نے یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا، حضرت عمرؓ مزید توثیق کے لئے انہیں مسجد نبوی میں لے آئے، جہاں اور بھی صحابہ کرام موجود تھے، اور ان سے فرمایا کہ اگر کسی اور نے بھی حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ واقعہ سنا ہو تو بتائے، اس کے جواب میں حضرت ابوذر غفاریؓ نے فرمایا کہ میں نے بھی یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، ان کے بعد دو مزید صحابہ نے بھی اعلان کیا کہ انہوں نے بھی یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا۔ (۱)

۱۲۳۔ قرآن وسنت کے ان ارشادات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شرعاً وہی بیع معتبر اور قابل نفاذ ہے جو فریقین کی رضامندی سے وجود میں آئی ہو، کسی شخص کو زبردستی اس کی مرضی کے خلاف بیع پر مجبور کر کے اس سے کوئی چیز خریدنا جائز نہیں، اور ایسی بیع شرعاً معتبر بھی نہیں ہوتی، چنانچہ فقہاء کرام نے ایسی بیع کو فاسد قرار دیا ہے، علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

«بيع المضطر و شرائوه فاسد»

جس شخص کو اس کی رضامندی کے بغیر معاملے پر مجبور کیا گیا ہو اس کی بیع و شراء فاسد ہے۔

بلکہ اس کے تحت علامہ ابن عابدین شامیؒ نے اس صورت کو بھی شامل کیا ہے جب کوئی شخص اپنے ذاتی حالات کے تحت کوئی چیز بیچنے پر مجبور ہو گیا ہو، اور خریدار اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے

فقال العباس: أليس قد قضيت لي بها؟ وصارت لي؟ قال: بلى، قال: فإني أشهدك أني قد جعلتها له»

(السنن الكبرى للبيهقي ص ١٦٨ ج ٦)

(۱) طبقات ابن سعد، ص ۲۱ و ۲۲ ج ۴، ترجمۃ عباس بن عبدالمطلب۔

ہوئے قیمت اتنی کم لگائے جو بازاری نرخ کے لحاظ سے بہت کم ہو. اس کو بھی انہوں نے "بیع المضطر" قرار دیا ہے۔ (۱)

بہرصورت. اسلام کا اصل حکم تو یہی ہے کہ کسی شخص کو بیع پر مجبور کرنا نہ کسی فرد کے لئے جائز ہے. نہ حکومت کے لئے۔

۱۲۴۔ البتہ بعض ناگزیر حالات میں ایسی استثنائی صورتیں نکل سکتی ہیں جن میں کسی شدید ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جبری بیع کا طریقہ اختیار کئے بغیر چارہ نہ ہو. صرف ایسے مواقع پر شریعت نے جبری بیع کی اجازت دی ہے. اور اس اجازت کا ماخذ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

جامع ترمذی میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

«قلت: یا رسول اللہ! إنا نمرّ بقوم فلاهم یضیفونا ولا هم یئودون مالنا علیهم من الحق، ولا نحن نأخذ منهم، فقال رسول اللہ ﷺ: إن أبوا إلا أن تأخذوا کرها فخذوا»

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم کسی قوم کے پاس سے گزرتے ہیں. تو نہ وہ ہماری مہمان داری کرتے ہیں. اور نہ وہ حقوق ادا کرتے ہیں جو ہمارے ان پر واجب ہیں. اور نہ ہم ان سے لیتے ہیں اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ زبردستی کئے بغیر انکار ہی کرتے رہیں تو ان سے زبردستی لے لو۔

امام ترمذی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

«إنما معنی هذا الحدیث أنهم کانوا یخرجون فی الغزو، فیمرون بقوم، ولا یجدون من الطعام ما یشترون بالثمن، فقال النبی ﷺ: إن أبوا أن یبیعوا إلا أن تأخذوا کرهاً فخذوا، هکذا مروی فی بعض الحدیث مفسراً»

اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ صحابہ کرام جہاد کے لئے جایا کرتے تھے. وہ کسی قوم کے پاس سے گزرتے تھے. اور کوئی ایسا کھانا موجود نہیں ہوتا تھا جسے وہ قیمت دے کر خرید سکیں. اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ لوگ زبردستی

---

(۱) رد المحتار. ص ۱۱۸ ج ۴۔

کئے بغیر بیچنے سے انکار کریں تو ان سے زبردستی لے لو، بعض احادیث میں اس واقعے کی یہی تفصیل مروی ہے۔ (۱)

اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

«الاجازة لهم أن يأخذوا بالقيمة كرهاً، و توجيه الحديث أن الكفار كانوا إذا نزل المسلمون أغلقوا دكاكينهم، وتركوا المبايعة إضراراً بالمسلمين، فلما رأى المسلمون ذلك شكوا إلى رسول الله ﷺ أن هؤلاء لا يضيفوننا، ولا شكاية فى ذلك لأن الضيافة تبرع و إكرام، وليس حقاً ثابتاً، إنما الشكوى أنهم لا يؤدون إلينا بحق و هو الشراء والإيتاء بالقيمة. فكأنهم ذكروا فى كلامهم الطرق الثلاث المحتملة للأخذ، وهو الأخذ بالقيمة، أو الأخذ بغير قيمة جبرا منا، أو إكراماً منهم، أما الأول، فلأنهم لا يبايعوننا، و أما الثانى فلأنك يا رسول الله منعتنا أن نأخذ مال الغير بغير حق، وهو المعنى بقولهم «ولا نحن نأخذ منهم» و أما الثالث فلأنهم لا يضيفوننا»

اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قیمت دے کر زبردستی لینے کی اجازت دی ہے، اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب مسلمان کسی بستی کے پاس پڑاؤ ڈالتے ہیں تو یہ غیر مسلم اپنی دکانیں بند کر دیتے، اور بیچنا چھوڑ دیتے، تاکہ مسلمانوں کو تکلیف ہو، جب مسلمانوں نے یہ دیکھا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ یہ لوگ ہماری مہمانی نہیں کرتے، اس میں تو کوئی شکایت کی بات نہ تھی، کیونکہ مہمانی تو رضاکارانہ ہوتی ہے، اور اکرام ہوتا ہے، وہ کوئی واجب الادا حق نہیں ہے، لیکن شکایت یہ تھی کہ وہ ہمیں جائز طریقے پر خریدنے بھی نہیں دیتے، اور قیمت لے کر بھی کھانا دینے سے انکار کرتے ہیں، گویا انہوں نے تینوں ممکن طریقوں کا ذکر کیا، ایک یہ کہ ان سے قیمت دے کر لیا جائے، دوسرے یہ کہ

(۱) جامع الترمذی، کتاب السیر، باب ۳۲، حدیث نمبر ۱۵۸۹، ص ۱۴۸ ج ۴ مطبوعہ بیروت۔

ہم بغیر قیمت کے ان سے جبراً وصول کر لیں، اور تیسرے یہ کہ وہ ہمارا اکرام کرتے ہوئے ہماری مہمانی کریں، پہلی صورت اس لئے ممکن نہیں کہ وہ ہم سے بیع کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ دوسری اس لئے ممکن نہیں کہ یارسول اللہ! آپ نے ہمیں دوسرے کا مال ناحق طور پر لینے سے منع فرمایا ہے، اور انہوں نے جو کہا کہ "نہ ہم ان سے لیتے ہیں" اس سے یہی مراد ہے، اور تیسری صورت اس لئے ممکن نہیں کہ وہ ہماری مہمانی نہیں کرتے" (۱)

چنانچہ قاضی ابو بکر ابن عربیؒ اس حدیث سے استنباط کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وکذالك إذا نزلت بالناس مخمصة، و عند بعضهم طعام، لزمهم البيع منهم فإن أبوا أجبروا عليه»

اسی طرح جب لوگوں پر بھوک کی حالت مسلط ہو، اور بعض لوگوں کے پاس کھانا موجود ہو تو ان پر اس کھانے کی بیع لازم ہو جاتی ہے، اگر وہ انکار کریں تو انہیں اس پر مجبور کیا جائے گا" (۱)

جبری بیع کے سلسلے میں مجھے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی اور ارشاد یا عمل اس کے سوا نہیں مل سکا، تاہم اس سے اتنی بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ شدید ضرورت کے مواقع پر، جیسا کہ جنگ وغیرہ کے غیر معمولی حالات میں ہوتی ہے، آپ نے جبری خریداری کی اجازت عطا فرمائی۔

۱۲۵۔ خلفائے راشدین کے عہد مبارک میں ایک واقعہ مسجد حرام کی توسیع کے سلسلے میں ملتا ہے، یہ واقعہ امام ابو الولید ازرقیؒ نے مندرجہ الفاظ میں روایت کیا ہے:

عن ابن جريج، قال: كان المسجد الحرام ليس عليه جدران محاطة، إنما كانت الدور محدقة به من كل جانب، غير أن بين الدور أبواباً يدخل منها الناس من كل نواحيه فضاق على الناس، فاشترى عمر بن الخطاب رضي الله عنه دوراً فهدمها، وهدم على من قرب من المسجد، وأبى بعضهم أن يأخذ الثمن و تمنع من البيع، فوضعت أثمانا في خزانة الكعبة حتى أخذوها

---

(۱) الکوکب الدری، ص۴۱۹ ج۱، مطبوعہ سہارنپور، انڈیا۔

(۱) عارضۃ الاحوذی، ص۸۷ ج۷ مطبوعہ مصر، ۱۳۵ھ

بعد، ثم أحاط عليه جدارا قصيرا وقال لهم عمر: إنما نزلتم على الكعبة، فهو فناءها ولم تنزل الكعبة عليكم، ثم كثر الناس فى زمن عثمان بن عفان رضى الله عنه، فوسع المسجد واشترى من قوم وأبى آخرون أن يبيعوا، فهدم عليهم فصيحوا به، فدعاهم، فقال: إنما جرأكم على حلمى عنكم، فقد فعل بكم عمر هذا، فلم يصح به أحد، فاحتذيت على مثاله، فصيحتم بى، ثم أمربهم إلى الحبس، حتى كلمه فيهم عبدالله بن خالد بن أسيد فتركهم»

حضرت ابن جریج فرماتے ہیں کہ: پہلے مسجد حرام کے گرد کوئی چار دیواری نہیں تھی. بلکہ اسے چاروں طرف سے گھروں نے گھیرا ہوا تھا. البتہ گھروں کے درمیان دروازے تھے. جن کے ذریعہ لوگ مسجد میں داخل ہوتے تھے. پھر مسجد لوگوں کے لئے تنگ ہو گئی. تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گھروں کو خرید کر انہیں منہدم کر دیا. اور جن لوگوں کے گھر مسجد کے بالکل قریب تھے. انہیں گروا دیا. لیکن بعض لوگوں نے قیمت لینے اور گھر بیچنے سے انکار کر دیا. چنانچہ ان کے گھروں کی قیمتیں کعبے کی الماری میں رکھ دی گئیں. یہاں تک کہ بعد میں انہوں نے لے لیں. اس کے بعد حضرت عمرؓ نے مسجد کے گرد ایک چھوٹی سے دیوار بنوا دی. اور جو لوگ بیچنے سے انکار کر رہے تھے.. ان سے فرمایا کہ "تم کعبے پر آکر اتر گئے ہو. جب کہ یہ جگہ کعبے کا صحن تھی اور کعبہ تم پر آکر نہیں اترا" پھر حضرت عثمانؓ کے زمانے میں لوگوں کی تعداد اور زیادہ ہو گئی تو انہوں نے مسجد حرام میں توسیع کی. اور کچھ لوگوں سے جگہ خرید لی. اور بعض لوگوں نے بیچنے سے انکار کیا. بالآخر حضرت عثمانؓ نے ان کے گھر منہدم کرا دیئے. اس پر لوگوں نے احتجاج کیا تو تو حضرت عثمانؓ نے انہیں بلوایا. اور فرمایا کہ "میرے حلم نے تم لوگوں کو جری کر دیا ہے. حضرت عمرؓ نے تمہارے ساتھ یہی معاملہ فرمایا تھا. اس پر کسی نے احتجاج نہیں کیا. میں نے انہیں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی تو تم احتجاج کرتے ہو". اس کے بعد ان لوگوں کو قید کرنے کا حکم دیا. لیکن عبداللہ بن خالد بن اسیدؓ کی گفتگو کے نتیجے میں انہیں چھوڑ دیا" (۱)

(۱) تاریخ مکہ للازرقیؒ ص ۶۸ و ۶۹ ج ۲ مطبوعہ مکہ مکرمہ ۱۴۰۳ھ۔

علامہ تقی الدین فاسیؒ نے یہ واقعہ ازرقیؒ ہی سے نقل کرنے کے بعد بتایا ہے کہ حضرت عمرؓ ہی کے زمانے میں مسجد حرام کی جو توسیع ہوئی. یہ واقعہ ۱۷ھ کا ہے. اور حضرت عثمانؓ کی توسیع کا واقعہ ۲۶ھ کا۔ (۱)

۱۲۶۔ یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عباسؓ کے درمیان مسجد نبوی کی توسیع کے وقت جو اختلاف پیش آیا تھا. بظاہر حضرت ابی بن کعبؓ کے فیصلے کے بعد حضرت عمرؓ بھی مطمئن ہو گئے تھے. کہ کسی شخص کو اپنی ملکیت فروخت کرنے پر اس کی مرضی کے خلاف مجبور نہیں کیا جا سکتا. پھر مسجد حرام کے اس واقعے میں انہیں جبری طور پر لوگوں کے مکانات کس بنیاد پر خریدے؟

۱۲۷۔ اس سوال کا جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ مکہ مکرمہ کی زمینوں کی حیثیت دوسری زمینوں سے مختلف ہے. قرآن کریم کا ارشاد ہے:

سوآء ن العاکف فیه و الباد

اس بیت اللہ میں یہاں کے مقیم اور باہر سے آنے والے سب برابر ہیں"

اس کی وجہ سے فقہاء کی ایک بڑی جماعت اس بات کی قائل ہے کہ یہاں کی زمینیں کسی کی شخصی ملکیت نہیں ہو سکتیں. لہٰذا ان کی بیع و شراء بھی جائز نہیں ہے. اور حضرت عمرؓ نے مکہ مکرمہ کے باشندوں پر اسی قرآنی ارشاد کی وجہ سے یہ حکم عائد کیا تھا کہ وہ حاجیوں پر اپنے گھروں کے دروازے بند نہ کریں. اور حاجیوں کو اجازت دی تھی کہ وہ جس گھر یا جگہ کو خالی پائیں. اس میں آ کر ٹھہر جائیں۔ (۲)

۱۲۸۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے معترضین کے جواب میں یہ فرمایا کہ "تم کعبے پر آ کر اتر گئے ہو. جب کہ یہ جگہ کعبے کا صحن تھی. کعبہ تم پر آ کر نہیں اترا" گویا وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ جگہ کسی کی ملکیت نہیں ہے. بلکہ کعبہ کی ضروریات کے لئے وقف ہے. لہٰذا جن لوگوں نے اس جگہ پر تعمیرات کر رکھی ہیں. وہ ایک وقف جگہ پر کی ہوئی تعمیرات ہیں، جنہیں وقف کی مصلحت کے پیش نظر جب چاہیں ہٹایا جا سکتا ہے. اس صورت میں جو قیمت ان لوگوں کو ادا کی گئی وہ صرف تعمیر کی قیمت تھی. جگہ کی نہیں. حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے اس واقعے کی یہی توجیہ کی ہے۔ (۱)

---

(۱) شفاء الغرام باخبار البلد الحرام للفاسی. ص ۲۲۴ ج ۱۔

(۲) کتاب الاموال لابی عبید۔ ص ۶۶۔

(۱) اعلاء السنن. ص ۲۰۳ و ۲۰۴ ج ۱۳۔

۱۲۹۔ اور دوسرا جواب یہ بھی ممکن ہے کہ شدید اور ناگزیر مواقع پر جبری بیع کی اجازت حضرت عقبہ بن عامرؓ کی اس حدیث سے ثابت ہے جو اوپر ذکر کی گئی ہے۔ لیکن اس اجازت کو بہت احتیاط کے ساتھ صرف ایسے مواقع پر استعمال کیا جا سکتا ہے جہاں ضرورت اتنی شدید ہو کہ اس عمل کے بغیر چارہ نہ رہے۔ مسجد نبوی کی توسیع کے سلسلے میں حضرت عمرؓ اور حضرت عباسؓ کے درمیان جو قضیہ پیش آیا، وہاں صورت یہ تھی کہ حضرت عمرؓ ایسی ضرورت سمجھ رہے تھے۔ لیکن حضرت عباسؓ کی رائے میں ضرورت اس درجے کی نہیں تھی۔ کہ اس کی بنا پر بیع کے عام اصول میں استثناء پیدا کیا جا سکے۔ اور یہ بھی بعید نہیں ہے کہ حضرت عباسؓ یہ محسوس کرتے ہوں کہ حضرت عمرؓ تو اس وقت ضرورت کے تحت یہ اقدام کر رہے ہیں۔ لیکن انہیں اندیشہ یہ تھا کہ ان کا یہ عمل آئندہ کے لئے نظیر بن جائے گا۔ اور لوگ اسے شدید ضرورت کے بغیر بھی بے دریغ استعمال کرنا شروع کر دیں گے۔ لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ اس مسئلے کی ضروری وضاحت ہو جائے کہ شدید ضرورت کے بغیر اس طرح کی جبری خریداری جائز نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت ابی بن کعبؓ کے فیصلے کے بعد جب یہ مقصد حاصل ہو گیا تو حضرت عباسؓ نے رضاکارانہ طور پر اپنا مکان حضرت عمرؓ کے حوالے کر دیا۔

۱۳۰۔ دوسری طرف مسجد حرام کے معاملے میں شدید ضرورت واضح تھی۔ اس لئے کہ مکہ مکرمہ میں سب سے پہلے بیت اللہ ہی تعمیر ہوا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ جب چاہیں۔ اور جتنی تعداد میں چاہیں، یہاں آکر عبادت کریں۔ لہٰذا کعبے کے آس پاس کی جگہ اصل میں کعبہ ہی کی ضروریات کے لئے ہونی چاہئے تھی۔ لوگ اپنے طور پر یہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ جب ان کی آبادی کی وجہ سے اصل مقصد میں خلل آنے لگا۔ اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ اس آبادی سے ہٹ کر کسی اور جگہ مسجد تعمیر کر دی جائے۔ کیونکہ کوئی بھی مسجد بیت اللہ اور مسجد حرام کا بدل نہیں بن سکتی۔ تو اس آبادی کو ہٹانا جو بیت اللہ کی تعمیر کے اصل مقصد میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ ایسی ناگزیر ضرورت تھی کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ اس موقع پر بعض لوگوں نے اپنی ذاتی مشکلات کی بنا پر تو اعتراض کیا۔ لیکن ایک علمی مسئلے کے طور پر کسی صحابی کا اس عمل پر کوئی اعتراض ثابت نہیں ہے۔

۱۳۱۔ لہٰذا ان دونوں واقعات کے مجموعے سے جو بات سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ اصل قاعدہ یہی ہے کہ کسی شخص کی جائیداد کی جبری خریداری جائز نہیں ہے۔ لیکن نہایت شدید اور ناگزیر ضرورت کے موقع پر اس کی گنجائش ہے۔

۱۳۲۔ چنانچہ فقہاء کرام نے اسی اصول کے مطابق کئی ضروریات کے لئے جبری خریداری کو جائز قرار دیا ہے۔ جس کی چند مثالیں ذیل میں پیش کرتا ہوں:

(۱) فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''در مختار'' میں ہے:

توخذ أرض و دار و حانوت بجنب مسجد ضاق على الناس بالقيمة كرهاً

جو مسجد لوگوں کے لئے تنگ ہو گئی ہو، اور اس کے قریب کوئی زمین یا گھر یا دوکان ہوں تو اسے قیمت کے ذریعہ زبردستی لیا جا سکتا ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

لما روى عن الصحابة رضى الله عنهم لما ضاق المسجد الحرام أخذوا أرضين بكره من أصحابها بالقيمة و زاد وافى المسجد الحرام، بحر عن الزيلعى، قال فى نور العين: ولعل الأخذ كرها ليس فى كل مسجد ضاق، بل الظاهر أن يختص بمالم يكن فى البلد مسجد آخر، إذ لو كان فيه مسجد آخر يمكن دفع الضرورة بالذهاب إليه، نعم فيه حرج، لكن الأخذ كرها أشد حرجاً منه، ويؤيد ما ذكرنا فعل الصحابة، إذ لا مسجد فى مكة سوى المسجد الحرام»

اس کی دلیل یہ ہے کہ جب مسجد حرام تنگ پڑ گئی تو صحابہ کرام سے مروی ہے کہ انہوں نے مالکان سے ان کی زمینیں قیمت دے کر زبردستی لیں، اور مسجد حرام میں اضافہ کیا. (بحر عن الزیلعی ۔) اور صاحب نور العین کہتے ہیں کہ شاید زبردستی لینے کا جواز ہر اس مسجد کے لئے نہیں ہے جو تنگ پڑ جائے، بلکہ اس صورت کے ساتھ خاص ہے جب کہ شہر میں کوئی اور مسجد نہ ہو، اس لئے کہ اگر کوئی اور مسجد ہو تو وہاں جا کر نماز پڑھنے سے ضرورت پوری ہو سکتی ہے، ہاں اس میں دقت تو ہے، لیکن زبردستی لینے میں اس سے زیادہ دقت ہے، اور ہماری اس بات کی تائید صحابہ کے عمل سے بھی ہوتی ہے، کیونکہ مکہ مکرمہ میں مسجد حرام کے سوا کوئی اور مسجد نہیں'' (۱)

(۲) فقہ مالکی کے مشہور عالم علامہ مواق'' لکھتے ہیں:

---

(۱) رد المحتار، ص ۳۲۱ ج ۳، کتاب الوقف۔

«ویکرہ الناس السلطان علی بیعها إذا احتاج الناس إلیها لجامعهم الذی فیه الخطبة، وکذلك الطریق إلیها، لا إلی المسجد التی لا خطبة فیها و الطرق التی فی القبائل لأقوام»

اگر لوگوں کو اپنی ایسی جامع مسجد کے لئے گھروں کی جگہ کی ضرورت ہو جس میں خطبہ ہوتا ہو، یا اس کی جامع مسجد تک جانے کے لئے راستے کی ضرورت ہو تو سلطان مالکوں کو اس کی بیع پر مجبور کر سکتا ہے۔ لیکن جن مسجدوں میں خطبہ نہیں ہوتا، یا قبائل کے لئے بنے ہوئے راستوں میں توسیع کے لئے بیع پر مجبور کرنا جائز نہیں۔ (۲)

(۳) فقہ حنفی کی مشہور کتاب "فتاوی قاضی خان" میں ہے:

«قالوا: وللسلطان أن یجعل ملك الرجل طریقا عند الحاجة»

فقہاء نے کہا ہے کہ سلطان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ضرورت کے وقت کسی شخص کی ملکیت کو راستہ قرار دے دے" (۱)

(۴) اسی اصول کو خلافت عثمانی کے دور میں مدون کردہ قانون "مجلة الاحکام العدلیة" میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

لدی الحاجة یئوخذ ملك کائن من کان بالقیمة بأمر السلطان و یلحق بالطریق، لکن لا یئوخذ من یده مالم یود له الثمن»

ضرورت کے وقت سلطان کے حکم سے ہر شخص کی ملکیت خواہ وہ کوئی ہو، قیمت ادا کر کے لی جا سکتی ہے، اور اسے راستے میں شامل کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کے قبضے سے اس وقت تک نہیں لی جائے گی جب تک اسے قیمت ادا نہ کر دی گئی ہو۔ (۲)

(۵) امام محمد بن حسن شیبانیؒ جو امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد ہیں، اسلام کے بین الاقوامی قانون پر اپنی معروف کتاب "السیر الکبیر" میں یہ مسئلہ تحریر فرماتے ہیں کہ اگر جنگ کے دوران امیر لشکر کو

---

(۲) التاج والاکلیل، للمواق، بھامش الحطاب، ص ۴۲ ج ۶ کتاب الوقف۔

(۱) فتاوی قاضی خان، ص ۲۳۶، ج ۱، کتاب الزکوۃ، فصل احیاء الموات۔

(۲) مجلة الاحکام العدلیہ، دفعہ نمبر ۱۲۱۶۔

مرکز کی طرف کوئی ایلچی بھیجنے کی ضرورت پیش آئے، اور ایلچی کے لئے کوئی فالتو گھوڑا موجود نہ ہو، تو اسے چاہئے کہ کسی گھوڑے کے مالک سے گھوڑا مستعار لینے کی کوشش کرے۔ لیکن:

و إن أبى أن يعطيه الفرس ولم يجد الإمام بداً من أن يأخذ الفرس منه فيدفعه إلى الرسول لضرورة جاءت للمسلمين فلا بأس بأن يأخذ منه كرهاً »

اگر گھوڑے کا مالک گھوڑا دینے سے انکار کر دے، اور امیر کے پاس اس گھوڑے کو حاصل کئے بغیر چارہ نہ ہو، کیونکہ مسلمانوں کو ایک ضرورت ایسی پیش آگئی ہے کہ وہ گھوڑا ایلچی کو دینا ضروری ہو گیا ہے، تو ایسی صورت میں وہ گھوڑا اس سے زبردستی لے سکتا ہے"

شمس الائمہ سرخسیؒ اس کی دلیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لأنه نصب ناظرا، وعند الضرورة يجوزله أن يأخذ مال الغير بشرط الضمان»

اس لئے کہ امیر کو نگران مقرر کیا گیا ہے، اور ضرورت کے موقع پر اس کے لئے جائز ہے کہ کسی دوسرے کا مال لے لے، بشرطیکہ اس کا معاوضہ ادا کرے" (۱)

(۲) احتکار، یعنی گراں فروشی کی غرض سے اشیاء ضرورت کی ذخیرہ اندوزی، حدیث کی رو سے ناجائز ہے، اب اگر کسی شخص نے ایسی اشیاء کی ذخیرہ اندوزی کر رکھی ہو جن کی بستی میں قلت ہے، اور لوگوں کو ان کی ضرورت ہے، تو فقہاء کرام نے اس صورت میں بھی قاضی کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ ایسے ذخیرہ اندوزوں کو ان اشیاء ضرورت کی فروخت پر مجبور کر سکتا ہے، اس سلسلے میں فقہ حنفی کی کتاب "الاختیار" میں مسئلے کی تفصیل بیان کی گئی ہے:

«و إذا رفع إلى القاضي حال المحتكر يأمره ببيع ما يفضل من قوته و عياله فإن امتنع باع عليه، لأنه في مقدار قوته و عياله غير محتكر، ويترك قوتهم على اعتبار السعة. وقيل: إذا رفع إليه أول مرة نهاه عن الاحتكار، فان

---

(۱) شرح السیر الکبیر، ص ۲۲۵ ج ۲۔ مطبوعہ دکن۔

رفع إليه ثانيا حبسه و عزره بما يرىٰ زجراله، ودفعا للضرر عن الناس. قال محمد: أجبر المحتكرين على البيع ما احتكروا ولا أسعر، ويقال له: بع كما يبيع الناس و بالزيادة يتغابن الناس في مثلها، ولا أتركه يبيع بأكثر.... وقد قال أصحابنا: إذا خاف الإمام على أهل مصر الضياع و الهلاك أخذ الطعام من المحتكرين، وفرقه عليهم، و إذا وجدوا ردوا مثله، وليس هذا حجرا، و إنما هو للضرورة، كما في المخمصة»

اگر قاضی کے پاس ذخیرہ اندوزی کرنے والے کا معاملہ لایا جائے، تو وہ اسے حکم دے کہ جتنی غذائی اشیاء اس کے اپنے اور اس کے اہل و عیال کی ضرورت سے زائد ہوں، انہیں بیچ دے، اگر وہ انکار کرے تو قاضی اس کی طرف سے بیچ دے، اس لئے کہ اپنی اور اپنے عیال کی غذائی ضرورت کی حد تک وہ ذخیرہ اندوزی کا مرتکب نہیں ہے، اور ان کی غذائی ضرورت کا اندازہ اس کی وسعت کے مطابق کیا جائے گا، اور بعض فقہاء کا کہنا ہے کہ جب کسی ایسے شخص کا معاملہ پہلی بار پیش ہو تو قاضی اسے احتکار سے منع کرے، اگر دوبارہ وہ (احتکار کے جرم میں) پیش ہو تو اسے قید کر دے جو اسے اس کے عمل سے روک سکے، اور لوگوں کی تکلیف دور ہو، امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ میں ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کو بیع پر مجبور کروں گا، لیکن کوئی خاص قیمت بیع کے لئے مقرر نہیں کروں گا، اس کے بجائے اس سے کہا جائے گا کہ تم اسی طرح فروخت کرو جیسے لوگ فروخت کر رہے ہیں، اور اگر وہ تھوڑی سی زیادتی کے ساتھ بھی بیچ دے جس کی عموماً لوگ پرواہ نہیں کرتے، تو بھی کچھ حرج نہیں، لیکن میں اس سے زیادہ قیمت لے کر بیچنے کی اجازت نہیں دوں گا، .... اور ہمارے فقہاء نے کہا ہے کہ اگر کسی سربراہ حکومت کو کسی شہر والوں کے بارے میں اندیشہ ہو کہ وہ بھوک کی وجہ سے ہلاک ہو جائیں گے، تو وہ ذخیرہ اندوزوں سے غذائی اشیاء لے کر ان میں تقسیم کر دے گا، پھر جب ان لوگوں کو استطاعت ہو وہ اتنا ہی واپس کر دیں گے" (۱)

(۱) الاختیار لتعلیل المختار. لموصلیؒ ص ۱۶۱ ج ۴. کتاب الکراہیۃ۔
یہ مسئلہ اور بھی فقہاء کرام نے لکھا ہے. (ملاحظہ ہو. بدائع الصنائع. ص ۱۲۹ ج ۵. الطرق الحکمیۃ لابن قیم. ص ۲۸۴

۱۳۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث، خلفائے راشدین کے عمل، اور فقہاء کرام کی مذکورہ بالا تصریحات سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی شخص کو اپنی ملکیت فروخت کرنے پر مجبور کرنا عام حالات میں تو بالکل جائز نہیں ہے، لیکن کسی ناگزیر ضرورت کی بنا پر حکومت اسلامی کسی شخص کو بیع پر مجبور کر سکتی ہے۔

۱۳۴۔ اب سوال یہ ہے کہ اس ضرورت کا معیار کیا ہوا؟ اس سلسلے میں فقہاء کرام نے اصول فقہ میں چند درجات بیان فرمائے ہیں، جنہیں ضرورت، حاجت، منفعت، زینت اور فضول کی اصطلاحات سے تعبیر فرمایا ہے:

ضرورت کی تعریف عموماً فقہاء نے اس طرح کی ہے:

بلوغه حدا إن لم يتناول الممنوع هلك، أوقارب، كالمضطر للأكل و اللبس، بحيث لو بقي جائعا أو عريانا هلك أو تلف منه عضو، وهذا يبيح تناول المحرم

کسی کا ایسی حد پر پہنچ جانا کہ اگر وہ ناجائز کام کا ارتکاب نہ کرے، تو یا بالکل ہلاک ہو جائے گا، یا ہلاکت کے قریب پہنچ جائے گا، مثلاً وہ شخص جو کھانے یا پہننے پر اتنا مجبور ہو کہ اگر بھوکا یا برہنہ رہے تو مر جائے، یا اس کا کوئی عضو ضائع ہو جائے، ایسے موقع پر حرام کا استعمال جائز ہے" (۱)

حاجت کی تعریف یہ کی گئی ہے:

أن يكون الإنسان في حالة من الجهد و المشقة التي لا تؤدي به إلى الهلاك إذا لم يتناول المحرم شرعا»

انسان ایسی حالت میں ہو کہ اگر حرام شرعی کا ارتکاب نہ کرے تو ہلاک نہیں ہو گا، لیکن سخت مشقت ہو گی" (۲)

اس حالت میں حکم فقہاء نے یہ بیان فرمایا ہے کہ:

و ۲۸۵، والحسبة لابن تیمیہ ص۱۷، ۴۱، ورد المحتار، ص۲۸۲ ج۵، شرح مسلم للالئی ص۳۰۴ و ۳۰۵ ج۴، مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے۔ موسوعۃ الفقہ الاسلامی المصریۃ ص۱۹۸ و ۱۹۹ ج۳

(۱) المنثور فی القواعد للزرکشی، ص۳۱۹ ج۲۔ والاشباہ والنظائر لابن نجیم، ص۱۱۹ ج۱۔

(۲) نظریۃ الضرورۃ الشرعیۃ، ڈاکٹر وہبہ الزحیلی۔ ص۲۴۷، طبع بیروت، ۱۴۰۲ھ

«هذا لا يبيح الحرام، و يبيح الفطر فى الصوم»
اس حالت میں حرام چیز کا کھانا تو جائز نہیں، لیکن روزہ توڑنا جائز ہو جاتا ہے" (۱)
تیسرا درجہ منفعت ہے، اس کی تعریف یہ کی جا سکتی ہے کہ "یہ ایسی حالت کا نام ہے جس میں ناجائز کام کا ارتکاب نہ کرنے سے نہ تو ہلاکت کا اندیشہ ہے، نہ کوئی شدید مشقت پیش آتی ہے، البتہ وہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا جو ناجائز کام سے بظاہر حاصل ہوتا، فقہاء کرام نے اس کی مثال یہ دی ہے کہ ایک شخص کے پاس بھوک مٹانے کے لئے جو کی روٹی موجود ہے، لیکن اسے گندم کی روٹی، بکرے کے گوشت اور روغنی کھانے کا شوق ہے، اور جو کی روٹی پسند نہیں، اس درجے سے کسی شرعی حکم میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔ (۲)
چوتھا درجہ زینت ہے، یعنی وہ حالت جس میں ناجائز کام نہ کرنے سے نہ ہلاکت ہوتی ہے، نہ کوئی ناقابل برداشت مشقت پیش آتی ہے، اور ناجائز کے ارتکاب سے کوئی حقیقی فائدہ بھی حاصل نہیں ہوتا، البتہ ظاہری سجاوٹ کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے، مثلاً کسی شخص کے پاس بقدر ضرورت کپڑے موجود ہیں، لیکن وہ چاہتا ہے کہ فیشن کے مطابق کپڑے حاصل کرے، اس درجے سے بھی کسی شرعی حکم میں تبدیلی نہیں آ سکتی۔
پانچواں درجہ فضول ہے، یعنی ایسی حالت میں جس میں ناجائز کے ارتکاب سے نہ ہلاکت کو دور کرنا مقصود ہے، نہ مشقت کو، نہ اس سے کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ اس درجے سے احکام میں کسی تغیر کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔
۱۳۵۔ ان پانچ درجات میں سے پہلا درجہ یعنی "ضرورت" ایسا ہے کہ اس کی بنیاد پر بقدر ضرورت حرام کے استعمال کی اجازت ہو جاتی ہے، دوسرا درجہ یعنی "حاجت" ایسا ہے کہ اگرچہ اس سے کسی حرام چیز کے استعمال کا جواز پیدا نہیں ہوتا، لیکن اگر وہ عمومی شکل اختیار کر جائے، یعنی وہ حاجت انفرادی نہ ہو، بلکہ اجتماعی ہو، تو وہ اجتماعی حاجت بھی بہت سے مسائل میں "ضرورت" کے قائم مقام ہو جاتی ہے، اور اس کی وجہ سے احکام میں تغیر آ جاتا ہے، چنانچہ فقہاء کرام کے ہاں یہ قاعدہ مشہور ہے کہ:
«الحاجة العامة تنزل منزلة الضرورة الخاصة فى حق آحاد الناس»
عمومی حاجت کو اس انفرادی ضرورت کے قائم مقام قرار دیا جا سکتا ہے جو افراد کو

(۱) الاشباہ والنظائر ص ۱۱۹ ج ۱۔

(۲) الاشباہ والنظائر ص ۱۱۹ ج ۱۔

پیش آتی ہے۔ (۱)

اس کے علاوہ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ جو چیز حرام قطعی ہو، اس کا جواز صرف "ضرورت" کے حالات میں ہوتا ہے، وہاں حاجت کا اعتبار نہیں ہے، لیکن جس چیز کی حرمت قطعی نہ ہو، بلکہ ظنی ہو، وہاں "حاجت" کی بنیاد پر بھی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔

۱۳۶۔ اس تفصیل کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ "جبری بیع" کون سی صورتوں میں جائز ہو سکتی ہے؟ حدیث میں "جبری بیع" کا جو ایک موقع بیان کیا گیا ہے، یعنی مجاہدین کا راستے کی بستیوں سے جبراً کھانا خریدنا، وہ "ضرورت" ہی کی حالت ہے، کیونکہ اگر اس کی اجازت نہ ہو تو پورے لشکر کے بھوکے مر جانے کا اندیشہ ہے۔

۱۳۷۔ لیکن فقہاء کرام کے حوالہ سے جبری بیع کی جو صورتیں پیچھے بیان کی گئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ فقاء کرام نے "اجتماعی حاجت" کو بھی "ضرورت" کے قائم مقام قرار دے کر "جبری بیع" کی اجازت دی ہے، ظاہر ہے کہ مسجد کے تنگ ہونے سے یا راستے کی تنگی سے کسی کی ہلاکت واقع ہونے کا اندیشہ تو ہمیشہ نہیں ہو سکتا، لیکن شدید مشقت ضرور پیش آ سکتی ہے، اور چونکہ یہ شدید مشقت اجتماعی نوعیت کی ہے، اس لئے فقہاء کرام نے اس حاجت کو ضرورت کے قائم مقام قرار دیا ہے، اسی طرح اگر کوئی امیر لشکر مرکز کو پیغام بھیجنے کے لئے کوئی ایلچی روانہ کرنا چاہتا ہے، تو ہمیشہ ایسی ضرورت نہیں ہوگی جس کے بغیر لشکر کی ہلاکت کا خطرہ ہو، لیکن اس کے بغیر شدید مشقت کا اندیشہ ضرور ہو گا، اور یہ مشقت چونکہ اجتماعی نوعیت کی ہے، اس لئے اسے بھی "ضرورت" قرار دے کر جبری بیع کی اجازت دی گئی ہے۔

۱۳۸۔ اس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ بالا پانچ درجات میں سے "ضرورت" اور "اجتماعی حاجت" دو درجات ایسے ہیں جن کی موجودگی میں "جبری خریداری" کا جواز نکل سکتا ہے، لیکن باقی تین درجات یعنی "منفعت" "زینت" یا "فضول" کے لئے جبری خریداری جائز نہ ہو گی۔

۱۳۹۔ اب مذکورہ بحث سے جبری خریداری کے جواز کے لئے ضرورت کا معیار مقرر کرتے ہوئے یہ نتائج بر آمد ہوتے ہیں:

(۱) عام حالات میں کسی شخص کو اس کی ملکیت فروخت کرنے پر مجبور کرنا جائز نہیں۔

(۲) صرف "ضرورت" یا "عمومی حاجت" کے موقع پر ہی جبری خریداری جائز ہو سکتی ہے، اور اس کا معیار یہ ہے کہ اس جبری خریداری کے بغیر یا تو کسی کی جان چلی جانے کا براہ راست

---

(۱) المنثور فی القواعد للزرکشی ص ۲۴ ج ۱۔

خطرہ گمان غالب کے درجے میں پیدا ہو گیا ہو. یا اس کے بغیر عام انسانوں کو شدید مشقت میں مبتلا ہونے کا غالب گمان ہو۔

(۳) مذکورہ "ضرورت" یا "عمومی حاجت" کو دور کرنے کا اس جبری خریداری کے سوا کوئی راستہ نہ ہو. اور یہ فیصلہ تمام ممکنہ متبادل طریقوں پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد کیا گیا ہو. لہٰذا محض "مفاد عامہ" (Public Interest) کی مجمل بنیاد کافی نہیں، جب تک "ضرورت" یا "عمومی حاجت" کا تیقن نہ ہو گیا ہو۔

(۴) جبری خریداری میں جو چیز زبردستی کسی شخص سے لی جا رہی ہے. اس کا معاوضہ جبری خریداری کی تاریخ میں اس شے کے بازاری نرخ (Markat Value) کے مطابق معین کیا جائے. کیونکہ اوپر بحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ شریعت نے جس جگہ جبری خریداری کی اجازت دی ہے. وہاں "قیمت" یا "ضمان" کی ادائیگی لازم قرار دی ہے. اور "قیمت" یا "ضمان" دونوں کا مطلب "بازاری نرخ" کے مطابق ادائیگی ہے. محض کسی حاکم کی طرف سے استبدادی طور پر (Arbitrary) معاوضہ کے تعین کو "قیمت" یا "ضمان" نہیں کہا جا سکتا۔

(۵) بازاری نرخ کے مطابق یہ معاوضہ مطلوبہ شے کا **قبضہ** لینے سے پہلے یا اس کے ساتھ ساتھ ادا کر دیا جائے (البتہ اتنی معمولی تاخیر جو انتظامی طور پر ناگزیر ہو. اور جسے قابل ذکر تاخیر نہ سمجھا جائے. "ساتھ ساتھ" ہی میں داخل سمجھی جا سکتی ہے)

ان شرائط کی مکمل رعایت کے ساتھ حاکم مجاز کو شرعاً یہ اختیار دیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی کی ملکیت جبری طور پر خرید لے۔

غریبوں کی امداد کے لئے املاک کی ضبطی

۱۴۰۔ اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا غریبوں کی امداد کے لئے مال دار افراد کی املاک کا کوئی حصہ جبری طور پر ضبط کیا جا سکتا ہے؟

۱۴۱۔ اس کا جواب مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں یہ ہے کہ جہاں تک بلا معاوضہ ضبطی کا تعلق ہے. وہ صرف ایک انتہائی (Externe) موقع پر بقدر ضرورت جائز ہے. اور وہ انتہائی موقع یہ ہے کہ کوئی شخص شدید بھوک سے واقعۃً بیتاب ہو. یا کسی کو تن ڈھاپنے کے لئے کپڑا میسر نہ ہو. یا شدید موسم کی مدافعت کے لئے اس کے پاس نہ کچھ موجود ہو. نہ حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہو. تو ایسے شخص کی یہ وقتی ضرورت پوری کرنا ہر اس مسلمان پر فرض ہے. جس کے علم میں یہ ضرورت آئی ہو.

اگر کوئی شخص یہ فریضہ ادا نہ کرے، تو اسے بزور حکومت اس کی ادائیگی پر مجبور کرنے کے لئے اس سے ضروریات زندگی یا ان کی قیمت کی رقم کا اتنا حصہ بلا معاوضہ لیا جا سکتا ہے جو مذکورہ شخص کی وقتی ضرورت پوری کر سکے۔ اور مالک کی ناگزیر ضرورت سے زائد ہو۔

۱۴۲۔ اس ایک صورت کے سوا جس کی تفصیل پیچھے بیان ہو چکی ہے۔کسی بھی صورت میں اسلامی حکومت کے کسی باشندے سے (مسلم یا غیر مسلم) کی کسی ملکیت پر بلامعاوضہ قبضہ کر لینا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔

۱۴۳۔ جہاں تک ایسے اشخاص کا تعلق ہے۔ جو بھوک پیاس سے بیتاب یا برہنگی کا شکار نہیں ہیں، بلکہ اپنی روز مرہ کی ضروریات، خواہ بہت معمولی انداز میں صرف بقدر ضرورت پوری کر رہے ہیں، لیکن مشقت کے ساتھ پوری کر رہے ہیں، سو ان کا معاشی رتبہ بلند کرنے کے لئے اسلام نے "تحدید ملکیت" یا "املاک کی جبری ضبطی" کا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے دوسرے ایسے احکام دیئے ہیں، جن کے ذریعے یہ مقصد حاصل کیا جا سکے۔ ان احکام میں "زکوٰۃ" کی فرضیت، رشتہ داروں کے نفقے کے احکام، وراثت کے احکام سود، رشوت، قمار وغیرہ کی حرمت وغیرہ سرفہرست ہیں، اگر ان احکام پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا جائے تو وہ زبردست معاشی تفاوت جو معاشرے کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔ خود بخود دور ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا اسلام نے اس غرض کے لئے اس شخص کی املاک کی ضبطی کی اجازت نہیں دی جو زکوٰۃ وغیرہ کے احکام پر عمل پیرا ہو، اور جس کی آمدنی کا کوئی ذریعہ ناجائز نہ ہو۔

۱۴۴۔ ہاں اگر کسی شخص نے کوئی دولت ناجائز طریقے سے حاصل کی ہے تو اس صورت میں وہ اس کی ملکیت ہی نہیں۔ لہٰذا اس پوری ناجائز دولت کو اس سے چھین کر اصل مالک کو، اور اگر اصل مالک معلوم نہ ہو سکے۔ یا اس کو لوٹانا کسی وجہ سے ممکن نہ ہو تو عام غرباء کو تقسیم کرنا اسلامی حکومت کے لئے نہ صرف جائز، بلکہ ضروری ہے، اس صورت میں ملکیت کی تحدید کا سوال نہیں، بلکہ وہ ناجائز دولت پوری کی پوری واپس لے لی جائے گی۔

۱۴۵۔ البتہ اگر بیجا ارتکاز دولت کے خاتمے کے لئے اسلام نے جو احکام دیئے ہیں، مثلاً زکوٰۃ، عشر، خراج، وراثت اور سود و قمار کی حرمت وغیرہ، اگر ان تمام احکام پر عمل کے باوجود کوئی غیر معمولی صورت حال ایسی پیدا ہو جائے کہ کسی خاص قسم کی دولت کسی خاص طبقے میں سمٹ کر رہ گئی ہو، اور اس کی بنا پر دوسروں کو شدید مشقت اور دشواری کا سامنا ہو تو اس صورت میں اس "عمومی حاجت" کی بنا پر وہ دولت انہی پانچ شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے معاوضہ دے کر اس کے مالکوں سے وصول کی جا سکتی ہے۔

زمینوں کا ارتکاز۔

۱۴۶۔ بعض اوقات یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں زمینوں کے غیر معمولی طور پر بڑے بڑے رقبے چند بڑے بڑے زمینداروں کی ملکیت میں تھے۔ اور اس طرح زمینوں کا چند ہاتھوں میں ارتکاز ہو کر رہ گیا تھا۔ اس ارتکاز سے بے شمار معاشی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پیدا ہوئے۔ جنہوں نے معاشرے کو خراب کر کے رکھ دیا۔ اگر ان بڑے زمینداروں سے زمینیں چھینی نہ جاتیں تو ارتکاز کے اس فتنے کا سدباب کیسے ممکن تھا؟

۱۴۷۔ لیکن اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں دولت کا بیجا ارتکاز صرف زمینوں کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ دولت کے ہر شعبے میں موجود ہے۔ لیکن اس کی وجہ اسلامی احکام سے روگردانی ہے۔ دوسرے شعبوں کی طرح زمینوں میں بھی یہ بیجا ارتکاز اس بنا پر نہیں ہوا کہ ملکیت زمین کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی تھی، اور نہ اس کا علاج یہ تھا کہ ملکیت کی ایک حد مقرر کر کے باقی تمام زمینیں چھین لی جائیں، بلکہ درحقیقت اس ارتکاز کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان زمینوں کے معاملے میں شرعی احکام پر عمل نہیں ہوا، مثلاً زمینوں کے تعلق سے انتہائی افسوس ناک بات یہ رہی ہے کہ ان زمینوں میں سالہا سال سے شرعی احکام کے مطابق وراثت جاری رہتی تو ہرگز ممکن نہیں تھا کہ اتنے بڑے بڑے رقبے چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائیں۔

۱۴۸۔ اسی طرح زمینوں کی ملکیت کے حصول میں جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی کوئی تفریق روا نہیں رکھی گئی، چنانچہ بہت سی زمینیں حرام طریقوں سے حاصل ہوئیں، لیکن ان کی قانونی ملکیت تسلیم کی گئی۔

۱۴۹۔ ہماری نظر میں موجودہ زمینداری نظام میں جو خرابیاں واضح طور پر نظر آتی ہیں ان کا حل اس طرح کی "تحدید ملکیت" نہیں ہے، جس کے ذریعے گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے ملکیت کی حد مقرر کر دی جائے، جسکی واضح اور ناقابل انکار دلیل یہ ہے کہ "زرعی اصلاحات" کے نام سے ملک میں کئی بار یہ تحدید مقرر کی گئیں، ان میں سے آخری تحدید جو ۱۹۷۷ء کے ایکٹ نمبر ۲ کے ذریعے کی گئی تھی، اس کو بھی اب دس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن ان بار بار کی تحدیدات کے باوجود موجودہ زمینداری نظام کی مذکورہ خرابیاں بھی جوں کی توں باقی رہیں، اور زمینوں کے ارتکاز کے مفاسد کا بھی کوئی مؤثر سدباب نہیں ہو سکا۔ اس طرح کی تحدیدات ہمیشہ چور دروازوں کا راستہ کھلا رکھتی ہیں، اور ان کی بنا پر مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہوتے۔

۱۵۰۔ درحقیقت ان خرابیوں کے انسداد کے لئے اسلام نے ایسے احکام دیئے ہیں جن کے ذریعے بالواسطہ طور پر (Indirectly) خود بخود املاک میں تحدید ہوتی رہتی ہے، اور چند ہاتھوں

میں زمینوں کے بیجا ارتکاز کا کوئی راستہ برقرار نہیں رہتا۔ ان احکام میں سے مندرجہ ذیل بطور خاص قابل ذکر ہیں:

(۱) شرعی وراثت کے احکام پر پوری طرح عمل کیا جائے، اور ان احکام کو مئوثر بہ ماضی (Retrospective)قرار دیا جائے، کیونکہ جس کسی شخص نے کسی دوسرے وراث کا حق پامال کر کے اس پر قبضہ کیا ہے، اس کی ملکیت ناجائز ہے، اور وہ ہمیشہ ناجائز ہی رہے گی، جب تک اسے اصل مالک کو نہ لوٹایا جائے۔

(۲) جن لوگوں نے کسی ایسے طریقے سے کسی زمین کی قانونی ملکیت حاصل کی ہے جو شریعت میں حرام ہے، مثلاً رشوت وغیرہ، ان سے وہ زمینیں واپس لے کر اصل مالکوں کو لوٹائی جائیں، اور اگر اصل مالک معلوم نہ ہوں، یا قابل دریافت (treceable) نہ ہوں تو غریبوں میں تقسیم کی جائیں، اس غرض کے لئے ایک کمیشن قائم کیا جا سکتا ہے، جو اراضی کی تحقیق کر کے اس پر عمل کرے۔

(۳) اس فیصلے کے شروع میں وہ احادیث ذکر کی جاچکی ہیں جن میں یہ حکم بیان کیا گیا ہے کہ غیر مملوک بنجر زمین کو جو شخص بھی آباد کر لے، وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے، امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک اس طرح آباد کرنے کے لئے حکومت کی اجازت ضروری ہے، اس اصول کے تحت نئی آبادی کے وقت ایسے لوگوں کو ترجیح دی جائے جن کے پاس پہلے سے زمین نہیں ہے، یا بہت کم ہے۔

(۴) پھر غیر مملوک بنجر زمینوں کی آباد کاری کے تحت اگر کسی زمیندار نے خود یا اپنی تنخواہ دار مزدور کے ذریعے زمین آباد کی ہے، تب تو وہ اس کا مالک ہے، لیکن اگر اس نے آبادی ہی کاشتکاروں کے ذریعہ کروائی ہے تو پھر آباد شدہ زمین کا مالک انہی کاشت کاروں کو قرار دیا جا سکتا ہے جنہوں نے وہ زمین خود آباد کی۔

(۵) بہت سی زمینیں لوگوں نے سودی رہن کے طور پر قبضے میں لی تھیں، اور رفتہ رفتہ وہ ان زمینوں کے مالک بن بیٹھے۔ یہ ملکیت بھی شرعی اعتبار سے درست نہیں ہے، یہ زمینیں ان کے اصل مالکوں کی طرف واپس کی جائیں، اور اس دوران ان زمینوں سے رہن رکھنے والوں نے جو فائدہ اٹھایا ہے، اس کا کرایہ اصل قرض میں محسوب کیا جائے، اور قرض میں محسوب ہونے کے بعد زمینیں ان کے تصرف میں رہی ہوں تو اس سے زائد مدت کا کرایہ اصل مالکوں کو دلوایا جا سکتا ہے۔

(۶) مزارعت (بٹائی) کے معاملات میں جو ظلم وستم زمینداروں کی طرف سے کسانوں پر

ہوتے ہیں، ان کی وجہ وہ فاسد شرطیں ہیں جو زمیندار کسانوں کی بے چارگی سے فائدہ اٹھا کر ان پر قولی یا عملی طور پر عائد کر دیتے ہیں، اور جو اسلام کی رو سے قطعی ناجائز اور حرام ہیں، اور ان میں سے بہت سی بیگار کے حکم میں آتی ہیں، ایسی تمام شرائط کو، خواہ وہ زبانی طے کی جاتی ہوں، یا رسم و رواج کے ذریعے ان پر عمل چلا آتا ہو، قانوناً ممنوع قرار دے کر قانون کی سختی سے پابندی کرائی جائے۔

(۷) اسلامی حکومت کو یہ بھی اختیار ہے کہ اگر زمینداروں کے بارے میں یہ احساس ہو کہ وہ کاشتکاروں کی مجبوری کی وجہ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان سے بٹائی کی شرح اتنی مقرر کرتے ہیں جو کاشتکار کے ساتھ انصاف پر مبنی نہیں ہوتی، تو وہ بٹائی کی کم از کم شرح قانونی طور پر مقرر کر سکتی ہے، جس کے ذریعے کاشت کار کو اس کی محنت کا پورا صلہ مل جائے، اور معاشی تفاوت میں کمی واقع ہو۔

(۸) مزارعت کے نظام میں جو موجودہ خرابیاں پائی جاتی ہیں، اگر مذکورہ بالا طریقوں سے ان پر پوری طرح قابو پانا ممکن نہ ہو تو اسلامی حکومت کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ ایک عبوری دور کے لئے یہ اعلان کر دے کہ اب زمینیں بٹائی پر نہیں دی جائیں گی، بلکہ کاشت کار مقررہ اجرت پر زمیندار کے لئے بحیثیت مزدور کام کریں گے، اس اجرت کی تعیین بھی حکومت کر سکتی ہے، اور بڑی بڑی زمینوں کے مالکان پر یہ شرائط بھی عائد کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک عبوری دور تک زمین کا کچھ حصہ سالانہ اجرت میں مزدور کاشتکار کو دیں گے۔

(۹) پیداوار کی فروخت کے موجودہ نظام میں یہ فروختگی اتنے واسطوں سے ہو کر گزرتی ہے کہ ہر درمیانی مرحلے پر قیمت کا حصہ تقسیم ہوتا چلا جاتا ہے، آڑھتیوں، دلالوں اور دوسرے درمیانی اشخاص (Middle Men) کی بہتات سے جو نقصانات ہوتے ہیں، وہ ظاہر ہیں، اسی لئے اسلام میں ان درمیانی واسطوں کو پسند نہیں کیا گیا، ان واسطوں کو ختم یا کم کرنے کے لئے یا تو ایسے منظم بازار قائم کئے جائیں جن میں دیہی کاشتکار خود پیداوار فروخت کر سکیں، یا امداد باہمی کی ایسی انجمنیں قائم کی جائیں جو خود کاشت کاروں پر مشتمل ہوں، اور وہ فروختگی کا کام انجام دیں، تاکہ قیمت کا جو بڑا حصہ درمیانی اشخاص کے پاس چلا جاتا ہے، اس سے کاشتکار اور عام صارفین فائدہ اٹھا سکیں۔

اگر زرعی اصلاحات ان خطوط پر کی جائیں تو نہ صرف یہ کہ یہ اقدامات شریعت کے عین تقاضے کے مطابق ہوں گے، بلکہ ان سے وہ خرابیاں بھی پیدا نہیں ہوں گی جو کمیاتی تحدید ملکیت کے ذریعے پیدا ہوتی ہیں۔

چونکہ زمینوں کے بیجا ارتکاز کے سدباب کے لئے مذکورہ بالا طریقے موجود ہیں، اور انہیں کام میں نہیں لایا گیا، اس لئے معاوضہ دے کر جبری خریداری کی جو شرائط اوپر بیان کی گئی ہیں وہ بھی یہاں پوری نہیں ہوئیں۔

وقف کا مسئلہ۔

۱۵۱۔ اور جب یہ دفعات ذاتی ملکیتوں کے حق میں قرآن و سنت سے متصادم ہیں، تو وقف کے حق میں بدرجہ اولی قرآن و سنت سے متصادم ہیں، کیونکہ وقف کی بیع باہمی رضامندی سے بھی جائز نہیں ہوتی، (الا یہ کہ واقف نے وقف کرتے وقت شرائط وقف میں یہ شرط لگا دی ہو کہ مخصوص حالات میں وقف کی مصلحت کی خاطر یا کسی ناگزیر ضرورت سے وقف جائداد کو بیچ کر اس کی رقم سے کوئی دوسری جائداد خرید لی جائے گی، اور اس کو پہلے وقف کے مقاصد کے لئے وقف سمجھا جائے گا) اس سلسلے میں وفاقی شرعی عدالت کے اقلیتی فیصلے میں (جو جسٹس کریم اللہ درانی مرحوم نے لکھا ہے) جو دلائل دیے گئے ہیں، وہ کافی وشافی ہیں، اکثریتی فیصلے میں اگرچہ وقف کی زمین کو بھی مفاد عامہ کے تحت بلا معاوضہ یا بالمعاوضہ زبردستی لے لینے کو جائز قرار دیا گیا ہے، لیکن اس معاملے میں انہوں نے قرآن و سنت کی کوئی دلیل پیش نہیں کی، اس کے بجائے صرف یہ کہہ دیا ہے کہ اگر کسی وقف زمین کی جگہ کوئی ڈیم بنانا پڑے تو کیا حکومت کو یہ اختیار نہیں ہو گا کہ وہ ڈیم کے لئے اس وقف زمین کو لے لے؟

۱۵۲۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈیم کی جس ضرورت کا ذکر فاضل وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں کیا گیا ہے، اس سے وقف کو بلا معاوضہ لے لینے کا جواز تو کسی طرح ثابت نہیں ہوتا، بلکہ جبری خریداری کا جواز بھی نہیں نکلتا، کیونکہ ایسی شدید اور ناگزیر ضرورت کی صورت میں "وقف" ہی کے احکام میں "استبدال" کا ایک مفصل باب موجود ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ایسی ناگزیر ضرورت کے موقع پر اس وقت زمین کی ہم پلہ اور ہم مقدار زمین کسی اور جگہ اسی وقف کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے دے دی جاتی ہے، جس سے وقف کا مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے، اور مذکورہ ضرورت بھی پوری ہو جاتی ہے، یا وقف جائداد کو معقول معاوضے پر بیچ کر اس کی رقم سے دوسری جائداد خرید لی جاتی ہے، اس کے لئے بھی کچھ شرائط ہیں، جن کے بغیر یہ "استبدال" جائز نہیں، جن کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو (رد المحتار، کتاب الوقف، ص ۳۸۴ ج ۴، مطبوعہ ایچ ایم سعید کمپنی کراچی) لیکن چونکہ وہ ہمارے موضوع سے خارج ہے، اس لئے یہاں ان کی تفصیل

بیان کرنا غیر ضروری ہے یہ بات بہرحال متعین ہے کہ زیر بحث قوانین میں جس طرح اوقاف کو قبضے میں لینے کی اجازت دی گئی ہے، اس کا "استبدال" اور اس کی شرائط سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

زمینوں کی تقسیم اور بیع پر پابندی

۱۵۳۔ اب میں شریعت اپیل نمبر ۴ ـ در ـ ۱۹۸۱ء کی طرف آتا ہوں، اس اپیل میں لینڈ ریفارمز ریگولیشن (ایم ایل آر ۱۱۵) ۱۹۷۲ء کے پیراگراف نمبر ۲۲، ۲۴ اور ۲۵ کے بعض احکام کو چیلنج کیا گیا ہے۔

مذکورہ ریگولیشن کے پیراگراف نمبر ۲۲ کے احکام یہ ہیں:

(۱) ایسی مشترک ملکیت کی زمین (Joint holding) جو گزارے کی مقدار (subsistence holding) کے برابر یا اس سے کم ہو، اس کو کسی بھی حال میں تقسیم نہیں کیا جائے گا۔

(۲) ایسی مشترک ملکیت کی زمین جو گزارے کی مقدار سے زیادہ ہو، لیکن کفایتی مقدار (Ecenomic Holding) سے کم ہو، اس کو اس طرح تقسیم نہیں کیا جائے گا کہ تقسیم کے نتیجے میں کسی شریک کی کل ملکیت اس کی پہلے سے مملوک زمین کو شامل کر کے گزارے کی مقدار سے کم رہ جائے؟

(۳) ایسی مشترکہ ملکیت کی زمین جو کفایتی مقدار کے برابر ہو، کسی بھی حالت میں تقسیم نہیں کیا جائے گا۔

(۴) ایسی مشترک ملکیت کی زمین جو کفایتی مقدار سے زائد ہو، اس طرح تقسیم نہیں کی جائے گی کہ تقسیم کے نتیجے میں کسی بھی شریک کی کل ملکیت اس کے پہلے سے مملوکہ زمین کو شامل کر کے کفایتی مقدار کے برابر نہ رہے، یا کسی ایک شریک کی ملکیت گزارے کی مقدار سے کم رہ جائے۔

(۵) اس پیراگراف کے مذکورہ بالا احکام کی خلاف ورزی میں جو تقسیم کی جائے گی وہ کالعدم ہو گی۔

۱۵۴۔ اپیل کنندہ کو اس پیراگراف پر اعتراض یہ ہے کہ یہ قوانین انفرادی ملکیت کے حقوق میں ایسی مداخلت کر رہے ہیں جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ اپیل کنندہ نے ان قوانین کے خلاف قرآن کریم کی ان آیات سے استدلال کیا ہے جن میں کسی کے انتقال پر اس کی املاک اس کے

وارثوں کے درمیان تقسیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اپیل کنندہ کا موقف یہ ہے کہ کسی زمین کے ہر وارث یا ہر شریک کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنا حصہ دوسرے شرکاء سے ممتاز اور الگ کر کے وصول کرنے کا مطالبہ کرے، مذکورہ بالا قانون اس کا حق تلف کر رہا ہے، للٰذا وہ قابل تنسیخ ہے۔

۱۵۵۔ اس کے مقابلے میں فاضل وفاقی شرعی عدالت نے اپنے فیصلے میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حکومت نے یہ قانون مصلحت عامہ کے تحت بنایا ہے، جدید معاشی تحقیق سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ زرعی زمینوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے کاشت کرنے سے مجموعی پیداوار میں کمی ہو جاتی ہے، للٰذا پاکستان جیسے ملک میں جہاں پیداوار بڑھانے کا ہر ممکن طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے، اگر زمینوں کی تقسیم پر پابندی عائد کر دی جائے تو اس سے قرآن و سنت کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔

۱۵۶۔ میں نے اس مسئلہ پر تفصیل سے غور کیا، اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس معاملے میں وفاقی شرعی عدالت کا موقف وزن رکھتا ہے، اسی فیصلے کے پیراگراف نمبر ۴۸ سے ۵۵ تک میں اس مسئلے پر بحث کر چکا ہوں کہ مباحات کے دائرے میں حکومت کو مصالح عامہ کی خاطر ایسے احکام جاری کرنے کا حق حاصل ہے، جن میں کسی کی ملکیت چھینے بغیر اس کے استعمال کے طریقے پر کوئی پابندی عائد کر دی گئی ہو، بشرطیکہ اس پابندی سے قرآن و سنت کے کسی حکم کی خلاف ورزی لازم نہ آئے۔

۱۵۷۔ اپیل کنندہ نے میراث کی جن آیات سے استدلال کیا ہے، ان سے اپیل کنندہ کا موقف ثابت نہیں ہوتا، اس لئے کہ ان آیات سے جو بات ثابت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ کسی شخص کے مرنے کے بعد اس کے ترکے کی ملکیت اس کے ورثاء کی طرف بحصہ رسدی منتقل ہو جائے گی، لیکن ورثا کی ملکیت ثابت ہونے کے بعد وہ آپس میں تصفیہ کس طرح کریں؟ اس کا کوئی مخصوص طریقہ ان آیات کریمہ میں متعین کرنے کے بعد ورثاء یہ چاہیں کہ اس جائیداد کو تقسیم کرنے کے بجائے اس کو مشترک حیثیت ہی میں باقی رکھیں، اور اس سے بحصہ رسدی فائدہ اٹھاتے رہیں، تو مذکورہ آیات میں اس کی ممانعت نہیں ہے۔

۱۵۸۔ اسی طرح اگر کوئی مشترک جائیداد اسی نوعیت کی ہو کہ اس کے حصے بخرے کرنے کے بعد وہ بیکار ہو جائے، شرکا کے لئے قابل انتفاع نہ رہے، یا کسی ایک شریک کا حصہ اتنا کم رہ جائے کہ وہ اس سے کما حقہ فائدہ نہ اٹھا سکے تو ان تمام صورتوں میں بھی مشترک جائیداد کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

۱۵۹۔ ان مسائل پر تقریباً تمام فقہاء متفق ہیں، مثلاً علامہ کاسانی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

«فإن كان فى فى تبعيضه ضرر بكل واحد منهما فلا تجوز قسمة الجبر فيه، وذلك نحو اللؤ لؤة الواحدة .... و الخيمة و الحائط و الحمام و البيت الصغير و الحانوت الصغير.

اگر مشترکہ جائیداد کے حصے کرنے سے دونوں شریکوں کو نقصان پہنچتا ہو تو اس میں جبری تقسیم نہیں ہو سکتی، مثلاً ایک موتی ...... خیمہ، دیوار، حمام، چھوٹا گھر اور چھوٹی دکان۔ (۱)

۱۶۰۔ عام طور پر حنفی فقہاء نے تقسیم نہ کرنے کے اس حکم کو اس صورت کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے، جب تقسیم کے بعد کوئی شریک اپنے حصے سے وہ فائدہ نہ اٹھا سکے، جو تقسیم سے پہلے اٹھا رہا تھا، لیکن امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ اس صورت کو بھی داخل قرار دیتے ہیں جب کہ تقسیم کے بعد کسی شخص کے حصے کی قیمت پہلے سے کم ہو جائے، علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

«و عن أحمد رواية أخرى. أن المانع هو أن تنقص قيمة نصيب أحدهما بالقسمة عن حال الشركة، سواء انتفعوا به مقسوماً أولم ينتفعوا و قال القاضي: هذا ظاهر كلام أحمد. لأنه قال فى رواية الميمونى: إذا قال بعضهم: يقسم و بعضهم: لا تقسم، فإن كان فيه نقصان من ثمنه بيع و أعطوا الثمن. فاعتبر نقصان الثمن و هذا ظاهر كلام الشافعي. لأن نقص قيمته ضرر و الضرر منفى شرعاً.

امام احمد سے ایک روایت اور ہے، اور وہ یہ کہ یہ بات بھی تقسیم سے مانع ہے کہ کسی شریک کے حصے کی قیمت تقسیم کی بنا پر اس قیمت سے کم ہو جائے جو شرکت کی حالت میں تھی، خواہ وہ تقسیم کے بعد اس سے نفع اٹھا سکیں یا نہیں اٹھا سکیں۔ قاضی کہتے ہیں کہ: امام احمد کا ظاہر موقف یہی ہے، اس لئے کہ انہوں نے میمونی کی روایت

(۱) بدائع الصنائع۔ ص ۱۹ ج ۷۔

میں کہا ہے کہ اگر کچھ شریک تقسیم کرنے کو کہیں، اور کچھ شریک تقسیم سے انکار کریں تو اگر تقسیم سے قیمت میں کمی آتی ہو تو (اسے تقسیم نہیں کیا جائے گا، بلکہ) اسے بیچ کر ہر شریک کو اس کی قیمت دے دی جائے گی، اس مسئلہ میں امام احمد نے قیمت کی کمی کا بھی اعتبار کیا ہے اور امام شافعی کا ظاہر موقف بھی یہی ہے، کیونکہ قیمت میں کمی ایک ضرر ہے، اور شرعاً ضرر کو دور کرنا چاہئے۔ (۱)

بلکہ آگے چل کر علامہ ابن قدامہ کا یہ عام مقولہ نقل کرتے ہیں کہ:

كل قسمة فيها ضرر لا أرى قسمتها، وهذا قول ابن أبي ليلى و أبي ثور.

ہر وہ تقسیم جس میں کوئی ضرر (نقصان) ہو، میں اس کا قائل نہیں ہوں، اور ابن ابی لیلی اور ابو ثور کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے۔ (۲)

فقہاء کرام نے ضرر کی وجہ سے تقسیم کو جو منع فرمایا ہے، اس کی بنیاد ایک حدیث پر ہے:

عن عمرو بن جميع عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: لا تعضية على أهل الميراث إلا ما حمل القسم.

اہل میراث پر مال کو تقسیم کرنا واجب نہیں ہے،
الا یہ کہ وہ مال ایسا ہو جو تقسیم کا احتمال رکھتا ہو۔ (۴)

اس حدیث کی تشریح میں امام ابو عبیدہ فرماتے ہیں:

هو أن يخلف شيئا إذا قسم كان فيه ضرر على بعضهم أو عليهم جميعاً.

یہ حدیث اس صورت سے متعلق ہے جب کوئی شخص ایسی چیز چھوڑ کر مرے کہ اگر اسے تقسیم کیا جائے تو اس تقسیم سے بعض ورثاء کو یا سب کو ضرر (نقصان) پہنچے۔

---

(۱) المغنی لابن قدامہ۔ ص ۴۹۴ ج ۱۱۔

(۲) المغنی لابن قدامہ۔ ص ۴۹۴۔ ج ۱۱۔

(۳) علامہ عظیم آبادی نے اس حدیث کے ایک راوی صدیق بن موسیٰ پر اعتراض کیا ہے۔ لیکن امام ابن حبان انہیں ثقات میں شمار کرتے ہیں، ابن عیینہ ان کی تعریف کرتے ہیں۔ اور ابن حاتم ان پر کوئی جرح نہیں کرتے۔ (لسان المیزان ص ۱۸۹ ج ۳۔)

(۴) سنن الدارقطنی۔ ص ۲۱۹ ج ۴۔ و کنز العمال، ص ۵ ج ۱۱، فرائض نمبر ۳۳۔

(المغنی لابن قدامہ ص۴۹۵ ج۱۱)

اور علامہ زمخشری اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ھی التفریق، من عضت الشاۃ، أی إذا کان فی الترکۃ ما یستضر الورثۃ بقسمۃ کحبۃ الجوھر، و الطیلسان، و الحمام، ونحو ھا لم یقسم، ولکن ثمنہ.

"تعضیہ" تقسیم کو کہتے ہیں، بکری کے حصے بخرے کرنے کو تعضیہ کہتے ہیں، اور یہ لفظ اسی سے نکلا ہے، اور حدیث کا مطلب یہ کہ اگر ترکے میں کوئی چیز ایسی ہو جس کی تقسیم سے ورثاء کو ضرر پہنچے، مثلاً کسی جوہر کا ایک دانہ، یا چادر یا حمام وغیرہ تو اسے تقسیم نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کی قیمت کا اعتبار ہو گا۔

(الفائق للز مخشری ص۱۶۲ ج۲)

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر تقسیم سے شرکاء یا کسی ایک شریک کو نقصان پہنچنے کا احتمال غالب ہو تو اس صورت میں کسی جائیداد کو تقسیم نہ کرنا میراث کے احکام کے منافی نہیں ہے، بشرطیکہ ہر شریک کا حصہ ملکیت محفوظ رہے، اور کسی شخص کو اپنے مملوک سے محروم نہ ہونا پڑے۔

۱۶۱۔ اس میں شک نہیں کہ فقہاء کرام نے تقسیم کے جو موانع بیان کئے ہیں، وہ زیادہ تر انفرادی ضرر سے تعلق رکھتے ہیں، یعنی ان میں تقسیم کا نقصان کسی ایک شریک یا تمام شرکاء کو پہنچتا ہے، اور اجتماعی ضرر سے انہوں نے بحث نہیں فرمائی، لیکن جب یہ اصول مان لیا جائے کہ "ضرر" کی بنیاد پر تقسیم کو چھوڑا جا سکتا ہے، تو اس میں اجتماعی ضرر بھی خود بخود داخل ہو جاتا ہے۔

۱۶۲۔ لہٰذا اگر تقسیم تر تقسیم کے نتیجے میں ملک کی مجموعی پیداوار متاثر ہو رہی ہو، اور اس سے پورے ملک کی معاشی حالت "ضرر" کا شکار ہو سکتی ہو تو ایسی صورت میں اگر حکومت کسی معقول حد سے زائد تقسیم پر پابندی عائد کر دے، تو مذکورہ بالا اصول کے تحت بظاہر اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اور ایسی پابندی کو قرآن و سنت کے احکام سے متصادم کہنا بظاہر مشکل ہے، لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ کفایتی مقدار یا گزارے کی مقدار کی زمین کو مزید تقسیم کرنے سے واقعۃ "ضرر" لاحق ہوتا ہے یا نہیں؟ اور یہ ضرر کس درجے کا ہے؟ اس موضوع پر ہمیں ان اپیلوں کی سماعت کے دوران خاطر خواہ معاونت نہیں مل سکی، اس لئے فی الحال اس حصے کے حتمی فیصلے کو موخر کیا جاتا ہے۔

۱۶۳۔ مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ کے پیراگراف نمبر ۲۴ کی مختلف شقوں کے احکام کا خلاصہ یہ

کہ زمین کا کوئی بھی ایسا انتقال (خواہ بیع کے ذریعے ہو یا ہبہ کے ذریعے) قانوناً ممنوع ہو گا، جس کے نتیجے میں کسی ایک شخص کی مقبوضہ زمین کفایتی مقدار (Economic Holding) سے کم رہ جائے۔ یا اگر وہ پہلے ہی کفایتی مقدار سے کم ہو تو گزارے کی مقدار (Subsistemce Holding) سے کم رہ جائے۔

اپیل کنندہ نے اس پیراگراف کو بھی اسی بنیاد پر چیلنج کیا ہے کہ یہ حقوق ملکیت میں حکومت کی بیجا مداخلت ہے، جو قرآن و سنت کے احکام کے خلاف ہے۔

۱۶۴۔ دراصل اس پیراگراف کے احکام کا مقصد بھی وہی ہے جو تقسیم پر پابندی عائد کرنا مقصود معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ اسی پیراگراف میں یہ صراحت موجود ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی زمین فروخت کرنا چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے، تاہم اس کا لازمی تقاضہ یہ بھی ہونا چاہئے کہ اگر کوئی شخص اپنی زمین کے کسی حصے کی بیع اس طرح کرنا چاہے کہ خریدار اور وہ زمین کے مشترک مالک بن جائیں، اور زمین الگ الگ تقسیم نہ ہو تو اس پر بھی کوئی پابندی نہ ہو، لیکن اس پیراگراف کے تحت قانوناً جائز نہیں ہو گی، جس سے زمین بائع اور خریدار کے درمیان تقسیم ہوئے بغیر مشترک ہو جائے، جس کو اسلامی فقہ میں مشاع کہا جاتا ہے، اور یہ بات بالکل درست ہے کہ اس قسم کی بیع پر پابندی عائد کرنے کا جواز نہیں ہے، اس لئے کہ زمینوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹنے کی جس خرابی کا انسداد مقصود ہے، وہ اس صورت میں پیدا نہیں ہوتی، ظاہر ہے کہ میراث کے احکام کے ذریعے ایک چھوٹی سے چھوٹی زمین میں بھی مزید حصہ دار پیدا ہو سکتے ہیں، اور ان مزید حصہ داروں کے شریک ہونے میں زیر نظر قانون کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا، تاوقتیکہ زمین ان کی مشترک ملکیت رہے، لہٰذا اگر زمین کی فروخت کے نتیجے میں مزید حصہ دار پیدا ہو جائیں، تو اس میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے، تاوقتیکہ بیچنے والا اور خریدار دونوں زمین کے مشترک مالک رہیں، اور آپس میں اسے تقسیم نہ کریں۔

۱۶۵۔ اگر ایک چھوٹی زمین کے مالک کو اپنے لئے کچھ رقم کی ضرورت ہے، اور وہ اپنی پوری زمین اس لئے بیچنا نہیں چاہتا کہ اس طرح وہ اپنے ذریعہ معاش سے محروم ہو جائے گا، اور اپنی وہ ضرورت زمین کا ایک حصہ بیچ کر پوری کر سکتا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کو ایسا کرنے سے روکا

لیکن امام ابن حبان انہیں ثقات میں شمار کرتے ہیں، ابن عیینہ ان کی تعریف کرتے ہیں، اور ابن ابی حاتم ان پر کوئی جرح نہیں کرتے۔

(لسان المیزان ص ۱۸۹ ج ۳)

جائے، قرآن و سنت کی رو سے مالک کو اپنی ہر ملکیت کلی یا جزوی دونوں طریقے سے بیچنے کا پورا اختیار ہے، لہٰذا پیراگراف کا وہ حصہ جو ایسی بیع سے منع کرتا ہو، بظاہر قرآن و سنت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

۱۶۶۔ لیکن ریگولیشن کے پیراگراف نمبر ۲۲ میں تقسیم پر جو پابندی عائد کی گئی ہے، اس کے معاملے میں حتمی فیصلے کو فی الحال ملتوی رکھا گیا ہے، اور اس پیراگراف کا اس مسئلے سے گہرا تعلق ہے، نیز اس سلسلے میں وفاقی شرعی عدالت کا ایک اور تازہ فیصلہ حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے، مناسب ہے کہ اس پر بھی غور کر لیا جائے، اس لئے اس نکتے پر بھی حتمی فیصلے کو موخر رکھا جاتا ہے۔

مزارعت ختم کرنے پر پابندی

۱۶۷۔ اپیل کنندہ نے مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ کے پیراگراف ۲۵ کو بھی چیلنج کیا ہے، اس پیرا گراف میں کہا گیا ہے کہ کوئی مالک زمین کسی مزارع یا کرایہ دار سے زمین خالی نہیں کرا سکتا، الا یہ کہ وہ مزارعت کی شرائط کے مطابق کرایہ ادا نہ کرتا ہو، یا زمین کو اس انداز میں استعمال کرتا ہو، جس سے اس کا مقصد فوت ہو جائے، یا اس ریگولیشن کے مطابق اس پر کوئی سزا عائد ہو گئی ہو، یا وہ زمین کو طے شدہ یا رواجی شرائط کے مطابق کاشت نہ کر سکتا ہو، یا اس نے زمین کسی اور کو ذیلی مزارعت پر دیدی ہو۔

۱۶۸۔ اپیل کنندہ کا اعتراض یہ ہے کہ مالک زمین اور مزارع کے درمیان جب کوئی معاہدہ ہو جائے تو اس معاہدہ کے مطابق مالک کو انخلاء کا حق ہونا چاہئے، اور یہ حکم دے دینا کہ جب کسی زمین میں کوئی مزارع ایک مرتبہ کام شروع کر دے تو مالک اس کے ساتھ مزارعت کے معاملے کو کسی بھی حال میں ختم نہ کر سکے، یہ حقوق ملکیت میں ایسی دخل اندازی ہے جو شریعت کے خلاف ہے۔

۱۶۹۔ میں اس فیصلے کے پیراگراف ۱۰ سے پیراگراف ۳۰ تک قرآن و سنت کے وہ دلائل ذکر کر چکا ہوں جن کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ملکیت کے معاملے میں زمین اور دوسری اشیاء کے درمیان کوئی فرق نہیں، اور جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ زمین شخصی ملکیت میں آ سکتی ہے، تو اس کا منطقی نتیجہ یہی ہے کہ کوئی دوسرا شخص اگر اسے استعمال کرے تو وہ مالک کے ساتھ کسی معاہدے کے تحت ہی ہونا چاہئے، چنانچہ مزارعت یا کرایہ دونوں وہ جائز عقود اور معاہدات (Centract) ہیں، جن کے تحت کوئی شخص کسی دوسرے کی زمین جائز طور پر استعمال کر سکتا ہے، اور معاہدات کے بارے میں قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے:

يا أيها الذين آمنوا أوفوا بالعقود

اے ایمان والو! معاہدات کو پورا کرو۔ (۱)

نیز ارشاد ہے:

وأوفوا بالعهد إن العهد كان مسئولاً

عہد کو پورا کرو، بلاشبہ عہد کے بارے میں (آخرت میں) سوال ہو گا۔ (۱)

کیونکہ مزارعت بھی ایک معاہدہ ہے، لہٰذا ان آیات کی روشنی میں اس کا شرائط معاہدہ کے تابع ہونا ضروری ہو گا، چنانچہ اگر مزارعت کے وقت اس معاہدہ کے جاری رہنے کے لئے فریقین کے درمیان کوئی مدت طے کر لی گئی ہو، تو اس مدت کے ختم ہونے پر معاہدہ کا ختم ہو جانا مذکورہ آیتوں کا لازمی تقاضہ ہے، جب کہ زیر نظر قانون اس کے برخلاف یہ حکم دیتا ہے کہ فریقین کے درمیان خواہ کوئی مدت مقرر ہوئی ہو، مزارعت کا معاہدہ مالک زمین کی طرف سے اس وقت تک ختم نہیں کیا جا سکتا جب تک ان پانچ حالتوں میں سے کوئی حالت نہ پائی جائے جو ریگولیشن کے پیراگراف نمبر ۲۵ میں مذکور ہیں۔

۱۷۰۔ قرآن کریم کے بعد اگر احادیث کو دیکھا جائے تو ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مزارعت ایک معاہدہ ہے، اور اس کی مدت (Tenure) معاہدے کے شروع میں فریقین کی رضامندی سے طے کی جائے گی، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہودیوں سے مزارعت کا جو معاملہ فرمایا تھا، اس میں یہ صراحت موجود تھی کہ ان کو مزارعت پر اس وقت تک باقی رکھا جائے گا جب تک ہم چاہیں، چنانچہ صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں سے یہ معاملہ کرتے ہوئے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

نقركم على ذالك ما شئنا

ہم آپ لوگوں کو زمین پر اس وقت تک باقی رکھیں گے جب تک ہم چاہیں گے۔ (۲)

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا خلاصہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ صرف

---

(۱) سورۃ مائدہ۔ آیت ۱۔

(۱) سورۃ بنی اسرائیل۔ آیت: ۳۴۔

(۲) صحیح مسلم، باب المساقات۔

ایک سال کا معاہدہ ہوا تھا، اور ہر سال اس معاہدے کی تجدید کی جاتی تھی۔ (۱)
اسی معاہدے کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ آیا تو انہوں نے یہودیوں سے وہ زمینیں واپس لے لیں، اور اس موقع پر ایک خطبے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

یا أیہا الناس ! إن رسول اللہ ﷺ کان عامل یہود خیبر علی إنا نخرجھم إذا شئنا ۔ فمن کان لہ مال فلیلحق بہ ، و إنی مخرج الیہود ۔ فأخرجھم ۔

سنن ابو داؤد کے مطبوعہ اردو ترجمے میں یہ حدیث نمبر ۲۸۰۱ ہے، اور اس کا ترجمہ مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے:

اے لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہودیوں سے یہ معاملہ طے کیا تھا کہ جب چاہیں گے ہم ان کو نکال دیں گے، لہٰذا جس شخص کا جو مال ان کے پاس ہو وہ ان سے اپنا مال لے لے، کیونکہ میں یہودیوں کو نکالنے ہی والا ہوں۔

اس واقعہ سے یہ بات واضح ہے کہ مزارعت کا معاملہ معاہدے کی شرائط کے تابع ہوتا ہے، اور معاملے کے وقت جو شرائط طے کر لی گئی ہوں، فریقین پر اس کی پابندی لازم ہے، عہد رسالت اور عہد صحابہ میں مزارعت کے معاملے کا عام رواج تھا، یہاں تک کہ حضرت ابو جعفر محمد باقر رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

«ما بالمدینة أھل بیت ھجرة إلا یعطون أرضھم بالثلث و الربع .

مدینہ میں مہاجرین کا کوئی گھرانہ ایسا نہیں تھا جو اپنی زمین تھائی یا چوتھائی کی بٹائی پر نہ دیتا ہو۔ (۱)

ان تمام معاملات میں یہ بات مشترک نظر آتی ہے کہ مزارعت کو معاہدہ کی شرائط کے تابع قرار دیا جاتا تھا، اور یہ صورت کہیں نہیں تھی کہ کسی شخص کو زمین مزارعت پر دینے کے بعد مالک کو اس کے ساتھ مزارعت ختم کرنے کا حق باقی نہ رہے۔

۱۷۔ درحقیقت مزارعت کی مدت معاہدہ ختم ہونے کے بعد اگر کوئی شخص یک طرفہ طور پر زمین میں کاشت کرتا رہے، تو اسکا مطلب یہ ہے کہ وہ مالک کی مرضی کے بغیر اس کی ملکیت کو استعمال

---

(۱) صحیح مسلم، شرح نووی۔

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الخراج، باب حکم ارض خیبر، حدیث نمبر ۳۰۰۷۔

(۱) مصنف عبدالرزاق۔ ص ۱۰۰ ج ۸، حدیث نمبر ۱۴۴۷۶۔

کر رہا ہے۔ اور اس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد موجود ہے:

من زرع في أرض قوم بغير إذنه فليس له من الزرع شيئ ، وله نفقته.

جو شخص دوسرے لوگوں کی زمین ان کی اجازت کے بغیر کاشت کرے تو اس کے لئے کھیتی کا کوئی حصہ حلال نہیں، البتہ اس کے لئے اپنے خرچ (اور محنت) کے بقدر (کھیتی) حلال ہے۔ (۲)

اس کے علاوہ اس فیصلے کے پیراگراف نمبر ۶۸ سے ۸۴ تک وہ احادیث ذکر کی جاچکی ہیں، جن میں کسی دوسرے کے مال، بالخصوص زمین کو اس کی اجازت کے بغیر استعمال کرنے پر شدید وعیدیں مذکور ہیں۔ ان سے بھی یہی نتیجہ بر آمد ہوتا ہے۔

۱۷۲۔ انہی دلائل کی بناء پر فقہاء کرام نے مزارعت کی صحت کے لئے یہ شرط ضروری قرار دی ہے کہ مزارعت کا معاملہ کرتے وقت کس معین مدت کا بیان ضروری ہے۔ البتہ اگر کسی علاقے میں کسی خاص مدت کا ایسا رواج ہو کہ تمام زمینیں اسی مدت کے لئے کرایہ یا مزارعت پر دی جاتی ہوں، تو اس صورت میں مزارعت کی مدت بیان کئے بغیر بھی معاملہ درست ہو جاتا ہے۔ اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ زمین مروجہ مدت کے لئے مزارعت پر دی گئی، چنانچہ صاحب در مختار لکھتے ہیں:

في بلادنا تصح بلا بيان مدة ، ويقع على أول زرع واحد.

ہمارے علاقے میں مدت کا بیان کیئے بغیر بھی مزارعت درست ہو جاتی ہے، اور اس کو صرف ایک فصل کے لئے سمجھا جائے گا۔ (۱)

یہ موقف صرف فقہاء حنفیہ کا نہیں، بلکہ تمام فقہاء اسی کے قائل رہے ہیں، چنانچہ علامہ ابن منذر لکھتے ہیں:

وأجمع على أن اكتراء الأرض بالذهب والفضة وقتاً معلوماً جائز.

اور فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ زمین کو نقدی کے عوض ایک معین وقت کے لئے کرایہ پر لینا جائز ہے۔ (۲)

اور ڈاکٹر سعدی ابو حبیب لکھتے ہیں:

---

(۲) جامع الترمذی، ابواب الاحکام، باب نمبر ۲۹، حدیث نمبر ۱۳۷۸۔

(۲) کتاب الاجماع لابن المنذر، ص ۱۲۷، مسئلہ نمبر ۵۴۴۔

(۳) موسوعۃ الاجماع، ص ۹۹۶ ج ۲، طبع بیروت۔

(۱) الدر المختار مع رد المختار، ص ۱۹۳ ج ۵، مطبوعہ کوئٹہ۔

إن المزارعة على جزء شائع عما يخرج من الأرض كالثلث أو النصف أو السدس أو إلى جزء مسمى منصوبا من الجميع إلى مدة معروفة جائزة بالإجماع المتيقن المقطوع به.

بٹائی کا معاملہ اس طرح کرنا کہ زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار کا ایک متناسب (Proportionate) حصہ زمین کی اجرت کے طور پر مقرر کیا گیا ہو، مثلاً تھائی، آدھا یا چھٹا حصہ، یا کوئی بھی ایسا متعین حصہ جس کی نسبت مجموعی پیداوار سے ہو، اور معاملہ کی ایک مدت مقرر کی گئی ہو، باجماع یقینی طور پر جائز ہے۔ (۳)

اس پوری بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مزارعت قرآن و سنت کی رو سے ایک معاہدہ ہے، جس میں معاملے کی مدت کا بیان ضروری ہے، اور جب فریقین کے درمیان کوئی مدت مقرر ہو جائے تو فریقین پر اس کی پابندی لازم ہے، اور کسی فریق کو اس مدت سے زائد مزارعت کے معاملے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ کا پیراگراف ۲۵ شق ایک چونکہ ان احکام سے ٹکراتا ہے، لہٰذا اس کے معاملے میں اپیل کنندہ کی اپیل منظور کرتے ہوئے پیراگراف نمبر ۲۵ شق ایک کو مکمل طور پر قرآن و سنت کے متصادم قرار دیا جاتا ہے۔

ٹیکس اور بیج وغیرہ کے اخراجات

۱۷۳۔ مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ کے پیراگراف نمبر ۲۵ شق نمبر ۲ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ۱۹۷۲ء کی فصل خریف سے

(۱) زمین پر عائد ہونے والے تمام ٹیکس اور سرکاری واجبات زمیندار کے ذمہ ہوں گے۔

(۲) آبیانہ کی ادائیگی اور بیج فراہم کرنے کی ذمہ داری بھی زمیندار پر ہو گی۔

(۳) کھاد اور کیڑے مار ادویہ کے اخراجات زمیندار اور کاشت کار کے درمیان برابر تقسیم ہوں گے۔

اپیل کنندہ کو ان احکام پر بھی اعتراض ہے، اور اس کا موقف یہ ہے کہ اس معاملے میں مالک زمین کو مکمل اختیار ہونا چاہئے کہ وہ مزارعت کی جو شرائط چاہے، طے کر لے۔

۱۷۴۔ لیکن اپیل کنندہ کا یہ موقف قابل تسلیم نہیں، جیسا کہ پیچھے ذکر کیا جا چکا ہے، اسلام نے

زمین پر انفرادی ملکیت کو تسلیم تو کیا ہے، لیکن یہ ملکیت ہر حال میں شرعی احکام کے تابع اور اس کی پابند ہے۔ لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ معاہدہ کے شرائط طے کرنے میں مالک زمین مکمل طور پر خود مختار اور آزاد ہے۔

۱۷۵۔ جہاں تک زمین پر عائد ہونے والے ٹیکسوں اور سرکاری واجبات کا تعلق ہے، چونکہ ان کا تعلق زمین کی ملکیت سے ہے، اس لئے ان کو یا ان کے کسی حصے کو کاشت کار کے ذمے ڈالنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر انہیں کاشت کار کے ذمہ ڈالا جائے گا تو شرعاً ایسا کرنا جائز ہی نہ ہو گا۔ لہٰذا اگر قانون میں یہ ٹیکس صرف زمیندار پر عائد کئے گئے ہیں، اور اسے کاشت کار پر ڈالنے کی اجازت نہیں دی تو یہ شریعت کے عین مطابق ہے۔ اور اسے کسی بھی طرح قرآن و سنت سے متصادم نہیں کہا جا سکتا۔

۱۷۶۔ جہاں تک بیج کا تعلق ہے، اس کی ذمہ داری بھی زمیندار پر ڈالنے میں نہ صرف یہ کہ شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ بلکہ بعض فقہاء کرام کے نزدیک تو بیج کاشت کار کے ذمہ ڈالنا جائز ہی نہیں، چنانچہ علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

"ظاهر المذهب أن المزارعة إنما تصح إذا كان البذر من رب الأرض و العمل من العامل .... وهو مذهب ابن سيرين و الشافعي و إسحاق . لأنه عقد يشترك العامل و رب المال في نمائه . فوجب أن يكون رأس المال كله من عند أحدهما كالمساقات و المضاربة .

حنبلی مذہب کی ظاہر روایت یہ ہے کہ مزارعت اس صورت میں درست ہو سکتی ہے جب بیج زمین دار فراہم کرے۔ اور کاشت کار کی صرف محنت ہو۔ ...... یہی محمد بن سیرینؒ امام شافعیؒ اور امام اسحاقؒ کا مذہب ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ اس میں نفع حاصل کرنے کے لئے محنت کار اور مالک سرمایہ مل کر آپس میں شرکت کرتے ہیں۔ لہٰذا سرمایہ پورا کا پورا مالک کی طرف سے ہونا چاہئے۔ جیسا کہ مساقات اور مضاربت میں ہوتا ہے۔ (۱)

اگرچہ دوسرے فقہاء (جن میں فقہاء حنفیہ بھی داخل ہیں) یہ فرماتے ہیں کہ اگر فریق متفق ہوں تو بیج کی ذمہ داری کاشت کار پر بھی ڈالی جا سکتی ہے، لیکن ایسا کرنا کوئی ضروری نہیں۔ (۲)

---

(۱) المغنی لابن قدامہ۔ ص ۴۲۳ ج ۵۔ مطبوعہ ریاض۔ سعودی عرب۔

(۲) ردالمحتار۔ ص ۱۹۵ و ۱۹۶ ج ۵۔ مطبوعہ کوئٹہ۔

لہٰذا اگر قانون میں بیج فراہم کرنے کی ذمہ داری مالک زمین پر عائد کی ہے، تو اس میں کوئی ایسی بات نہیں جسے قرآن و سنت سے متصادم کہا جائے۔

۱۷۷۔ یہی معاملہ آبیانے کا بھی ہے، کہ کھیتی کو سیراب کرنے کا عمل اگرچہ کاشت کار کے ذمہ ہے، لیکن اس پر آنے والے اخراجات اگر زمیندار پر عائد کئے جائیں تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، چنانچہ بعض فقہاء نے فرمایا کہ:

فأما البقرة التي تدير الدولاب فقال أصحابنا: هي عمل رب المال، لأنها ليست من العمل.

وہ بیل جو رہٹ چلانے کے لئے استعمال کیا جائے، ہمارے فقہاء کا قول ہے کہ اس کا فراہم کرنا زمین دار کے ذمہ ہے، کیونکہ وہ عمل کا حصہ نہیں۔ (۱)

لہٰذا آبیانے کو زمیندار کے ذمہ قرار دینا بھی قرآن و سنت کے احکام سے متصادم نہیں۔

۱۷۸۔ جہاں تک کھاد اور کیڑے مار دواؤں کو نصف نصف تقسیم کرنے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں بھی قرآن و سنت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں، اور فقہاء کرام کی آراء اس میں مختلف ہیں، علامہ ابن قدامہؒ نے امام شافعیؒ کا قول بیان کیا ہے کہ:

"فأما تسمير الأرض بالذبل إن احتاجت إليه فشراء ذالك على رب المال لأنه ليس من العمل، فجرى مجرى ما يلحق به.

جہاں تک زمین میں گوبر وغیرہ کی کھاد ڈالنے کا تعلق ہے، اگر زمین کو اس کی ضرورت ہو تو اس کی خریداری کی ذمہ داری زمیندار پر ہو گی، کیونکہ وہ عمل کا حصہ نہیں، لہٰذا اس کا وہی حکم ہو گا جو جفتی کرنے کے آلات کا حکم ہوتا ہے۔ (۲)

لہٰذا اگر پوری کھاد اور پوری دواؤں کا خرچہ بھی زمیندار پر ڈالا جائے تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، اب جب کہ یہ اخراجات دونوں پر نصف نصف ڈالے گئے ہیں، تو بطریق اولیٰ یہ قانون قرآن و سنت سے متصادم نہیں، لہٰذا مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ کے پیراگراف نمبر ۲۵ شق نمبر ۲ کے بارے میں یہ اپیل مسترد کی جاتی ہے۔

---

(۱) المغنی لابن قدامہ، ص ۴۰۲ ج ۵۔

(۲) ایضاً، ص ۴۰۲ ج ۵۔

حق کاشت کاری کی وراثت

۱۷۹۔ شریعت اپیل نمبر۲۱ در ۱۹۸۴ء حکومت پنجاب کی طرف سے دائر کی گئی ہے، جس کا پس منظر یہ ہے کہ فیڈرل شریعت کورٹ نے دستور پاکستان کی دفعہ ۲۰۳۔ ڈی کے تحت خود اپنی تحریک پر پنجاب ٹیننسی ایکٹ ۱۸۸۷ء کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی دفعہ ۶۰۔ اے میں ایک ترمیم کا حکم دیا، اس فیصلے کے خلاف صوبائی حکومت پنجاب نے یہ اپیل دائر کی ہے۔

۱۸۰۔ پنجاب ٹیننسی ایکٹ کی دفعہ ۶۰۔ اے کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی کاشت کار نہ تو موروثی کاشت کار (Occupancy Trnant) ہو، اور نہ کسی ایسی زمین کا کاشت کار ہو جو زمیندار نے کسی مروجہ قانون کے تحت ذاتی کاشت کے لئے محفوظ رکھی ہو، اور نہ اس کی کاشت کاری کسی معاہدے یا کسی ہیئت مجاز کے فیصلے یا حکم کے تحت کسی معین مدت کے لئے ہو، اگر ایسا کاشت کار مر جائے، تو اس کا حق کاشت کاری اس کے مرنے کے بعد اس کے ترجیحی وارث (Preferred Heir) کی طرف منتقل ہو جائے گا اور اگر اس کا کوئی ترجیحی وارث نہ ہو تو اس کے سب سے بڑے بیٹے کی طرف۔

۱۸۱۔ فیڈرل شریعت کورٹ نے اپنے فیصلے میں یہ ہدایت دی ہے کہ اگر کاشت کار مسلمان ہو تو ترجیحی وارث یا بیٹے کے بجائے یہاں حق کاشت کاری کاشت کار کے شخصی قانون کے مطابق اس کے تمام ورثاء کی طرف منتقل کرنے کا اثر رکھتی ہو۔

۱۸۲۔ اپیل کنندہ نے اپنی وجوہات اپیل میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حق کاشت کاری اسلام کی رو سے قابل وراثت نہیں ہے، لہٰذا اس کو تمام ورثاء کی طرف منتقل کرنے کا حکم دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔

۱۸۳۔ میں اپیل کنندہ کے اس موقف سے اتفاق کرتا ہوں، اوپر شریعت اپیل نمبر۴ در ۱۹۸۱ء کا تصفیہ کرتے ہوئے قرآن و سنت کے دلائل سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ مزارعت یا کاشتکاری ایک معاہدہ ہے، جو فریقین کی رضامندی سے وجود میں آتا ہے، اور معاہدہ کے شرائط کے تابع ہوتا ہے، لہٰذا کسی بھی حالت میں ایک فریق کو اس معاہدے کے باقی رکھنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، اور چونکہ عام معاہدات کا حال یہ ہے کہ وہ فریقین میں سے کسی ایک کی موت پر ختم ہو جاتے ہیں، الا یہ کہ معاہدے ہی میں اس کے خلاف کوئی صراحت موجود ہو، اس لئے حق کاشتکاری کوئی ایسی جائیداد نہیں ہے جو قابل وراثت ہو، اپیل کنندہ نے وجوہات اپیل کے ساتھ جو تحریری بیان داخل کیا ہے، اس میں اسلامی احکام کے جو حوالے دیئے گئے ہیں، ان سے بلاشبہ یہی ثابت ہوتا ہے۔

۱۸۴۔ فاضل وفاقی شرعی عدالت نے اپنے فیصلے میں حق کاشتکاری کو قابل وراثت قرار دینے کے لئے جس بات پر انحصار کیا ہے، وہ یہ ہے کہ رائج الوقت قوانین کے تحت جن میں مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ اور (Punjab Protection And Restoration of Tenancy Right 1950) داخل ہیں، یہ حکم دیا گیا ہے کہ کسی کاشت کار کو کسی زمین سے اس وقت تک بے دخل نہیں کیا جا سکے گا، جب تک ان بنیادوں میں سے کوئی بنیاد نہ پائی جائے جو ان قوانین میں درج ہیں، فاضل وفاقی شرعی عدالت کا کہنا یہ ہے کہ ان قوانین کی موجودگی میں اب کاشتکار کا حق ایک دائمی حق بن گیا ہے، جو کاشتکار کی موت پر ختم نہیں ہوتا، لہٰذا اس کو قابل وراثت ہونا چاہئے۔

۱۸۵۔ لیکن شریعت اپیل نمبر۴ در ۱۹۸۱ء کا تصفیہ کرتے ہوئے قرآن و سنت کے دلائل کی رو سے میں یہ قرار دے چکا ہوں کہ مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ کا پیراگراف ۲۵۔ اے جو کاشتکاری کو علی الاطلاق ایک دائمی حق قرار دیتا ہے، قرآن و سنت کے احکام سے متصادم ہے، لہٰذا جس بنیاد پر فاضل وفاقی شرعی عدالت نے حق کاشتکاری کو قابل وراثت قرار دیا، اس کے منہدم ہو جانے کے بعد فاضل وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے لئے کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی۔

۱۸۶۔ لیکن جب ایک مرتبہ یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ حق کاشتکاری قابل وراثت نہیں ہے بلکہ معاہدے کی شرائط کے تابع ہے، اور خود اپیل کنندہ نے اپنی اپیل میں اسی موقف پر زور دیا ہے، اور اس کے دلائل فراہم کئے ہیں، تو جس طرح حق کاشتکاری کا ورثاء کی طرف منتقل ہونا غلط قرار پاتا ہے، اسی طرح ترجیحی وارث یا سب سے بڑے بیٹے کی طرف منتقل ہونا بھی قرآن و سنت کے احکام کی رو سے درست نہیں، کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ مالک کی مرضی کے بغیر کسی خاص شخص کے ساتھ مزارعت کا معاہدہ جبری طور پر عمل میں لایا گیا ہے، اور اس فیصلے کے پیراگراف نمبر ۶۵ سے ۸۴ تک جو احادیث نقل کی گئی ہیں، وہ اس کے ناجائز ہونے پر دلالت کرتی ہیں، نیز حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث:

من زرع في أرض قوم بغير إذنهم فليس له من الزرع شيئ وله نفقته.

جو شخص دوسروں کی زمین میں اس کی اجازت کے بغیر کاشت کرے، اس کے لئے کھیتی کا کوئی حصہ حلال نہیں، ہاں اس کا کیا ہوا خرچ اس کا حق ہے۔ (۱)

یہ حدیث بھی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مالک کی اجازت کے بغیر کوئی شخص جبراً کسی کی

(۱) جامع الترمذی، ابواب الاحکام، باب نمبر ۲۹، حدیث نمبر ۱۳۷۸۔

زمین کا کاشت کار نہیں بن سکتا۔

اور یہ تمام احکام در حقیقت اس اصول پر مبنی ہیں، جو قرآن کریم کی اس آیت میں ارشاد فرمایا گیا:

یا أیہا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارۃ عن تراض منکم۔

اس اصول کے مزید دلائل اس فیصلے کے پیراگراف نمبر ۱۲۲ میں تفصیل کے ساتھ ذکر کئے جا چکے ہیں، لہٰذا اپیل کنندہ نے اپنی وجوہات اپیل میں جو موقف اختیار کیا ہے کہ حق کاشتکاری قابل وراثت نہیں ہے، بلکہ کاشت کار کی موت پر ختم ہو جاتا ہے، اسی کا منطقی تقاضہ یہ ہے کہ کاشتکار کی موت کے بعد کاشتکاری کسی بھی شخص کی طرف جبراً منتقل نہ کی جائے، لہٰذا پنجاب ٹیننسی ایکٹ ۱۸۸۷ء کی دفعہ ۶۰۔ اے جو یہ حق ترجیحی وارث یا بڑے بیٹے کی طرف منتقل کرتی ہے، مذکورہ بالا اصول کے تحت پوری کی پوری قرآن و سنت سے متصادم ہے۔

۱۸۷۔ اگرچہ عوام الناس کی طرف سے کوئی ایسی اپیل ہمارے سامنے نہیں ہے، جو مذکورہ ایکٹ کی دفعہ ۶۰۔ اے کو قرآن و سنت سے متصادم بنا دینے کا مطالبہ کر رہی ہو، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حق کاشتکاری کے ناقابل وراثت ہونے کا معاملہ دفعہ ۶۰۔ اے کی شرعی حیثیت سے اس قدر پیوستہ ہے کہ ہمارے سامنے صوبائی حکومت پنجاب کی جو اپیل زیر سماعت ہے، قرآن و سنت کی روشنی میں اس کا ٹھیک ٹھیک تصفیہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ دفعہ ۶۰۔ اے کے احکام کو اسکے مجموعی تناظر (Perspective) میں دیکھ کر اس کے بارے میں قرآن و سنت کے احکام کا صحیح منشا تلاش نہ کیا جائے، چنانچہ میرے نزدیک اس اپیل کا تصفیہ کرتے ہوئے دفعہ ۶۰۔ اے کی مجموعی شرعی حیثیت کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ دینا اپنے حدود اختیار سے تجاوز نہیں، لہٰذا پنجاب ٹیننسی ایکٹ ۱۸۸۷ء کی دفعہ ۶۰۔ اے کو قرآن و سنت سے متصادم قرار دیا جاتا ہے۔

زیر نظر قوانین کے بارے میں فیصلے کا خلاصہ

۱۸۸۔ اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ (لینڈ ریفارمز ریگولیشن ۱۹۷۲ء) کی دفعہ ۸، ۹ میں ملکیت کی حد نہری زمین میں ۱۵۰ ایکڑ، اور بارانی زمین میں ۳۰۰ ایکڑ یا بارہ ہزار پیداواری یونٹ (جو بھی زیادہ ہو) مقرر کی گئی تھی، اور اسی دفعہ کی شق (۲) سے واضح ہے کہ اس تحدید کا مقصد یہ ہے کہ اس

سے زیادہ زمین مالک سے بلامعاوضہ لے لی جائے ـــــ دفعہ ۱۰ میں سرکاری ملازمین کے لئے ۱۰۰ ایکڑ کی حد اسی لئے مقرر کی گئی ہے، اور دفعہ ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶ اور ۱۷ میں مذکورہ حد سے زائد ہر زمین کو سرکاری ملکیت قرار دیا گیا ہے، اور دفعہ ۱۸، ۱۹، ۲۰ اور ۲۱ میں اس طرح لی ہوئی زمینوں کو استعمال کرنے کے طریقے متعین کئے گئے ہیں۔

اسی ریگولیشن کی دفعہ ۷ میں زمینوں کے ایسے انتقالات پر پابندی عائد کی گئی ہے جن کے ذریعہ تحدید ملکیت کے احکام سے فرار اختیار کیا جا سکتا ہو، اس دفعہ کا مقصد بھی بلامعاوضہ زمینوں کے حصول کی رکاوٹوں کو دور کرنا ہے۔

جو بحث اوپر کی گئی ہے، اس کی روشنی میں کسی کی جائز ملکیت ۰۰۰۰۰۰ پر بلامعاوضہ قبضہ کرنا متعدد آیات قرآنی اور بہت سی احادیث کے صریحا مخالف ہے، اور چونکہ ان دفعات سے ان آیات واحادیث کی خلاف ورزی ہوتی ہے، لہٰذا ان تمام دفعات کو قرآن و سنت سے متصادم قرار دیا جاتا ہے۔

(۲) نیز اسی ریگولیشن کی دفعہ ۲۵ ذیل دفعہ ایک میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ کوئی زمیندار چند مخصوص صورتوں کے سوا کسی بھی حالت میں اپنے مزارع کا انخلاء نہیں کر سکتا۔

اوپر کی بحث کی روشنی میں قرآن و سنت کے دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ مزارعت کی مدت (Tenure) فریقین کے باہمی معاہدے کے تابع ہوتی ہے، لہٰذا اس ریگولیشن کی دفعہ ۲۵ ذیلی دفعہ ایک کو بھی قرآن و سنت کے احکام سے متصادم قرار دیا جاتا ہے۔

البتہ اس ریگولیشن کی دفعہ ۲۲ میں تقسیم اراضی پر جو پابندی عائد کی گئی ہے، اور دفعہ ۲۴ میں اس غرض کے لئے انتقال پر جو پابندی عائد کی گئی ہے، اس کے بارے میں فیصلہ محفوظ رکھا جاتا ہے، اور دفعہ ۲۵ ذیلی دفعہ ۲ میں زمیندار پر جو ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں، ان کے بارے میں یہ قرار دیا جاتا ہے کہ وہ قرآن و سنت کے احکام سے متصادم نہیں ہیں۔

(۳) اسی طرح پنجاب ٹیننسی ایکٹ ۱۸۸۷ء کی دفعہ ۶۰۔ اے کے بارے میں یہ قرار دیا جاتا ہے کہ وہ اس لحاظ سے قرآن و سنت کے احکام سے متصادم ہے کہ اس میں کاشتکار کی موت کے بعد جب کاشتکاری اس کے ترجیحی وارث (Preferred heir) یا اس کی غیر موجودگی میں اس کے بڑے بیٹے کی طرف منتقل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جب کہ حق کاشتکاری وراثت میں کسی کو منتقل نہیں ہو سکتا۔

(۴) لینڈ ریفارمز ایکٹ ۱۹۷۷ء کی دفعہ ۳ کے ذریعہ زمین کی ملکیت کی حد مزید گھٹا کر نہری زمین میں ۱۰۰ ایکڑ اور بارانی زمین میں ۲۰۰ ایکڑ (یا آٹھ ہزار پیداواری یونٹ) کر دی گئی ہے، دفعہ

۴، ۵ اور ۶ کے ذریعے اسی تحدید ملکیت کے مقاصد حاصل کرنے کے لئے زمینوں کی تقسیم اور انتقالات پر مختلف پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ دفعہ ۹ کے ذریعے یہ حکم دیا گیا ہے کہ یوم آغاز قانون سے چار ماہ کے اندر یہ زمینیں حکومت کے حوالے کر دی جائیں، جو ان کی مالک تصور ہو گی۔ پھر دفعہ ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ میں حکومت کی طرف سے دفعہ ۹ کے تحت لی گئی زمینوں کا معاوضہ ادا کرنے کے احکام دیئے گئے ہیں۔ اور دفعہ ۱۵، ۱۶ اور ۱۷ میں اس طرح حاصل کی گئی زمینوں کے استعمال کے متعلق قوانین بنائے گئے ہیں۔

۱۸۹۔ مذکورہ بالا بحث میں واضح کیا جا چکا ہے کہ کسی شخص کی جائز ملکیت کو زبردستی معاوضہ دے کر لینا صرف "ضرورت" اور "عمومی حاجت" کے تحت جائز ہے، جس کی شرائط بیان ہو چکی ہیں۔ ان شرائط میں سے تین شرطیں یہ ہیں:

(الف) "ضرورت" اور "عمومی حاجت" کو دور کرنے کا اس جبری خریداری کے سوا کوئی راستہ نہ ہو، اور یہ فیصلہ تمام ممکنہ متبادل طریقوں پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد کیا گیا ہو۔ للذا محض مفاد عامہ (Public Interest) کی مجمل بنیاد کافی نہیں، جب تک "ضرورت" یا "عمومی حاجت" کا تیقن نہ ہو چکا ہو۔

زیر نظر قانون میں یہ شرط اس لئے مفقود ہے کہ، جیسا کہ اس قانون کی تمہید (Preamble) میں کہا گیا ہے، اس کا مقصد "زیادہ منصفانہ تقسیم دولت" ہے، حالانکہ "زیادہ منصفانہ تقسیم دولت" اور بیجا ارتکاز دولت کے انسداد کے لئے اسلام نے جو طریقے اختیار کئے ہیں، اور جن کا ذکر اس فیصلے میں ہو چکا ہے، ان کو اختیار کئے بغیر یہ قدم اٹھایا گیا ہے۔ جب "زیادہ منصفانہ تقسیم دولت" کے متبادل طریقے موجود ہیں تو وہ "ضرورت" یا "عمومی حاجت" نہیں پائی گئی جو جبری خریداری کے جواز کی لازمی شرط ہے۔

(ب) جبری خریداری کے جواز کی دوسری شرط یہ ہے کہ اس کا معاوضہ بازاری نرخ (Market value) کے مطابق ادا کیا جائے، جب کہ مذکورہ قانون کی دفعہ ۱۱ میں ہر پیداواری یونٹ کا معاوضہ ۳۰ روپے مقرر کیا گیا ہے، خواہ اس کا بازاری نرخ کچھ بھی ہو، اور دفعہ ۱۲ میں زمین پر پائی جانے والی تنصیبات (Installations) کی وہ قیمت لگائی گئی ہے، جو ان کی اصل لاگت (Cost) کے برابر ہو، خواہ ان کی موجودہ بازاری قیمت کتنی بڑھ چکی ہو۔

(ج) جبری خریداری کی تیسری شرط یہ تھی کہ معاوضہ یا تو قبضے سے پہلے یا اس کے ساتھ ساتھ ادا کر دیا جائے، یا اتنی دیر میں کہ اسے قابل ذکر تاخیر نہ سمجھا جاتا ہو، لیکن دفعہ نمبر ۱۳ کے تحت یہ ادائیگی سودی بانڈز کے ذریعے کرنے کا حکم لیا گیا ہے۔

ان وجوہ سے اس ایکٹ کی مذکورہ بالا دفعات کو بھی قرآن و سنت سے متصادم قرار دیا جاتا ہے۔

نتائج

۱۹۰۔ مذکورہ بالا تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ مندرجہ ذیل قوانین کو قرآن و سنت سے متصادم قرار دیا جاتا ہے:

(۱) لینڈ ریفارمز ریگولیشن ۱۹۷۲ء (مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵) کی دفعات ۷، ۸، ۹اور دفعات ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰اور ۲۱، نیز دفعہ ۲۵ کی ذیلی دفعہ نمبر ایک۔

(۲) لینڈ ریفارمز ایکٹ ۱۹۷۷ء کی دفعہ ۳، ۴، ۵، ۶ دفعہ ۹، دفعہ ۱۱، ۱۲، ۱۳اور دفعہ ۱۵، ۱۶ اور ۱۷۔

(۳) دی پنجاب ٹیننسی ایکٹ نمبر ۱۶۔ در۔ ۱۹۸۷ء کی دفعہ ۶۰۔ اے ان تصریحات کے ساتھ شریعت اپیل نمبر ایک ۱۹۸۱ء اپیل نمبر ۳، ۸، ۹، ۱۰۔ ۱۹۸۱ء اور اپیل نمبر ایک ۱۹۸۷ء منظور کی جاتی ہیں اور اپیل نمبر ۴۔ در۔ ۱۹۸۱ء اور اپیل نمبر ۲۱۔ در۔ ۱۹۸۴ء کو جزوی طور پر منظور کیا جاتا ہے۔

اپیل نمبر ایک، ۱۹۸۱ء میں اپیل کنندہ چونکہ ایک وقف ہے، اس لئے اس کے اخراجات مقدمہ مسئول الیہ وفاقی حکومت ادا کرے گی، باقی اپیلوں کے اخراجات کے بارے میں کوئی حکم نہیں دیا جا رہا۔

(محمد افضل ظلہ)
چیئرمین

(محمد تقی عثمانی)
ممبر

(نسیم حسن شاہ)
ممبر

(شفیع الرحمٰن)
ممبر

(پیر محمد کرم شاہ)
ممبر

(اشاعت کے لئے منظور ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضمیمہ

ملکیت زمین پر کچھ شبہات اور ان کا جواب

ملکیت زمین کا مسئلہ تشنہ رہے گا، اگر یہاں بعض ان "دلائل" یا شبہات پر گفتگو نہ کی جائے جو ہمارے دور کے بعض اہل قلم نے یہ ثابت کرنے کے لئے پیش کیے ہیں کہ زمین انفرادی ملکیت کے تحت نہیں آ سکتی۔ چنانچہ یہ شبہات اور ان کے جوابات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:۔

۱۔ زمین اللہ کی ہے

ملکیت زمین کی نفی کے لئے آجکل قرآن کریم کی جو آیت سب سے پہلے خاصے زور و شور کے ساتھ پیش کی جاتی ہے، وہ سورۂ اعراف کی یہ آیت ہے:

ان الأرض لله يورثها من يشاء من عباده

بلاشبہ زمین اللہ کی ہے۔ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے، اس کو وارث بنا دیتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب زمین اللہ کی ملکیت ہے تو وہ کسی شخص کی انفرادی ملکیت میں نہیں آ سکتی اور جس طرح ایک وقف اللہ کی ملکیت ہونے کی وجہ سے کسی کی ذاتی ملکیت نہیں بن سکتا، اسی طرح زمین بھی کسی کی شخصی جائیداد نہیں بن سکتی۔

ہم نے تصور ملکیت کے بارے میں قرآن کریم کے جو ارشادات پیچھے ذکر کیے ہیں ان کو غیر جانب داری اور انصاف کے ساتھ دیکھ لیا جائے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اس دلیل میں کوئی ادنیٰ

---

(۱) الاعراف ۷: ۱۲۸۔

وزن نہیں ہے۔ جس کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) جس طرح زمین کے بارے میں قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ وہ اللہ کی ہے، اسی طرح زمین و آسمان کی ہر چیز کے بارے میں بالکل یہی الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں، بلکہ ایسی آیات کی تعداد کہیں زیادہ ہے جن میں زمین و آسمان میں پائی جانے والی ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کی ملکیت قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وللہ ما فی السموات وما فی الأرض.

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔

بلکہ پہلی آیت میں تو صرف یہ کہا گیا تھا کہ "زمین اللہ کی ہے"، لیکن اس آیت میں کہا گیا ہے کہ "اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے"۔ یعنی اس میں ملکیت کو اللہ تعالیٰ کی ذات میں منحصر کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اگر پہلی آیت کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ زمین "اللہ کی ملکیت" ہونے کی وجہ سے کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں آ سکتی، تو دوسری آیت میں زیادہ قوت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آسمان و زمین کی کوئی چیز (بشمول اشیائے صرف) "اللہ ہی کی ملکیت" ہونے کی وجہ سے کسی بھی انسان کی ذاتی ملکیت نہیں بن سکتی، پھر زمین کی کیا خصوصیت ہے؟ روٹی کپڑے سے لے کر فرنیچر اور دوسرے گھریلو ساز و سامان تک کسی بھی چیز پر کسی انسان کی انفرادی ملکیت ثابت نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ ان چیزوں کے بارے میں آج کوئی کٹر سے کٹر اشتراکی شخص بھی یہ نہیں کہتا کہ یہ ذاتی ملکیت میں نہیں آ سکتیں۔

اس سے صاف واضح ہو گیا کہ کسی چیز کا "اللہ کی ملکیت" یا "اللہ ہی کی ملکیت" ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیوی احکام کے لحاظ سے وہ کسی انسان کی انفرادی ملکیت نہیں بن سکتی، بلکہ اس سے ملکیت کے اسی بنیادی تصور کی طرف اشارہ ہے، کہ "حقیقی ملکیت" ہر چیز پر اللہ ہی کی ہے، وہ زمین ہو یا مکان، کھانا کپڑا ہو یا دوسرا ساز و سامان، ان سب چیزوں کا مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے، چنانچہ اس کو مکمل اختیار حاصل ہے کہ وہ جس کو چاہے، یہ چیزیں دے دے، جس سے چاہے، واپس لے لے، اور جس کسی کو دے، اس کو جن شرائط کا چاہے، پابند کر دے، لیکن اسی "حقیقی ملکیت" کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو خاص شرائط اور احکام کے ساتھ ان اشیاء پر ایک

---

(۲) یہ اور اس سے ملتے جلتے الفاظ قرآن مجید میں دسیوں جگہ پر مذکور ہیں۔ مثلاً البقرہ ۲:۱۰۷، آل عمران ۳:۱۰۹، نساء ۴:۱۲۶، ۱۳۱ و ۱۳۲، انعام ۶:۱۲، یونس ۱۰:۵۵ و ۶۶، الرعد ۱۳:۱۶، ابراہیم ۱۴:۲، النحل ۱۶:۵۲، طٰہٰ ۲۰:۶، الحج ۲۲:۶۴، النور ۲۴:۶۴، الروم ۳۰:۲۶، لقمان ۳۱:۲۶، سبا ۳۴:۱، الشوریٰ ۴۲:۴۔

"قانونی ملکیت" عطا فرمار کھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے قوانین و احکام کے لحاظ سے ایسے انسانوں کو ان چیزوں کا مالک سمجھا جائے گا. اور وہ شرعی احکام کے دائرے میں رہتے ہوئے ان اشیاء پر مالکانہ تصرف کے مجاز ہوں گے۔ اس معاملے میں زمین اور اشیائے صرف میں اللہ تعالیٰ نے کوئی فرق روا نہیں رکھا. بلکہ تمام اشیاء کو ایک ہی حکم میں قرار دیا ہے. جیسا کہ پچھلے باب میں قرآنی آیات کے حوالے سے تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاچکا ہے۔

(۲) آگے پیچھے کے الفاظ کو بالکل فراموش کر کے کوئی شخص عبارت کے صرف درمیانی ایک دو لفظ کو پکڑ کر بیٹھ جائے تو بات اور ہے. ورنہ سورۂ اعراف کی مذکورہ آیت کو اگر پورے سیاق و سباق کے ساتھ پڑھا جائے تو اس سے نہ صرف یہ کہ زمین پر شخصی ملکیت کی نفی نہیں ہوتی. بلکہ اس سے زمین کی ذاتی ملکیت کا ثبوت ملتا ہے۔ اس لئے کہ دراصل اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک مقولہ بیان کیا گیا ہے جو آپ نے فرعون کے ایک متکبرانہ جملے کے جواب میں اپنی قوم سے کہا تھا۔ پوری آیت اس طرح ہے:

قال: سنقتل أبناءهم و نستحيي نساءهم و إنا فوقهم قاهرون. قال موسى لقومه استعينوا بالله و اصبروا إن الأرض لله يورثها من عباده من يشاء.

> فرعون نے کہا کہ ہم ان بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کر ڈالیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے. اور ہم اور موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم اللہ سے مدد مانگو. ان پر (ہمیشہ) غالب رہیں گے۔ اور صبر کرو۔ بلاشبہ زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے. اس کو وارث بنا دیتا ہے (۱)

فرعون نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ ہمیشہ بنی اسرائیل پر بالا دست رہے گا. اور مصر کا مالک ہونے کی حیثیت سے ان کو اپنے قہر کا نشانہ بنائے رکھے گا۔ فرعون کے اس جابرانہ اعلان سے بنی اسرائیل کو طبعی طور پر جو تشویش لاحق ہوئی ہوگی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کا ازالہ کرنے کے لئے اپنی قوم سے فرمایا کہ فرعون سمجھتا ہے کہ مصر کی سرزمین کا مالک وہ ہے. حالانکہ پوری زمین پر حقیقی ملکیت اللہ کی ہے. وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے. اس کی ملکیت عطا کر دیتا ہے۔ اگر آج اس سے یہ ملکیت فرعون کو دے رکھی ہے تو کل بنی اسرائیل کو دے سکتا ہے۔ لہٰذا فرعون سے ڈرنے اور اس سے سہولت مانگنے کے بجائے اللہ سے مدد مانگو. اور صبر سے کام لو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اس زمین کا مالک بنا سکتا ہے۔

---

(۱) الاعراف ۷: ۱۲۸۔

اس سے صاف واضح ہے کہ یہاں زمین پر صرف اللہ تعالیٰ کی حقیقی ملکیت ہی کا بیان نہیں کیا گیا، بلکہ اس "قانونی ملکیت" کو بھی ساتھ ساتھ ذکر کر دیا گیا ہے جو حقیقی انسانوں کو عطا فرماتا ہے۔ اور اس کے لئے لفظ بھی "وارث بنانے" کا استعمال فرمایا گیا ہے کسی چیز کا "وارث" چونکہ اس کا مالک ہوتا ہے، اس لئے اس لفظ نے واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی ملکیت ہی کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں جس کو چاہتا ہے زمین کا مالک بنا دیتا ہے۔ زمین پر انسان کی قانونی ملکیت کی اس سے زیادہ وضاحت اور کیا ہوگی؟

۴۔ زمین مخلوق کے لئے

ایک اسی طرح کا استدلال سورۃ الرحمٰن کی ایک آیت سے بھی کیا جاتا ہے جس میں ارشاد ہے:

اور (اللہ نے) زمین کو مخلوق کے لئے پیدا کیا

کہاجاتا ہے کہ اس آیت کی رو سے زمین پوری مخلوق کے لئے پیدا کی گئی ہے، اور وہ انسانوں کی اجتماعی ملکیت ہے۔ زمین کے کسی حصے کا مالک بن کر دوسروں کو اس کے منافع سے نہیں روک سکتا۔

لیکن یہ "دلیل" پہلی دلیل سے بھی زیادہ کمزور، بلکہ بے بنیاد ہے، جس کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) اس آیت میں صرف یہ نہیں کہا گیا کہ زمین "انسانوں کے لئے پیدا کی گئی ہے" بلکہ فرمایا یہ گیا ہے کہ زمین "مخلوق کے لئے پیدا کی گئی ہے"۔ لہٰذا اس میں صرف انسان نہیں، بلکہ تمام چوپائے، مویشی، درندے اور ہر قسم کے حیوانات بھی داخل ہیں، مخلوق کے لئے قرآن کریم نے لفظ "الانام" استعمال فرمایا ہے، جس کے معنی کل مخلوق کے ہیں، اور اس میں وہ تمام مخلوقات شامل ہیں جن پر نیند طاری ہوتی ہے۔ عربی لغت کے مشہور عالم علامہ زبیدیؒ لکھتے ہیں:۔

وھو الخلق ۔ أو کل من لعتریہ النوم.

"انام" کے معنی مخلوق کے ہیں، یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ تمام مخلوقات جن پر نیند طاری ہوتی ہے۔ (۱)

---

(۱) تاج العروس، للزبیدی ص ۱۹۵ ج ۸

(۲) سورۃ البقرۃ ۲: ۲۹

لہٰذا اگر اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ زمین "انام" کی اجتماعی ملکیت ہے تو اس "اجتماعی ملکیت" میں تمام درندے، پرندے، حشرات الارض اور ہر طرح کے حیوانات بھی شریک ہیں پھر تو یہ کہنا چاہئے کہ انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ زمین کے کسی حصے کو صرف انسانوں کے لئے مخصوص کر کے اس میں جانوروں کا داخلہ منع کر دے۔

(۲) واقعہ یہ ہے کہ اس آیت میں ملکیت کا مسئلہ بیان نہیں کیا جا رہا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت و رحمت کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے یہ بتا رہے ہیں کہ ہم نے زمین تمہارے اور پوری مخلوق کے فائدے کے لئے پیدا کی ہے، اور اس سے مخلوقات کا ہر فرد اپنی ضرورت، صلاحیت اور استطاعت کے مطابق فائدہ اٹھاتا ہے، فائدہ اٹھانے کے طریقے مختلف ہیں۔ کوئی کسی قطعہ زمین کا مالک بن کر اس سے فائدہ اٹھا رہا ہے، کوئی کرایہ دار یا کاشتکار کی حیثیت میں فائدہ اٹھا رہا ہے، کوئی زمین پر چل کر فائدہ اٹھا رہا ہے، غرض مخلوق کا ہر فرد، خواہ وہ انسان ہو یا حیوان، کسی نہ کسی شکل میں زمین سے مستفید ہو رہا ہے۔

یہ ہے قرآن کریم کے سیاق و سباق کے مطابق آیت کا صحیح مطلب۔ یہاں اس مسئلے سے کوئی بحث نہیں کی جا رہی ہے کہ زمین پر کسی شخص کی قانونی ملکیت تسلیم کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اور نہ معقولیت کی کسی ادنیٰ مقدار کے ساتھ اس آیت میں اس "اجتماعی ملکیت" کا وہ تصور داخل کیا جا سکتا ہے جو عہد حاضر کے بعض اشتراکی مفکرین نے پیش کیا ہے۔

(۳) جس طرح زمین کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ وہ مخلوق کے لئے پیدا کی گئی ہے، اس طرح زمین میں پائی جانے والی تمام اشیاء کے بارے میں بھی یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ انسانوں کے فائدے کے لئے پیدا کی گئی ہیں چنانچہ ارشاد ہے:

هوالذی خلق لکم ما فی الأرض جمیعاً .

اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہارے لئے پیدا کیا جو کچھ زمین میں ہے۔

اس میں زمین میں پائی جانے والی ہر چیز کے لئے کہا گیا ہے کہ وہ انسانوں کے فائدے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ کیا کوئی شخص اس آیت کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہے کہ چونکہ زمین کی ہر چیز تمام انسانوں کے لئے بنائی گئی ہے۔ لہٰذا کوئی شخص زمین پر پائی جانے والی کسی چیز کا تنہا مالک نہیں ہو سکتا؟ ظاہر ہے کہ یہ بات کوئی کٹر سے کٹر اشتراکی بھی نہیں کہہ سکتا، کیونکہ اشیائے صرف اور ذاتی استعمال کی چیزوں پر انفرادی ملکیت کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے، اگر زمین پر پائی جانے والی اشیاء" کے بارے میں یہ بات

نہیں کی جا سکتی، اور یقیناً نہیں کی جا سکتی، تو زمین کے بارے میں وہی بات کیسے درست ہو سکتی ہے جب کہ قرآن کریم میں دونوں جگہ الفاظ ایک ہی جیسے استعمال ہوئے ہیں؟

۳۔ سواءً للسائلین

ایک اور استدلال زمین کی شخصی ملکیت کے خلاف، سورۂ حم السجدہ کی اس آیت سے کیا جاتا ہے:

قل أئنكم لتكفرون بالذى خلق الأرض فى يومين تجعلون له أندادًا ذلك رب العالمين و جعل فيها رواسى من فوقها و بارك فيها و قدر فيها أقواتها فى أربعة أيام سواءً للسائلين.

اس آیت کا ترجمہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے اس طرح فرمایا ہے:

> آپ (ان لوگوں سے) فرمائیے کہ کیا تم لوگ ایسے خدا کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو روز (کی مقدار وقت) میں پیدا کر دیا، اور تم اس کے شریک ٹھہراتے ہو، یہی (خدا جس کی قدرت معلوم ہوئی) سارے جہان کا رب ہے اور اس نے زمین کے اوپر پہاڑ بنا دیئے، اور اس (زمین) میں فائدے کی چیزیں رکھ دیں (جیسے نباتات و حیوانات وغیرہ) اور اس (زمین) میں اس (کے رہنے والوں) کی غذائیں تجویز کر دیں (... یعنی زمین میں ہر قسم کے غلے میوے پیدا کر دیئے، کہیں کچھ، کہیں کچھ جن کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ یہ سب) چار دن میں (ہوا) (دو دن میں زمین، دو دن میں پہاڑ وغیرہ، جو شمار میں) پورے ہیں پوچھنے والوں کے لئے (یعنی ان لوگوں کے لئے جو تخلیق کائنات کی کیفیت اور کمیت کے متعلق آپ سے سوالات کرتے ہیں)

اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ نے اس آیت کا ترجمہ یوں فرمایا ہے:

> "تو کہہ، کیا تم منکر ہو اس سے جس نے بنائی زمین دو دن میں، اور برابر کرتے ہو اس کے ساتھ اوروں کو، وہ ہے رب جہان کا۔ اور رکھے اس میں بھاری پہاڑ اوپر سے، اور برکت رکھی اس کے اندر اور ٹھہرائیں اس میں خوراکیں اس کی چار دن میں۔ پورا ہوا پوچھنے والوں کو"

(۱) حم السجدة: ۱۰۔

اور مولانا فتح محمد جالندھری صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے:

"کہو کیا تم اس سے انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا، اور (بتوں کو) اس کا مدمقابل بناتے ہو، وہی تو سارے جہان کا مالک ہے، اور اس نے زمین میں اسی کے اوپر پہاڑ بنائے، اور زمین میں برکت رکھی، اور اس میں سب سامان معیشت مقرر کیا۔ (سب) چار دن میں۔ (اور تمام) طلبگاروں کے لئے یکساں"۔

آیت کے یہ تراجم جو مختلف حضرات نے اپنے اپنے الفاظ میں فرمائے ہیں، اگر خالی الذہن ہو کر ان کو غیر جانب داری سے پڑھا جائے تو اس میں کہیں خوردبین لگا کر بھی یہ بات بر آمد نہیں کی جا سکتی کہ زمین پر کسی کی شخصی ملکیت ناجائز ہے۔ لیکن جو لوگ پہلے سے ایک تصور ذہن میں جما کر قرآن کریم کے الفاظ میں اس کو زبردستی داخل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ بعید سے بعید مفہوم بھی قرآن کریم کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ چنانچہ زمین کی شخصی ملکیت کی نفی کرنے والوں نے مولانا فتح محمد جالندھری صاحبؒ کے ترجمے کے آخری الفاظ اپنے موقف کی تائید کے لئے منتخب کر لئے، اور کہا کہ "طلبگاروں کے لئے یکساں" کا مطلب یہ ہے کہ زمین تمام انسانوں کے لئے یکساں ہے، یعنی وہ پوری انسانی برادری کی اجتماعی ملکیت ہے، اور کوئی شخص اس کا ذاتی طور پر مالک نہیں ہو سکتا۔

ان حضرات نے استدلال کے جوش میں اس بات پر بھی غور نہیں فرمایا کہ اگر بالفرض اسی آخری جملے کا وہی ترجمہ کیا جائے جو مولانا فتح محمد صاحب جالندھریؒ نے فرمایا ہے، اور اس ترجمے کا وہی مطلب لیا جائے جو یہ حضرات لے رہے ہیں (یعنی اجتماعی ملکیت) تو یہ جملہ آیت کے بالکل آخر میں آیا ہے، اور زمین کے تذکرے سے بہت دور ہے۔ اس سے متصل پہلے جس چیز کا ذکر ہے، وہ زمین نہیں، بلکہ زمین میں پیدا ہونے والا سامان معیشت، غلہ اور پھل وغیرہ ہے اور آخری جملہ اس طرح ہے کہ:

"اور اس (زمین) میں سب سامان معیشت مقرر کیا۔ (سب) چار دن میں۔ (اور تمام) طلب گاروں کے لئے یکساں"۔

لہٰذا اگر "طلبگاروں کے لئے یکساں" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اجتماعی ملکیت میں ہے تو اس کا زیادہ واضح تعلق اس "سامان معیشت" یعنی غلے اور پھل وغیرہ سے ہو گا جس کا ذکر چل رہا ہے۔ لہٰذا پھر تو یہ کہنا چاہئے کہ کوئی غلہ، کوئی پھل، کوئی میوہ کسی انسان کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتا، بلکہ وہ ہمیشہ اجتماعی ملکیت ہو گا، حالانکہ اشیائے صرف پر جن میں تقسیم کے بعد غلہ بھی شامل ہے، انفرادی ملکیت

سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ غور کیا جائے تو صرف یہی نکتہ اس "دلیل" کی تردید کے لئے کافی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ آیت ان یہودیوں کے سوال کے جواب میں نازل ہوئی تھی۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اور انہوں نے آپؐ سے پوچھا تھا کہ آسمان اور زمین کی تخلیق کس طرح ہوئی؟ چنانچہ اس آیت میں زمین اور اس کی مخلوقات کی مدت تخلیق چار دن بیان کر کے یہ فرمایا گیا کہ سواءً للسائلین۔ اب حضرت قتادہؒ اور سدیؒ جو قرون اول کے مشہور مفسرین میں سے ہیں، یہ فرماتے ہیں کہ اس جملے میں "سائلین" سے مراد وہ سوال کرنے والے ہیں جو زمین کی تخلیق کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنے آئے تھے، اور اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ تخلیق زمین کی جتنی تفصیل اس آیت میں بیان کی گئی ہے، وہ ان سوال کرنے والوں کے لئے بیان کی جارہی ہے، اور ان میں سے جو شخص بھی آپؐ سے اس سلسلے میں سوال کرنے آئے، ان سب کو یہی جواب دیئے کہ یہ تخلیق پورے پورے چار دن میں ہوئی۔ (۱) حضرت مولانا تھانویؒ حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی تفسیر کے مطابق اسی جملے کا ترجمہ یوں فرمایا ہے کہ:

"پورے ہیں پوچھنے والوں کے لئے"

یا:

"پورا ہوا پوچھنے والوں کو"

عربی گرامر کے قاعدے سے اس تفسیر کے مطابق "سواءً" کا تعلق "اربعۃ ایام" سے ہے یعنی "پورے پورے چار دن" اور للسائلین کا تعلق ایک محذف جملے سے ہے یعنی یہ بات پوچھنے والوں کے جواب میں بتائی جارہی ہے چنانچہ علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں: (۲)

وقيدت الأيام الأربعة بقوله تعالى: سواءً فإنه مصدر مؤكد لمضمر هو صفته لأيام أي استوت سواء .... و قوله تعالى للسائلين متعلق بمحذوف وقع خبراً لمبتد امحذوف. أي هذا الحصر في أربعة كائن للسائلين عن مدة خلق الأرض و ما فيها.

---

(۱) دیکھئے تفسیر ابن جریر طبریؒ ص ۹۴ و ۹۵ جزء ۲۴ جلد ۱۲ طبع دار الفکر. بیروت۔

(۲) روح المعانی ص ۱۰۱ و ۱۰۲ ج ۲۴۔

عربی قواعد اور محاورات کے اسلوب کے لحاظ سے آیت کی یہ تفسیر بلا تکلف صحیح ہے، چنانچہ مفسرین کی ایک بڑی جماعت نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

البتہ بعض حضرات مفسرین نے آیت کے ایک دوسرے معنی بھی بیان فرمائیے ہیں۔ اور وہ یہ کہ "سائلین" کے معنی "طلبگار" کے ہیں اور سواءً کے معنی "پورے پورے" کے ہیں۔ اور اس جملے کا تعلق "اقواتھا" سے ہے۔ اسی تفسیر کے مطابق مولانا فتح محمد جالندھری صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے آیت کے آخری حصے کا ترجمہ اس طرح فرمایا ہے کہ:

"اور اس (زمین) میں سب سامان معیشت مقرر کیا۔ (سب) چار دن میں۔
(اور تمام) طلبگاروں کے لئے یکساں"

یہاں "یکساں" کے معنی عربی محاورے کے مطابق پورے پورے کے ہیں آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں غذاؤں اور پھلوں وغیرہ کی شکل میں جو سامان معیشت مقرر فرمایا ہے وہ تمام حاجت مندوں کی ضرورت پورا کرنے میں یکساں ہے۔ یہ تفسیر حضرت جابر بن زیدؒ سے مروی ہے (۱) اور مشہور مفسر حافظ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ نے اس کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی ہے:

قال ابن زيد: معناه: وقدر فيها أقواتها فى أربعة أيام سواءً للسائلين أى على وفق مراد من له حاجة إلى رزق أو حاجة. فإن الله تعالى قدر له ما هو محتاج إليه وهذا القول يشبه ما ذكروه فى قوله تعالى: وآتاكم من كل ما سألتموه»

> جابر بن زیدؒ کہتے ہیں کہ آیت قرآنی وقدر فیہا ...... سواءً للسائلین کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں جو غذائیں پیدا فرمائیں وہ ان لوگوں کی حاجت کے مطابق پیدا فرمائیں جن کو رزق کی ضرورت ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اتنی مقدار پیدا فرمائی ہے جس کی ان کو ضرورت ہے اور اس تفسیر کے مطابق ان آیت کے معنی اس آیت کے مشابہ ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "اس نے تمہیں ہر وہ چیز دی جس کا تم نے سوال کیا"

چنانچہ آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں جو غذائیں پیدا فرمائیں، وہ کسی مستحکم منصوبے

---

(۱) تفسیر ابن جریر طبری ج ۲۴ ص ۹۷۔

(۲) تفسیر ابن کثیر ص ۹۴ ج ۴۔

کے بغیر پیدا نہیں فرما دیں، بلکہ اس حساب سے پیدا فرمائیں کہ انسانوں اور جانوروں میں سے جن جن کو جس رزق کی ضرورت تھی، وہ ان کی ضرورت کے مطابق پیدا فرمایا۔ چنانچہ زمین میں پائے جانے والے رزق سے اس کائنات کی تمام مخلوقات جن میں انسان اور جانور سب داخل ہیں اپنی اپنی ضرورتیں پوری کرتے ہیں، اور ہر ایک کو اپنی حاجت کے مطابق سامان ملتا ہے، اس سامان کے حصول کے طریقے مختلف ہیں، کوئی زمین میں کاشت کر کے اس کا پھل حاصل کرتا ہے، کوئی خرید کر حاصل کرتا ہے، کسی کو یہ چیزیں میراث یا تحفے کے طور پر مل جاتی ہیں، کسی کو صدقے یا زکوٰۃ کے طور پر ملتی ہیں، اور کوئی (یعنی جانور) چل پھر کر اور منہ مار کر اپنی ضروریات حاصل کرتا ہے، لیکن ملتی سب کو ہیں۔

عربی زبان میں "سواءً" کے معنی جہاں "برابر" کے آتے ہیں، وہاں "پورے پورے" کے بھی آتے ہیں۔ اور اس آیت میں وہی معنی مراد ہیں، یعنی یہ غذائیں تمام حاجت مندوں کے لئے ان کی مجموعی حاجتوں کے پورے پورے مطابق ہوتی ہیں، "برابر" کے معنی یہاں اول تو اس لئے نہیں ہو سکتے کہ اس صورت میں مطلب یہ ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جو غذائیں زمین میں پیدا فرمائی ہیں وہ تمام حاجت مندوں میں برابر تقسیم ہوتی ہیں۔ حالانکہ یہ بات مشاہدے کے بالکل خلاف ہے۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ زمین کی پیداوار کائنات کے تمام انسانوں اور جانوروں کے درمیان برابر تقسیم ہوئی ہو۔ یہاں تک کہ وہ خالص اشتراکی ممالک جنہوں نے "مساوات" کا دعویٰ بڑے زور و شور سے کیا تھا، ان میں بھی کبھی ایک دن کے لئے بھی ایسا نہیں ہوا کہ تمام انسانوں کو برابر غذا ملی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی طرف ایسی بات کی نسبت نہیں کی جا سکتی جو مشاہدے کے سراسر خلاف ہو۔

اس آیت میں "برابر" کے معنی مراد نہ لے سکنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت نے اس بات کی صراحتاً نفی فرما دی ہے کہ وسائل معاش تمام انسانوں میں برابر تقسیم ہوتے ہیں چنانچہ سورۂ زخرف میں ارشاد ہے:

نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیوۃ الدنیا ورفعنا بعضھم فوق بعض درجت لیتخذ بعضھم بعضا سخریا ورحمۃ ربك خیر مما یجمعون.

ہم نے ان کے درمیان دنیوی زندگی میں ان کے سامان معیشت کو تقسیم کیا ہے، اور ان میں بعض کو بعض دوسروں پر کئی درجے فوقیت دی ہے، تاکہ ان میں سے

---

(۱) الزخرف: ۳۲۔

ایک دوسرے سے کام لے سکے۔ اور آپ کے پروردگار کی رحمت اس چیز سے
کہیں بہتر ہے جو یہ لوگ جمع کرتے ہیں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے غیر مبہم الفاظ میں یہ بات واضح فرمادی ہے کہ معیشت کی تقسیم میں اس نے سب کو برابر دینے کا اہتمام نہیں فرمایا، بلکہ اپنی حکمت بالغہ سے اپنے بندوں کے درمیان مدارج قائم فرمائے ہیں، کسی کو کم دیا گیا ہے۔ کسی کو زیادہ۔ اور اس کی حکمت و مصلحت وہی جانتا ہے۔ جس نے انسان کو پیدا کیا، اور جو ان کی ضروریات۔ ان کے مزاج و مذاق، ان کی طبعی اور نفسیاتی کیفیات، غرض ہر چیز سے پوری طرح باخبر ہے۔ اور جب یہ بات سورۂ زخرف کی اس آیت میں غیر مبہم طریقے سے بیان فرمادی گئی تو "سواءً للسائلین" کا یہ مطلب کیسے ہو سکتا ہے کہ زمین کی پیداوار تمام انسانوں میں برابر برابر تقسیم کی گئی ہے؟

ایک اصولی بات

بس یہ ہیں قرآن کریم کی وہ چند آیتیں جن کو عام طور سے زمین کی شخصی ملکیت کے خلاف بطور استدلال پیش کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک آیت کا وہ مطلب پیچھے بیان کر دیا گیا ہے۔ جو عربی زبان کے قواعد و اسالیب اور قرآن کریم کے طرز بیان کے عین مطابق بھی ہے۔ اور چودہ سو سال سے تمام مفسرین امت نے ان آیتوں کا یہی مطلب سمجھا ہے۔ اور کسی فرد واحد نے بھی ان آیتوں سے یہ نہیں سمجھا کہ ان سے زمین کی شخصی ملکیت کی نفی مقصود ہے۔

لیکن فرداً فرداً تینوں آیتوں سے استدلال کا جواب الگ الگ معلوم کرنے کے بعد ایک اہم بات اصولی طور پر یہ قابل غور ہے کہ ان تینوں آیتوں میں سے کوئی آیت بھی براہ راست ملکیت کے مسئلے کو بیان کرنے کے لئے نازل نہیں ہوئی۔ تینوں آیتوں میں موضوع گفتگو کچھ اور ہے۔ پہلی آیت میں فرعون کے بلند بانگ دعوؤں کی تردید مقصود ہے۔ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے وہ احسانات بیان فرمارہے ہیں جو انہوں نے اپنے بندوں پر فرمائے ہیں۔ اور اس ضمن میں کائنات کے اندر پھیلی ہوئی مختلف نعمتوں کا تذکرہ مقصود ہے۔ تاکہ ان کا تصور کر کے بندے اس کا شکر بجالائیں۔ اور تیسری آیت میں آسمان و زمین کی تخلیق کی مدت وغیرہ کا ذکر مقصود ہے۔ ان میں سے کوئی بھی آیت ایسی نہیں ہے جس کا مرکزی موضوع ملکیت کے مسئلے یا اس کے فلسفے کو بیان کرنا ہو۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ عرب کے جس معاشرے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اور جس میں قرآن کریم نازل ہوا، اس میں زمین پر انفرادی ملکیت کو ایک مسلّم اصول

کے طور پر اختیار کیا گیا تھا، عرب کے تمام قبائل اسی انفرادی ملکیت کی بنیاد پر زمینوں کا بندوبست کرتے آرہے تھے، صدیوں سے زمین کی خرید و فروخت اور اس کو کرائے یا مزارعت پر دینے کا عام رواج تھا۔ قبائلی قانون کے تحت کسی شخص کی مملوکہ زمین پر دست درازی غصب سمجھی جاتی تھی۔ غرض جو شخص زمین کا مالک ہوتا۔ اس کو ملکیت کے تمام حقوق دیئے جاتے تھے۔ انفرادی ملکیت کا یہ ادارہ صدیوں سے اس قدر مستحکم تھا کہ اسے ختم کرنا کوئی معمولی کام نہیں تھا، یہ اتنا انقلابی کام تھا کہ اس کے لئے ذہن تیار کرنے اور اس پر لوگوں کو آمادہ کرنے کے لئے بڑی جدوجہد اور بڑے وقت کی ضرورت تھی۔ اگر واقعتاً قرآن کریم کا منشا یہ تھا کہ "انفرادی ملکیت" کا یہ ادارہ جڑ مول سے ختم کر دیا جائے تو کیا یہ بات عقل میں آ سکتی ہے کہ اتنے زبردست انقلابی حکم کے لئے کوئی ایک بھی صریح آیت نازل نہ کی جائے بلکہ دوسرے موضوعات کے ضمن میں اس انقلابی حکم کو اتنے غیر اہم انداز سے اور ایسے مشتبہ الفاظ میں بیان کیا جائے کہ اس کو آیت کے الفاظ سے کشید کرنے کے لئے محنت کرنی پڑے، اور پھر بھی امت کی اکثریت یہی کہتی رہے کہ ان الفاظ کا مطلب وہ نہیں ہے جو ان سے کشید کیا جارہا ہے؟ کیا صدیوں سے معاشرے میں جمی اور بیٹھی ہوئی عادتوں کو ختم کرنے کا انقلابی حکم اسی طرح دیا جاتا ہے؟

اہل عرب کی سب سے بنیادی خرابی بت پرستی تھی، جو ان کی رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی، قرآن کریم نے اس کو ختم فرمانا چاہا سو اس کے خلاف اتنی کثرت سے آیتیں نازل فرمائیں کہ ان کا شمار مشکل ہے، اور بت پرستی کی قباحتیں اتنے مختلف طریقوں سے بیان فرمائیں کہ اس بات میں کوئی ادنیٰ اشتباہ نہ رہا کہ قرآن کریم بت پرستی کا مخالف ہے۔

شراب اہل عرب کی زندگی کا ایک لازمی جزء بن کر رہ گئی تھی، جب قرآن کریم نے اس برائی کو ختم فرمانا چاہا تو غیر مبہم اور صریح الفاظ میں اس سے پرہیز کرنے کی تاکید اس طرح فرمائی کہ اسکا کوئی دوسرا مطلب نکالنا ممکن ہی نہیں ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر "زمین کی شخصی ملکیت" کو بھی قرآن کریم ختم کرنا چاہتا تھا، تو کیا اتنا عظیم انقلابی حکم اس بات کا بھی مستحق نہیں تھا کہ اسے کم از کم کسی ایک جگہ باقاعدہ موضوع بنا کر صریح الفاظ میں ذکر کیا جائے،

میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص بھی اس نکتے پر انصاف کے ساتھ غور کرے گا، وہ اس کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتا کہ درحقیقت قرآن کریم نے زمین کی شخصی ملکیت کا ارادہ ختم نہیں فرمایا۔ اور جن آیتوں سے کھینچ تان کر مفہوم اخذ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا۔

پھر اگر بالفرض قرآن کریم نے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کی شخصی ملکیت کو ختم فرمایا ہوتا تو یہ انقلابی حکم اپنے ساتھ بیشمار مسائل لے کر آتا۔ شخصی ملکیت کو ختم کرنے کا طریق کار کیا ہو گا؟ جو لوگ اس وقت زمینوں کے مالک ہیں، ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟ اگر ان سے زمینیں زبردستی چھینی جائیں گی تو ان کو معاوضہ ادا کیا جائے گا یا نہیں؟ معاوضہ ہو گا تو کس بنیاد پر ہو گا؟ شخصی ملکیت کو ختم کرنے کے بعد زمینوں سے فائدہ اٹھانے اور پیداوار حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہو گا؟ اگر لوگوں میں کاشت کے لئے زمینیں تقسیم کی جائیں گی تو یہ تقسیم کس بنیاد پر اور کس حساب سے ہو گی؟ ایک شخص کو کتنا رقبہ زمین کاشت کے لئے دیا جائے گا؟ حاصل ہونے والی پیداوار پر اس کو مالکانہ حقوق حاصل ہوں گے یا نہیں؟ ہوں گے تو کن ضابطوں کے ماتحت ہوں گے؟ غرض اس قسم کے بیشمار مسائل ہیں جن کا مفصل واضح اور غیر مبہم جواب مہیا کئے بغیر زمین کی شخصی ملکیت کا خاتمہ قطعی طور پر ناممکن ہے۔ اگر قرآن و سنت نے واقعتاً شخصی ملکیت کا خاتمہ کیا ہوتا تو ممکن نہیں تھا کہ وہ اس قسم کے مسائل کا واضح حل مہیا نہ کریں۔ ایسی صورت میں قرآن و سنت ان مسائل کے جوابات سے لبریز ہونے چاہئے تھے۔

لیکن قرآن و سنت کے وسیع ذخیرے میں ان میں سے کسی مسئلے کا کوئی حل تو کجا، اس کا بحیثیت مسئلے ادنیٰ ساذکر بھی نہیں ملتا۔ بلکہ اس کے خلاف ایسے بیشمار احکام ملتے ہیں جن میں زمین کی شخصی ملکیت کو واضح طور پر تسلیم کیا گیا ہے، (چنانچہ پچھلے باب میں ان احکام کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ اور کچھ مزید مثالیں آگے آ رہی ہیں)۔

اب یہ عجیب و غریب معاملہ ہے کہ زمین کی شخصی ملکیت کے خاتمے جیسا انقلابی حکم جس کے دامن میں مسائل کا ایک جہان آباد ہے اس کا قرآن و سنت نے کہیں بھی کوئی واضح ذکر نہیں فرمایا۔ اور یہ سارا انقلاب آیات۔ قدرت کے ضمن میں ایک مشکوک سے اشارے کے ذریعے لے آیا گیا ہے، نہ اس سے پہلے اس انقلابی حکم کی کوئی تمہید ہے، نہ اس کے بعد پیدا ہونے والے مسائل سے کوئی تعرض کیا گیا ہے! کیا کوئی شخص اپنے ہوش و حواس کی سلامتی کے ساتھ قرآن کریم اور اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کی طرف ایسی بے ہنگم بات منسوب کر سکتا ہے؟

زمین بھائی کو دے دو

بعض حضرات نے زمین کی شخصی ملکیت کی نفی کے لئے ایک حدیث کا سہارا لینے کی کوشش کی ہے۔ یہ حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اور اس کے جن الفاظ سے استدلال کی کوشش کی گئی ہے، وہ یہ ہیں:

من کانت له أرض فليزرعها . أو ليمنحها أخاه

جس شخص کی کوئی زمین ہو اسے چاہئے کہ وہ اس میں کاشت کرے. یا اپنے بھائی کو دے دے۔

کہا جاتا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر ذاتی ملکیت ہوتی تو یہ حکم نہ دیا جاتا کہ خود کاشت نہ کرنے کی صورت میں وہ اپنے بھائی کو دے دی جائے۔

لیکن اس حدیث سے ذاتی ملکیت کی نفی پر استدلال اس قدر بے بنیاد ہے کہ اس سے زیادہ بے بنیاد استدلال کا تصور مشکل ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ حدیث شخصی ملکیت کے خلاف تو کیا ہوتی؟ ذرا سا غور کیا جائے تو یہ شخصی ملکیت کا ناقابل انکار ثبوت مہیا کرتی ہے. جس کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) اول تو حدیث کے مکمل الفاظ یہ ہیں

من کانت له أرض فليزرعها . أو ليمنحها أخاه . فإن لم يفعل فليمسك أرضه

"جس شخص کی کوئی زمین ہو اسے چاہئے کہ وہ اس میں کاشت کرے یا اپنے بھائی کو دے دے. اور اگر یہ بھی نہ کرے تو اپنی زمین اپنے پاس رکھے"

اب استدلال کرنے والے کرتے یہ ہیں کہ حدیث کا صرف پہلا جملہ نقل کر دیتے ہیں. اور آخری خط کشیدہ جملہ حذف کر جاتے ہیں۔ کیونکہ اس جملے سے حدیث کا صحیح مطلب فوراً واضح ہو جاتا ہے. اور وہ یہ کہ دوسرے بھائی کو دینا کوئی فرض یا واجب نہیں ہے. بلکہ مسلمانوں میں بھائی چارے کی فضا قائم کرنے کی خاطر یہ ترغیب دی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی زمین کے کسی حصے پر خود کاشت نہ کر سکے تو بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے کسی دوسرے بھائی کو کاشت کے لئے دے دے. لیکن اس خیال کے پیش نظر کہ کہیں اس حکم کو فرض یا واجب نہ سمجھ لیا جائے. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر میں خود یہ وضاحت فرما دی کہ ایسا کرنا اس کے ذمے فرض یا واجب نہیں ہے. چنانچہ اگر وہ اپنی زمین کسی اور کو نہ دے اور خود اپنے پاس ہی رہنے دے تو ایسا کرنا بھی جائز ہے۔

اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت احتیاط کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ؐ نے کتنی باریک بینی سے شخصی ملکیت کے اصول کا تحفظ فرمایا کہ اصل مقصد اس بات کی ترغیب دینا تھا کہ لوگ اپنی

فاضل زمینیں ضرورت مند افراد کو کاشت کے لئے مستعار دے دیا کریں. چنانچہ آپ ؐ نے اس کی ترغیب بھی دی. لیکن ساتھ ہی ساتھ اس بات کا خاص اہتمام بھی فرمایا کہ اس حکم کو فرض یا واجب نہ سمجھ لیا جائے. اور اس سے ملکیت کے شرعی حقوق مجروح نہ ہوں. چنانچہ اس معالے میں ہر چھوٹے سے چھوٹے شک کو زائل کرنے کے لئے یہ بھی فرما دیا کہ "اگر یہ بھی نہ کرے تو اپنی زمین اپنے پاس رکھے"۔

(۲) اس حدیث کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں کہ:

من کانت له أرض

جس شخص کی کوئی زمین ہو

یہ الفاظ بذات خود اس بات کو تسلیم کرنے پر مبنی ہیں کہ زمین کسی شخص کی ذاتی ملکیت میں آ سکتی ہے۔ کیونکہ "کسی شخص کی زمین" کا بدیہی مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس کی مملوکہ زمین۔ خاص طور پر عربی زبان میں لفظ "له" استعمال کیا گیا ہے جس میں حرف "لام" ملکیت ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا زیادہ صحیح ترجمہ یہ ہو گا کہ "جس شخص کی ملکیت میں کوئی زمین ہو" یہ زمین کی شخصی ملکیت کا واضح ثبوت نہیں تو اور کیا ہے؟

(۳) پھر بھائی کو دینے کے لئے جو الفاظ حدیث میں استعمال کئے گئے ہیں. وہ ہیں:

" فَلْيَمْنَحْهَا اخاه "۔ یہ الفاظ عربی زبان میں کسی کو کوئی چیز مستقل طور پر دینے کے لئے نہیں. بلکہ عاریہ دینے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی کسی شخص کو کوئی چیز عارضی استعمال کے لئے دینا جس کے بعد اس پر واجب ہے کہ وہ دوبارہ اصل مالک کو واپس کر دے۔ چنانچہ عربی لغت کے مشہور عالم علامہ ابن سیدہ ؒ لکھتے ہیں:

منحه الشاة و الناقة ... أعاده إياها

(عرب کہتے ہیں) منحه الشاة والناقة: یعنی بکری یا اونٹنی اس کو عاریۃ دے دی۔

اور مشہور لغوی ابن فارس ؒ لکھتے ہیں:

«والمنيحة : منيحة اللبن. كالناقة أو الشاة يعطيها الرجل آخر يحتبلها ثم يردها»

---

(۱) المحکم . لابن سیدہ ص۲۹۷ ج ۳

(۲) معجم مقاییس اللغۃ. لابن فارس ص۲۷۸ ج ۵۔ مزید دیکھئے تاج العروس ص ۲۳۳ ج ۲۔

منیحہ عربی میں اس جانور کو کہتے ہیں جو دودھ کے لئے مستعار دیا گیا ہو مثلاً کوئی شخص اپنی بکری یا اونٹنی دوسرے کو اس لئے دے دے کہ وہ دودھ دوھ کر اسے واپس کر دے۔

اور ایک حدیث میں بھی یہ لفظ صراحتاً عاریت کے لئے استعمال ہوا ہے. چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«المنحة مردودة»

" منحہ " (عاریت) کا واپس کرنا ضروری ہے

اور صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی یہی حدیث ایک اور طریق میں ان الفاظ سے بھی مروی ہے:

«من كانت له أرض فليهبها أو ليعرها»

جس شخص کی کوئی زمین ہو. اسے چاہئے کہ وہ یا تو اس کا ہبہ کر دے یا اسے عاریۃً دے دے۔

اس لئے مشہور محدث اور لغوی امام ابو عبید فرماتے ہیں کہ مذکورہ حدیث میں " منح " کے معنی عاریۃً دینے ہی کے ہیں۔ امام ابو عبید کے الفاظ یہ ہیں:

«من كانت له أرض فليزرعها أو ليمنحها أخاه أي يدفعها إليه حتى يزرعها فإذا رفع زرعها ردها إلى صاحبها»

یہ جو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ " جس شخص کی کوئی زمین ہو. وہ اس میں کاشت کرے یا اپنے بھائی کو دے دے. اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے کاشت کرنے کے لئے دے دے. چنانچہ جب وہ اپنی فصل اٹھا چکے تو زمین اس کے اصلی مالک کو واپس کر دے

ان حوالوں سے یہ بات ناقابل انکار طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بھائی کو زمین دینے کی جو ترغیب دی ہے. اس کا مطلب عارضی استعمال کے لئے دینا ہے. جس کے بعد وہ پھر اصل مالک کے پاس آئے گی۔ اور واپسی کی یہ شرط صاف بتا رہی ہے کہ وہ زمین

(۱) اخرجہ البزار عن انس (الفتح الکبیر للنبہانی ص ۲۵۹ ج ۳)

(۲) صحیح مسلم. کتاب المساقاۃ. باب کراء الارض۔

(۳) لسان العرب ص ۴۴۶ ج ۳)۔

مستعار دینے والے کی ملکیت میں ہے. اور اسے اس پر پورے مالکانہ حقوق حاصل ہیں۔

اور اگر بالفرض یہاں " منح " کے معنی ہبہ کرنے کے لئے بھی لئے جائیں، کیونکہ ہبہ ایسی چیز کا درست ہوتا ہے جو ہبہ کرنے والے کی ملکیت میں ہو، اگر میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوں تو میں اس کا ہبہ بھی نہیں کر سکتا۔ اس صورت میں بھی یہ حدیث زمین پر شخصی ملکیت کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہے۔ لہٰذا اس سے الٹا ملکیت زمین کی نفی پر استدلال کرنا اگر عناد پر نہیں تو حدیث کے الفاظ، عربی زبان اور اس کے محاورات سے شدید ناواقفیت پر ضرور مبنی ہے۔

مزارعت کا مسئلہ

بعض حضرات زمین کی شخصی ملکیت کے خلاف وہ احادیث بھی پیش کرتے ہیں جن میں مزارعت سے منع کیا گیا ہے۔ چونکہ مزارعت کے جواز یا عدم جواز کا مسئلہ بذات خود بھی فی الجملہ اہمیت کا حامل ہے، اس لئے اس باب میں ہم مختصراً اس مسئلے کی حقیقت واضح کرنا بھی مناسب سمجھتے ہیں۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم مزارعت کے موضوع پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپؐ کے طرز عمل کی تشریح کریں۔ چند باتیں تمہید کے طور پر سمجھ لینی ضروری ہیں

(۱) سب سے پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ "مزارعت" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی زمین کا مالک اپنی زمین دوسرے شخص کو اس شرط پر کاشت کے لئے دے کہ وہ پیداوار کا کچھ حصہ زمین کے استعمال کے عوض مالک کو ادا کرے گا۔ اگر پیداوار کا کوئی حصہ کاشتکار کے ذمے لازم کر دیا جائے تو اسے عربی میں "مزارعہ" یا "مخابرہ" کہا جاتا ہے۔ اور اگر یہی معاملہ باغات اور درختوں میں کیا جائے تو اسے عربی زبان میں "مساقاۃ" یا "معاملہ" کہتے ہیں۔ اور اردو میں "مزارعت" یا "مساقات" کو "بٹائی" بھی کہا جاتا ہے۔

لیکن اگر مالک زمین کاشت کار کو زمین دیتے وقت پیداوار کا کوئی حصہ طے کرنے کے بجائے زمین کا کرایہ نقدی کی صورت میں مقرر کر لے تو اسے عربی میں "کراء الارض" یا "اجارہ" کہتے ہیں، اور اردو میں "کرایہ پر دینے" یا "ٹھیکے پر دینے" سے تعبیر کرتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھی عربی زبان میں "کراء الارض" کے لفظ مزارعت کے لئے بھی استعمال کر لیا جاتا ہے، جیسا کہ انشاء اللہ آگے اس کی مثالیں آئیں گی۔

(۲) "مزارعت"، "مساقات" اور "اجارہ" تینوں طریقے زمانہ جاہلیت سے عربوں میں معروف چلے آتے تھے۔ اور ان پر بے کھٹکے عمل ہوتا تھا۔ لیکن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان طریقوں میں کچھ اصلاحی تبدیلیاں فرمائیں، ان کی بعض صورتوں کو ناجائز قرار دیا، بعض کو جائز رکھا، بعض احکام وجوبی انداز (Mandatory nature) کے دیئے۔ اور بعض احکام مشورے، نصیحت اور بھائی چارے کی بنیاد پر عطا فرمائے۔

(۳) احادیث نبویہ کا جو عظیم الشان ذخیرہ الحمد للہ ہمارے پاس موجود ہے، اس سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ یہ احادیث اس طرح مدون نہیں ہوئیں کہ کسی ایک صحابی نے کسی ایک موضوع کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ارشادات کو یکجا کر کے اس موضوع کے تمام پہلوؤں کے بارے میں ایک جامع و مانع کتاب مرتب کر دی ہو۔ بلکہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جس سادگی کے ساتھ احادیث سنیں، اسی سادگی کے ساتھ اپنے شاگردوں کی طرف منتقل فرمائیں۔ بسا اوقات یہ بھی ہوا کہ جس خاص موضوع کے بارے میں گفتگو چل رہی ہو، کسی حدیث کا صرف وہ حصہ اس وقت نقل فرمایا جو اس موضوع سے متعلق تھا، اور دوسرا حصہ موضوع گفتگو سے غیر متعلق ہونے کی بناء پر اس وقت بیان کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

لہٰذا جب کسی موضوع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا اور اس کی صحیح تشریح معلوم کرنا ہو تو یہ طرز عمل انتہائی غلط اور گمراہ کن ہو گا کہ صرف کسی ایک یا دو حدیثوں کو دیکھ کر کوئی عمومی رائے قائم کر لی جائے۔ اس کے بجائے یہ ضروری ہے کہ اس موضوع پر جتنی احادیث مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، ان سب کو بیک وقت سامنے رکھ کر مسئلے کی حقیقت معلوم کی جائے۔ اس وقت واضح طور پر یہ منظر نظر آئے گا کہ ایک حدیث دوسری حدیث کی تشریح کر رہی ہے، یا اس کا تکملہ بن رہی ہے، اور تمام احادیث کو ایک دوسری کے پس منظر میں دیکھنے سے موضوع کے بارے میں مربوط اور منظم احکام سامنے آ جاتے ہیں۔

(۴) اسی طرح یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ کسی موضوع کی ٹھیٹھ فقہی اور قانونی اصطلاحات جو ایک قانونی مفہوم کے ساتھ خاص ہوں، اس دور میں متعین ہوئی ہیں جب "فقہ" نے ایک مستقل علم و فن کے باضابطہ صورت اختیار کی۔ اس سے پہلے وہ اصطلاحات اتنی متعین نہیں تھیں کہ ان میں کسی اور معنی کا احتمال ہی نہ ہو۔

ان چار امور کو مد نظر رکھتے ہوئے زیر بحث مسئلے کی طرف آیئے۔ جو حضرات مزارعت یا زمین کے کرائے پر دینے کو ناجائز کہتے ہیں۔ وہ مندرجہ ذیل احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔ یہ احادیث صحیح بخاری میں بھی مروی ہیں، لیکن میں یہاں صحیح مسلم سے نقل کر رہا ہوں:

عن جابر بن عبداللہ أن رسول اللہ ﷺ نہی عن کراء الأرض

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "کراء الارض" (زمین کو کرائے پر دینے) سے منع فرمایا۔

عن جابر أن النبی ﷺ نہی عن المخابرۃ

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مخابرہ (مزارعت) سے منع فرمایا۔

یہی مضمون حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یعنی انہوں نے بھی یہ ارشاد فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "کراء الارض" اور "مخابرہ" سے منع فرمایا ہے۔

جو چار تمہیدی باتیں اوپر عرض کی گئی ہیں. اگر ان سے قطع نظر کر کے صرف ان دو چار احادیث کو سامنے رکھا جائے تو بیشک ان سے نتیجہ یہی نکلے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کو کرائے پر دینے سے بھی منع فرمایا ہے. اور بٹائی پر دینے سے بھی۔ لیکن اگر اس موضوع کی تمام احادیث. اور خود حضرت جابرؓ اور حضرت رافع بن خدیجؓ کی ان روایات کو بھی سامنے رکھا جائے جن میں خود انہوں نے اس ممانعت کی تفصیل بیان فرمائی ہے اور جو مذکورہ مختصر احادیث کے لئے تکملہ کی حیثیت رکھتی ہیں. تو حقیقت حال واضح ہو جاتی ہے۔ ان تمام احادیث کو مجموعی طور پر سامنے رکھنے سے جو صورت حال سامنے آتی ہے. وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں کسی دوسرے شخص کو کاشت کے لئے زمین دینے کی چند صورتیں ہوتی تھیں:

عہد رسالتؐ میں مزارعت کے مختلف طریقے

(۱) ایک شخص کے پاس اگر کوئی فاضل زمین ہوتی جسے وہ خود آباد نہ کر سکتا تو وہ کسی دوسرے شخص کو عاریۃً کسی اجرت یا معاوضے کے بغیر زمین دے دیتا. تاکہ وہ اس میں کاشت کر کے پیداوار سے اپنی روزی حاصل کرے۔

یہ طریقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ پسند تھا. کیونکہ دوسرے کی ہمدردی. خیر خواہی اور ایثار کی جو صفات اسلام اپنے متبعین میں دیکھنا چاہتا ہے. یہ طریقہ ان صفات کے شایان شان ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقے کو اختیار کرنے کی بہت ترغیب دی. اور پچھلے باب میں حضرت رافع بن خدیجؓ کی جو حدیث گزر رہی ہے. وہ اسی ترغیبی ہدایت پر مبنی ہے۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ایک شخص اپنی زمین دوسرے کو نقد کرایہ پر دیدیتا تھا، کرایہ دار زمین کی کل پیداوار کا خود مالک ہوتا، اور مالک زمین کو متعینہ کرایہ نقدی کی شکل میں ادا کر دیتا۔ اس طریقے کو پہلے طریقے کے مقابلے میں زیادہ پسند تو نہیں کیا گیا، لیکن اسے ناجائز بھی قرار نہیں دیا گیا۔

(۳) تیسرا طریقہ یہ تھا کہ زمیندار کاشتکار کو زمین دیتے وقت پیداوار کا فی صد حصہ مثلاً تہائی، چوتھائی یا آدھا اپنے لئے طے کر لیتا، اور باقی کاشتکار کا ہوتا، اس طریقے کو بھی پہلے طریقے کے مقابلے میں پسندیدہ تو نہیں قرار دیا گیا، لیکن ناجائز بھی نہیں کہا گیا۔ بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مقامات (مثلاً خیبر میں) خود بھی یہ طریقہ اختیار فرمایا۔

(۴) چوتھا طریقہ یہ تھا کہ زمیندار پیداوار کا فی صد حصہ طے کرنے کے بجائے پیداوار کی کوئی مخصوص مقدار (مثلاً دس من بیس من) اپنے لئے طے کر لیتا اور کاشتکار کو ہر حالت میں یہ مقدار زمیندار کو دینی پڑتی، خواہ کل پیداوار کتنی کم کیوں نہ ہوئی ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقے کی سختی کے ساتھ ممانعت فرمائی۔ وجہ یہ تھی کہ اگر زمیندار نے بیس من پیداوار اپنے لئے طے کر لی، تو بعض اوقات کل پیداوار ہی بیس من ہوتی، وہ ساری پیداوار زمیندار لے جاتا، اور کاشتکار کو اپنی محنت کا کوئی صلہ نہ ملتا۔ یا بعض اوقات زمیندار کی طے شدہ مقدار دینے کے بعد کاشتکار کے پاس اتنی کم پیداوار بچتی جو اس کی محنت کا مناسب صلہ نہ ہوتی۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقے کو بالکل ناجائز و حرام قرار دیا۔

(۵) پانچواں طریقہ یہ تھا کہ زمیندار کاشتکار کو زمین دیتے وقت اس زمین کا زیادہ زرخیز حصہ اپنے لئے مخصوص کر کے یہ کہتا کہ اس حصے پر جو پیداوار ہو گی، وہ میری ہو گی، اور دوسرے حصے کی پیداوار تمہیں لینی ہو گی اب بسا اوقات ایسا ہوتا کہ زمیندار کے حصے کی زمین سے تو خوب پیداوار برآمد ہوتی، اور کاشتکار والے حصے میں یا تو کچھ پیدا نہ ہوتا، یا کم پیدا ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقے کو بھی بالکلیہ ممنوع قرار دیدیا۔

یہ آخری دو طریقے زمانہ جاہلیت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اتنی کثرت کے ساتھ رائج تھے کہ جب مطلق "مزارعت"، "مخابرہ"، یا کراء الارض کا لفظ بولا جاتا تو اکثر انہی دو طریقوں کی طرف ذہن جاتا تھا۔ اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں طریقوں کو منع فرما دیا تھا، اس لئے صحابہ کرامؓ نے ایسے مواقع پر جہاں تفصیل کا موقع نہیں تھا، یا اس کی ضرورت نہیں تھی، ان دو طریقوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صرف اتنا ارشاد فرما

دیا کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کراء الارض سے منع فرمایا" یا "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت سے منع فرمایا"۔ یہی صورت حضرت جابرؓ اور حضرت رافع بن خدیجؓ کی مذکورہ بالا احادیث میں پیش آئی ہے۔ ورنہ انہی دو بزرگوں نے دوسرے مواقع پر جہاں اس حکم کی تفصیل بیان فرمائی. وہاں بات کو بالکل واضح کر دیا کہ درحقیقت ممانعت ان آخری دو طریقوں کی تھی. پہلے دو طریقوں کی نہیں.

حضرات رافع بن خدیجؓ کی توضیحات.

چنانچہ جب ان حضرات سے ممانعت کی تفصیل معلوم کی گئی. تو انہوں نے تفصیل کے ساتھ حقیقت واضح فرما دی۔ چنانچہ وہی حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ جنہوں نے کسی موقع پر "کراء الارض" کے بارے میں یہ کہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے. انہی کے بارے میں حنظلہ بن قیسؒ کہتے ہیں کہ:

سألت رافع بن خديج عن كراء الأرض بالذهب و الورق فقال : لا بأس به إنما كان الناس يؤاجدون على عهد النبي ﷺ على الماذ يانات و أقبال الجلال و أشياء من الزرع . فيهلك هذا و يسلم هذا۔ و يسلم هذا و هلك هذا۔ فلم يكن للناس كراء إلا هذا فلذلك زجر عنه فأما شيئي معلوم مضمون فلا بأس به.

> میں نے رافع بن خدیج (رضی اللہ عنہ) سے پوچھا کہ زمین کو سونے چاندی کے عوض کرائے پر دینے کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ بات دراصل یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لوگ زمین اس طرح کرائے پر دیتے تھے کہ پانی کی گزر گاہوں اور نالیوں کے سامنے والے حصوں پر یا کھیتی کے کسی خاص حصے میں اگنے والی پیداوار اپنے لئے طے کر لیتے تھے. جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کبھی زمین کے اس حصے کی پیداوار تباہ ہو جاتی. اور دوسرے حصے کی سلامت رہتی. اور کبھی اس حصے کی سلامت رہتی اور دوسرے کی تباہ ہو جاتی۔ اس وقت لوگوں میں زمین کرائے پر دینے کا یہی طریقہ تھا۔ اس

(۱) صحیح مسلم۔ کتاب البیوع. باب کراء الارض

لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا، لیکن اگر کسی متعین اور خطرے سے خالی چیز کو مقرر کیا جائے تو اس میں کچھ حرج نہیں۔ (۱)

ایک اور موقع پر حضرت رافع بن خدیجؓ نے یہ وضاحت فرمائی

كنا نكرى الأرض على أن لنا هذه ولهم هذه فربما أخرجت هذه ولم تخرج هذه فنهانا عن ذلك. وأما الورق فلم ينهنا

ہم زمین کو اس طرح کرائے پر دیا کرتے تھے کہ اس زمین کی پیداوار ہماری ہوگی۔ اور اس زمین کی پیداوار ان کی ہوگی۔ اب بعض اوقات اس زمین میں پیداوار ہوتی۔ اور اس میں نہ ہوتی چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس طریقے سے منع فرما دیا۔ لیکن نقدی پر زمین دینے سے منع نہیں فرمایا (۲)

ایک اور موقع پر حضرت رافع بن خدیجؓ سے صاف طور پر پوچھا گیا کہ جس "کراء الارض" سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ وہ کس قسم کا معاملہ ہے؟ تو آپ نے ممنوع صورتوں کی تفصیل بیان فرما دی۔ سنن نسائیؒ میں امام زہریؒ فرماتے ہیں:

«أن رافع بن خديج قال: نهى رسول الله ﷺ عن كراء الأرض. قال ابن شهاب: فسئل رافع بعد ذلك. كيف كانوا يكرون الأرض؟ قال: بشيئ من الطعام مسمى وبشرط أن لنا ما تنبت ماذ نات الأرض وأقبال الجداول»

رافع بن خدیجؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "کراء الارض" سے منع فرمایا۔ ابن شہاب زہریؒ کہتے ہیں کہ بعد میں رافعؓ سے پوچھا گیا کہ اس دور میں لوگ زمین کو کس طرح کرائے پر دیا کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا کہ: غلہ کی معین مقدار پر اور اس شرط پر کہ پانی کی گزر گاہوں۔ اور نالیوں کے سامنے والے حصوں پر جو پیداوار ہوگی۔ وہ ہماری ہوگی"۔

ان احادیث سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لوگ جو زمینیں کرائے یا مزارعت پر دیتے تھے۔ عموماً وہ مذکورہ پانچ طریقوں سے آخری دو طریقوں کے مطابق دیا کرتے تھے۔ یعنی یا تو پیداوار کی معین مقدار (مثلاً دس من یا بیس

(۱) سنن النسائی، کتاب المزارعۃ، باب فی النہی عن کراء الارض بالثلث والربع حدیث نمبر ۳۲۰۷۔

من) مقرر کر لیتے تھے۔ ان دونوں صورتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا۔ کیونکہ اس میں احتمال تھا کہ طے کی ہوئی پیداوار کے سوا کچھ پیدا نہ ہو۔ یا صرف طے کی ہوئی زمین میں پیداوار ہو۔ باقی میں نہ ہو۔ اور اس طرح ایک فریق نقصان میں رہے۔ چنانچہ مزارعت کی یہ دو صورتیں باجماع ناجائز ہیں۔ انہیں کوئی جائز نہیں کہتا۔

حضرت جابرؓ کی وضاحت۔

اسی طرح حضرت جابر رضی اللہ عنہ جن کی حدیث اوپر نقل کی گئی ہے۔ اور جس سے۔ زمین کو کرائے یا مزارعت پر دینے کے خلاف استدلال کیا جاتا ہے۔ انہوں نے بھی ایک دوسرے موقع پر اس ممانعت کی حقیقت ان الفاظ میں واضح فرمائی:

کنا فی زمان رسول اللہ ﷺ نأخذ الأرض بالثلث أو الربع بالماذیانات۔ فقام رسول اللہ ﷺ فی ذالک۔ فقال من کانت له أرض فلیزرعها فإن لم یزرعها۔ فلیمنحها أخاه۔ فإن لم یمنحها أخاه فلیمسکها۔

> ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زمین اس شرط کے ساتھ لیا کرتے تھے۔ کہ پانی کی گذرگاہوں پر جو پیداوار ہو گی اس کا ایک تہائی یا ایک چوتھائی زمیندار کو دینا ہو گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں اقدام فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جس شخص کی کوئی زمین ہو۔ اسے چاہئے کہ وہ خود اس میں کاشت کرے۔ اگر وہ خود کاشت نہیں کرتا تو اسے چاہئے کہ اپنے بھائی کو مستعار دے دے۔ اگر بھائی کو مستعار بھی نہیں دیتا تو اپنے پاس رکھے (مگر مذکورہ طریقے سے کرائے پر نہ دے)

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا۔

کنا نخابر علی عهد رسول اللہ ﷺ۔ فنصیب من القصری و من کذا۔ فقال رسول اللہ ﷺ من کانت له أرض فلیزرعها فلیدعها

ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مخابرہ (مزارعت) کیا کرتے تھے۔

---

(۱) صحیح مسلم۔ کتاب البیوع۔ باب کراء الارض۔

(۱) صحیح مسلم۔ کتاب البیوع۔ باب کراء الارض۔

تو ہمیں قصری (خوشوں میں بچا ہوا غلہ) وغیرہ مل جاتا تھا. اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کی کوئی زمین ہو. وہ اسے خود کاشت کرے. الخ

قصری (یعنی خوشوں میں بچے ہوئے غلے) کے ملنے کا کیا مطلب ہے؟ علامہ زمخشری جو عربی لغت کے مشہور عالم ہیں اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ان رب الأرض كان يشترط على المزارع أن يزرع له خاصة ما تسقيه الجداول و الربيع ، و أن تكون له القصارة ، فنهى عن ذلك.

زمیندار کاشتکار سے یہ طے کرتا تھا کہ کاشتکار اس کے لئے زمین کا وہ مخصوص حصہ کاشت کرے گا جو نہروں اور نالیوں سے سیراب ہوتا ہے. اس سے حاصل ہونے والی پیداوار میں کاشتکار کا صرف اتنا حصہ ہو گا جو خوشوں کی دلالی کے بعد خوشوں میں بچ رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا۔

ان تمام احادیث کو یکجا سامنے رکھنے سے جو واضح نتیجہ بر آمد ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ مزارعت کی یہ فاسد صورتیں جن میں زمین کا کوئی معین حصہ یا پیداوار کی کوئی طے شدہ مقدار زمیندار کے لئے طے کر لی جاتی تھی، اہل عرب میں ان کا عام رواج تھا. اور اس قدر رواج تھا کہ بقول حضرت رافع بن حدیجؓ "کراء الارض" کا کوئی مطلب اس کے سوا سمجھا نہیں جاتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان خاص صورتوں کو منع فرمایا، لیکن نہ تو نقد کرائے کے عوض زمین دینے کی ممانعت فرمائی، نہ وہ صورت اس ممانعت میں داخل ہے جس میں صرف پیداوار کا فی صد حصہ زمیندار نے اپنے لئے طے کیا ہو۔

حضرت رافعؓ کی مزید وضاحت:

نقد کرائے پر زمین دینے کا جواز تو حضرت رافع بن حدیجؓ کے الفاظ میں صراحتاً پیچھے گزر چکا ہے. جہاں تک فی صد حصے کی بٹائی کا تعلق ہے. اس کے بارے میں حضرت رافع بن حدیجؓ سے بعض احادیث ایسی منقول ہیں جن سے بظاہر اس کی بھی ممانعت معلوم ہوتی ہے. مثلاً ابو داؤد میں ان کا یہ ارشاد منقول ہے:

كنا نخابر على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم فذكر أن بعض عمومة أتاه فقال : نهى

(۲) الفائق للزمخشری ص۳۵۲ ج۲۔

رسول اللہ ﷺ عن أمر كان لنا نافعا. و طواعية الله و رسوله أنفع لنا.
قال: قلنا: و ما ذالك قال: قال رسول الله ﷺ من كانت له أرض فليزرعها
أوليزرعها أخاه. ولا يكاريها بثلث ولا بربع. ولا طعام مسمى

ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے مخابرہ (مزارعت) کیا کرتے تھے. پھر ہمارے کچھ چچا میرے پاس آئے اور انہوں نے کہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے کام سے ہمیں منع فرما دیا ہے جو (بظاہر) ہمارے لئے نفع بخش تھا. لیکن اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت ہمارے لئے زیادہ نفع بخش ہے۔ ہم نے پوچھا، وہ کیا کام ہے؟ اس پر انہوں نے بتایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس شخص کی کوئی زمین ہو، وہ اس میں خود کاشت کرے، یا دوسرے کو کاشت کے لئے دے دے، اور اسے ایک تہائی اور ایک چوتھائی کے معاوضے میں کرائے پر نہ اٹھائے، اور نہ کسی معین غلے کے معاوضے میں

اس روایت کے خط کشیدہ جملے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک تہائی یا ایک چوتھائی پیداوار کے معاوضے میں بھی زمین کو دینا (جسے بٹائی کہتے ہیں) آپؐ نے ممنوع قرار دیا۔ لیکن اول تو اس روایت کی تشریح ابن ماجہ اور مسند احمد کی ایک روایت سے معلوم ہوتی ہے، جس میں حضرت رافع بن خدیجؓ فرماتے ہیں:

كان أحدنا إذا استغنى عن أرضه أعطاها بالثلث و الربع و النصف. و اشترط ثلاث جداول و القصارة و ما سقى الربيع

ہم میں سے کسی کو جب اپنی زمین کی ضرورت نہ ہوتی تو وہ تہائی چوتھائی اور آدھی پیداوار کے عوض کسی کو کاشت کے لئے دے دیتا تھا، اور اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگا لیتا تھا کہ تین نالیوں کے قریب اگنے والی پیداوار، اور خوشوں میں بچا ہوا غلہ، اور چھوٹی نہر سے سیراب ہونے والی زمین کی پیداوار بھی اس کی ہوگی۔

اس روایت سے واضح ہے کہ جو لوگ پیداوار کا کوئی متناسب حصہ، مثلاً تہائی، چوتھائی وغیرہ اپنے لئے طے کرتے، وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کے ساتھ مخصوص

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب المزارعۃ - والتشدید فی ذالک - حدیث نمبر ۳۳۹۵

(۲) سنن ابی ماجہ، باب مایکرہ من المزارعۃ ص ۱۷۹ ج ا و مسند احمد ص ۶۴ ج ۳۔

زمینوں کی پیداوار بھی اپنے لئے مقرر کر لیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں مزارعت درست نہیں ہو سکتی. کیونکہ تہائی چوتھائی کی جو شرط جائز ہو سکتی تھی. اس میں مخصوص زمینوں کی پیداوار کا اضافہ کر کے اسے بھی خراب کر دیا گیا۔

لہٰذا جب ابن ماجہ کی اس روایت کی روشنی میں ابو داوٗد کی مذکورہ بالا حدیث کو پڑھا جائے تو اس سے بہ آسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ تہائی چوتھائی پیداوار کی شرط کو ناجائز قرار دینے کی وجہ یہ ہے ایسے معاملے میں عموماً متعین زمین یا متعین پیداوار کی۔ شرط بھی ساتھ ساتھ لگا دی جاتی تھی. اور اس کی وجہ سے یہ معاملہ ناجائز ہو جاتا تھا۔

یہ بات ہم شروع ہی میں لکھ چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک زیادہ پسندیدہ بات یہی تھی کہ انسان اپنی فاضل زمین دوسرے کو ہمدردی کے جذبے سے مفت مستعار دے دے. تاکہ وہ اس میں کاشت کر سکے. لہٰذا اس پسندیدہ طریقے کے مقابلے میں تہائی یا چوتھائی پیداوار کے معاوضے میں زمین دینا آپؐ کے نزدیک کوئی افضل یا پسندیدہ طریقہ نہیں تھا. اس لئے آپؐ نے بعض اوقات پہلے طریقے کی ترغیب دینے کے لئے دوسرے طریقے کے لئے ایسے الفاظ بھی استعمال فرمائے جن سے اس کی قدرے ناپسندیدگی کا تاثر ملتا ہے۔

مثلاً حضرت رافع بن خدیجؓ بھی فرماتے ہیں:

مدالنبی ﷺ علی أرض رجل من الأنصار قد عرف أنه محتاج. فقال: لمن هذه الأرض؟ قال: لفلان أعطانيها بالأجر. فقال: لو منحها أخاه

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انصار میں سے ایک صاحب کی فصل کے پاس سے گزرے جن کے بارے میں آپؐ کو معلوم تھا کہ وہ ضرورت مند ہیں. آپؐ نے پوچھا: یہ زمین کس کی ہے؟ ان صاحب نے کہا کہ یہ فلاں شخص کی ہے. اس نے مجھے معاوضے پر دی ہے۔ آپ نے فرمایا:

کاش وہ یہ زمین اپنے بھائی کو بلامعاوضہ مستعار دیدیتا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کاشتکار کو بلامعاوضہ زمین دینے کی جو ترغیب دی. اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ جائز معاوضے پر زمین دینا سرے سے ناجائز ہے. بلکہ مقصد یہ تھا کہ اسلامی اخوت و ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ ضرورت مند افراد کو فاضل زمین بلامعاوضہ دے دی جایا کرے۔ لیکن

---

(١) سنن النسائی ص١٥١ ج٢. کتاب المزارعة. باب النہی عن کرائک الارض بالثلث والربع. حدیث نمبر ٣٨٦٩۔

بعض حضرات نے آپؐ کے ان ارشادات سے یہ سمجھا کہ مزارعت بالکل ممنوع قرار دے دی گئی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رافع ابن حدیجؓ نے نہی آپؐ کے اس طرز عمل کی نشرو اشاعت اس شدت کے ساتھ فرمائی کہ اس سے لوگوں کو تاثر یہی ملا کہ حضرت رافعؓ صرف تہائی چوتھائی پیداوار پر زمین کی بٹائی کو ناجائز سمجھتے ہیں. لیکن دوسرے صحابہ کرامؓ نے اس خیال کی سختی کے ساتھ تردید فرمائی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ. فرماتے ہیں:

أن النبي ﷺ لم ينه عنه. ولكن قال: أن يمنح أحدكم أخاه خير له من أن يأخذ خرجا معلوما

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت سے منع نہیں کیا. بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اگر تم اپنی زمین اپنے بھائی کو عاریۃً دے دو تو یہ اس سے بہتر ہے کہ طے شدہ آمدنی اس سے وصول کرو

اور جب حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کا یہ طرز عمل حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بیان کیا گیا کہ وہ مزارعت سے منع کرتے ہیں، تو حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا:

قد علمنا أنه كان صاحب مزرعة يكريها على عهد رسول الله ﷺ على أن له ما على الربيع الساقي الذي يتفجر منه الماء وطائفة من التبن. لا أدري كم هي؟

ہمیں معلوم ہے کہ رافع ایک کھیت کے مالک تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسے اس شرط کے ساتھ کرائے پر دیا کرتے تھے کہ وہ چھوٹی نہر جس سے پانی پھوٹتا ہے. اس کے پاس پیداوار اور بھوسے کی ایک معین مقدار ان کی ہو گی. اور یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ پیداوار یادہ مقدار کتنی ہو گی۔

اس میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بھی وہی حقیقت بیان فرما دی کہ دراصل مزارعت کی ممانعت ان فاسد شرائط کے ساتھ مخصوص تھی. ورنہ صرف تہائی چوتھائی پر مزارعت ناجائز نہیں ہے. لیکن چونکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نہایت متقی اور محتاط بزرگ تھے۔ اور معمولی شبہات سے بھی پرہیز فرماتے تھے. لہٰذا مزارعت کی یہ حقیقت علمی طور پر واضح فرمانے کے باوجود انہوں نے

---

(۱) صحیح البخاری. کتاب الحرث والمزارعۃ. باب ذالک شرط السنین فی المزارعۃ

(۲) سنن النسائی. کتاب المزارعۃ. باب النہی عن کراء الارض بالثلث والربع. حدیث نمبر ۳۹۰۸۔

احتیاطاً خود اپنا عمل تبدیل کر لیا۔ اور زمین کو مزارعت پر دینا ترک فرما دیا۔ تاکہ جس عمل میں ناپسندیدگی کا ادنیٰ سا شائبہ بھی ہو، اس سے بھی پرہیز ہو جائے۔

مزارعت کے جواز کے دلائل

اب میں ان دلائل کو مختصراً بیان کرتا ہوں جن سے پیداوار کے متناسب (فی صد) حصے کے عوض زمین کو بٹائی پر دینے کا جواز واضح طور پر ثابت ہوتا ہے:

(۱) اس سلسلے میں سب سے پہلی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمانے کے بعد مکہ مکرمہ سے مہاجرین کی ایک بڑی تعداد آ کر مدینہ طیبہ میں آباد ہوئی تو ان کے معاش اور روزگار کا مسئلہ پیدا ہوا۔ مدینہ طیبہ کے قدیم مسلمان باشندے جنہیں "انصار" کہا جاتا ہے، وہاں کی زمینوں کے مالک تھے۔ اور انہوں نے اپنے جذبہ ایثار سے کام لیتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مہاجرین کے لئے یہ پیش کش کی کہ ہم اپنی زمینیں اپنے مہاجر بھائیوں کے ساتھ تقسیم کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تجویز کو قبول نہیں فرمایا۔ اور مہاجرین بھی اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس کے بعد انصار مدینہ نے دوسری متبادل تجویز یہ پیش کی کہ مہاجرین ہماری زمینوں پر کام کریں، اور پیداوار ہمارے اور ان کے درمیان مشترک طور پر تقسیم ہو۔ گویا بٹائی کا معاملہ کر لیا جائے۔ مہاجر صحابہ کرامؓ نے اس تجویز کو بخوشی قبول کر لیا۔ صحیح بخاریؒ میں یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

قالت الأنصار للنبي ﷺ: اقسم بيننا و بين إخواننا النخيل. قال: لا. فقالوا: تكفونا المؤونة ونشرككم في الثمرة قالوا: سمعنا و أطعنا.

انصار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ یا رسول اللہ، ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے درمیان نخلستان تقسیم فرما دیجئے، آپؐ نے فرمایا: نہیں۔ اس پر انصار نے کہا: اچھا آپ لوگ (یعنی مہاجرین) ہمیں باغوں میں کام کرنے سے بے فکر کر دیں، (یعنی ہمارے بجائے آپ کام کریں) اور ہم آپ کو پھل میں شریک کر لیں گے۔ مہاجرین نے کہا: یہ ہمیں بخوشی منظور ہے۔

چنانچہ اس واقعے کے بعد سالہا سال مہاجر صحابہ کرامؓ اپنے انصاری بھائیوں کی زمینوں پر بحیثیت کاشتکار کام کرتے رہے، اور ان کے درمیان بٹائی کا معاملہ خوش اسلوبی سے چلتا رہا۔ یہ سب کچھ

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المزارعۃ، باب ۵ حدیث ۲۳۲۵، و کتاب الشروط، حدیث ۲۷۱۹۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر نگرانی اور آپؐ کی مکمل تائید و حمایت سے ہوا۔ اور آپؐ نے اس کی اجازت دی۔ بٹائی کا معاملہ بالکلیہ ناجائز ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین اور انصار کو اتنے بڑے پیمانے پر یہ معاملہ کرنے کی اجازت کیسے دے سکتے تھے؟

۲۔ خیبر کی زمینوں کا معاملہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بڑے پیمانے پر مزارعت کے معاملے کی دوسری اہم مثال خیبر کی زمینوں کی ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کا علاقہ فتح فرما لیا اور اس کی تمام زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آگئیں تو ان کے پرانے مالک، جو تمام تر یہودی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور انہوں نے عرض کیا کہ خیبر کی زمینوں میں کاشت کرنے کا طریقہ ہمیں اچھی طرح آتا ہے، لہٰذا آپ ہمیں ان زمینوں پر بحیثیت کاشتکار کام کرنے دیں، پیداوار میں آدھا حصہ آپ کا اور آدھا ہمارا ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تجویز کو قبول فرما لیا اور ان کے ساتھ بٹائی کا معاملہ آدھی آدھی پیداوار طے ہوگیا۔ اور یہ معاملہ نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال تک، بلکہ آپؐ کے بعد حضرت عمرؓ کے زمانے تک جاری رہا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں یہودیوں نے کچھ ایسی شرارتیں کیں کہ حضرت عمرؓ نے ان سے بٹائی کا معاملہ ختم کر کے انہیں تیماء اور اریحاء کی طرف جلاوطن کر دیا۔

خیبر کے اس واقعے کی تفصیل حدیث کی تقریباً تمام مستند کتابوں میں موجود ہے، محض مثال کے طور پر صحیح مسلمؒ سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے یہ مختصر الفاظ نقل کیے جاتے ہیں:

لما افتتحت خيبر سألت يهود رسول الله ﷺ أن يقرهم فيها على أن يعملوا على نصف ما خرج منها من الثمر والزرع، فقال رسول الله ﷺ أقركم فيها على ذلك ما شئنا

جب خیبر فتح ہوا تو یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ان کو خیبر میں برقرار رکھا جائے، وہ زمینوں پر اس شرط کے ساتھ کام کرتے رہیں کہ زمینوں سے جو پھل یا کھیتی پیدا ہوگی اس کا آدھا حصہ وہ مسلمانوں کو دیا کریں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں اس وقت تک ان زمینوں پر برقرار رکھتا ہوں جب تک ہم چاہیں گے"

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ۔

اس واقعے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہودیوں سے صراحتاً بٹائی کا معاملہ فرمایا جو نہ صرف آپؐ کے وصال تک بلکہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔ اگر بٹائی کا معاملہ بالکل ناجائز ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی زمینوں میں اس معاملے پر کیسے راضی ہو سکتے تھے؟

بعض حضرات نے خیبر کے اس معاملے کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ بٹائی کا معاملہ نہیں تھا. بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو ان کی زمینوں پر برقرار رکھ کر پیداوار کا آدھا حصہ بطور خراج ان کے ذمے لگایا تھا جسے فقہی اصطلاح میں "خراج مقاسمہ" کہتے ہیں۔

لیکن خیبر کے واقعے کی تفصیلات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ تاویل بہت کمزور ثابت ہوتی ہے. دراصل اسلامی قانون کے تحت خراج کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں مفتوحہ ملک کی زمینیں مسلمانوں نے اپنی ملکیت میں لانے کے بجائے ان پر مفتوحہ ملک کے باشندوں کی ملکیت برقرار رکھی ہو. اس صورت میں ان کے ذمے خراج عائد کر دیا جاتا ہے جو بعض اوقات نقدی کی شکل میں ہوتا ہے جسے "خراج موظف" کہتے ہیں. اور بعض اوقات پیداوار کے کسی حصے کی شکل میں ہوتا ہے جسے "خراج مقاسمہ" کہا جاتا ہے۔

لیکن جہاں مفتوحہ ملک کی زمینیں مسلمان فاتحین کے درمیان تقسیم کر دی گئی ہوں. وہاں چونکہ زمینوں پر مکمل ملکیت مسلمانوں کو حاصل ہو جاتی ہے. اس لئے ان زمینوں پر خراج کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں مسلمانوں کی ملکیت ہونے کی حیثیت سے ان کی زرعی پیداوار پر عشر عائد ہوتا ہے۔ اسلامی قانون کا یہ اصول ایک مسلم اصول ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خیبر فتح ہونے کے بعد وہاں کی زمینوں پر یہودیوں کی ملکیت برقرار رکھی گئی تھی. یا وہ زمینیں مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دی گئی تھیں؟ اگر یہودیوں کی ملکیت برقرار رکھی گئی ہو. تب تو یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ پیداوار کا جو حصہ یہودیوں کے ذمے لگایا گیا تھا. وہ خراج کے طور پر تھا۔ لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ زمینیں مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دی گئی تھیں تو پھر اس کا خراج ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا. بلکہ اس کا صاف مطلب یہی ہو گا کہ مسلمانوں نے اپنی مملوکہ زمینیں یہودیوں کو بٹائی پر دے دی تھیں. اس لئے پیداوار کا آدھا حصہ وہ مسلمانوں کو دیا کرتے تھے۔

خیبر کے واقعے اور وہاں کی زمینوں کے بندوبست کے بارے میں احادیث کے اندر پوری تفصیلات بیان ہوئی ہیں. ان کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ خیبر کی فتح کے

بعد وہاں کی زمینوں سے یہودیوں کی ملکیت بالکلیہ ختم ہو چکی تھی. اور وہ تمام زمینیں مسلمان فاتحین کو مالکانہ حقوق کے ساتھ دے دی گئی تھیں۔ یہ حقیقت یوں تو بہت سی روایات سے ثابت ہے. لیکن نمونے کے طور پر چند احادیث یہاں ذکر کی جاتی ہیں:

صحیح مسلمؒ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ (جو خود خیبر کی بعض زمینوں کے مالک تھے جو انہیں غزوۂ خیبر کے موقع پر ملی تھیں) فرماتے ہیں:

وكانت الأرض حين ظهر عليها لله ولرسوله و للمسلمين فأراد إخراج اليهود منها فسألت اليهود رسول الله ﷺ أن يقرهم بها على أن يكفوا عملها . ولهم نصف الثمر . فقال لهم رسول الله ﷺ نقركم بها على ذلك ما شئنا

"(خیبر کی) زمین پر جب مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو وہ اللہ. اس کے رسولؐ اور مسلمانوں کی ہو گئی. چنانچہ آپؐ نے یہودیوں کو وہاں سے نکالنے کا ارادہ فرمایا۔ اس پر یہودیوں نے آپؐ سے درخواست کی کہ آپؐ انہیں اس شرط پر زمینوں پر برقرار رکھیں کہ وہ مسلمانوں کو زمینوں پر کام کرنے سے بے فکر کر دیں گے. اور اس کے عوض آدھا پھل ان کا ہو گا۔ تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم ان کو ان زمینوں پر اس وقت تک برقرار رکھتے ہیں جب تک ہم چاہیں"۔

اس حدیث میں صراحت ہے کہ زمین مسلمانوں کی ملکیت ہو چکی تھی. اسی لئے یہودیوں نے یہ الفاظ استعمال کئے کہ وہ مسلمانوں کو زمینوں پر کام کرنے سے بے فکر کر دیں گے. اور اس کے عوض آدھا پھل ان کا ہو گا اگر یہ معاملہ خراج کا ہوتا تو مسلمانوں کو کام سے بے فکر کرنے کے کوئی معنی نہیں تھے. کیونکہ خراجی زمینوں کے مالک خود اپنے لئے کام کرتے ہیں. کسی اور کے لئے نہیں۔

سنن ابی داؤد میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ خیبر کے معاہدے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

افتتح رسول الله ﷺ خيبر . و اشترط أن له الأرض و كل صفراء و

(۱) صحیح مسلم. کتاب المساقاۃ. قبیل باب فضل الغرس والزرع۔

بیضاء. وقال أهل خیبر: نحن أعلم بالأرض منکم فأعطناها علی أن لکم نصف الثمرة. ولنا نصف. فزعم أنه أعطاهم علی ذلك.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر فتح فرمایا، اور یہ طے فرمایا کہ زمین اور سونے چاندی آپؐ کی ملکیت ہوگی۔ اہل خیبر نے کہا کہ ہم اس زمین کو آپ سے زیادہ جانتے ہیں، اس لئے ہمیں یہ زمین اس معاہدے پر دیدیجئے کہ آدھا پھل آپکا ہو گا، اور آدھا ہمارا حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آپؐ کے زمینیں ان کو اس معاہدے پر دیدیں۔

اس کے علاوہ امام ابو داؤدؒ نے حضرت بشیر بن یسار کی ایک مفصل روایت نقل کی ہے جس میں انہوں نے بتایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی زمینوں کی چھتیس حصے کر کے انہیں کس طرح مسلمانوں کے درمیان تقسیم فرمایا۔ تقسیم کی یہ تفصیل بیان کرنے کے بعد وہ فرماتے ہیں:

«فلما صارت الأموال بید النبي ﷺ والمسلمین لم یکن لهم عمال یکفونهم عملها. فدعا رسول الله ﷺ الیهود. فعاملهم»

جب تمام جائیدادیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے قبضے میں آگئیں تو اب مسلمانوں کے پاس ایسے کارندے نہیں تھے جو انہیں زمینوں پر کام کرنے سے بے فکر کر سکیں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو بلایا، اور ان سے (مزارعت کا) معاملہ فرمایا۔

ان احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معاملے کی پوری تفصیل بیان کر دی گئی ہے جو آپؐ نے یہودیوں کے ساتھ فرمایا۔ اسے دیکھنے کے بعد اس معاملہ میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ خیبر کی زمینوں کے مالک مسلمان تھے، اور یہودیوں کو ان زمینوں پر کاشتکار کی حیثیت میں باقی رکھا گیا تھا، اور ان سے آدھی پیداوار پر بٹائی کا معاملہ کیا گیا تھا۔ اور یہ معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال تک، بلکہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔

اہل مدینہ کا عام تعامل

یہ دو مثالیں تو خاص طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے عمل سے متعلق تھیں، ان

(۱) سنن ابی داؤد کتاب البیوع، باب المساقاة ص ۴۸۳ ج ۲

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والفیئی، باب ماجاء فی حکم ارض خیبر ص ۴۲۴ ج ۱۔

کے علاوہ مدینہ منورہ میں عہد رسالتؐ اور عہد صحابہؓ میں زمینوں کو بٹائی پر دینے کا عام رواج تھا.
امام بخاریؒ امام ابو جعفر محمد الباقرؒ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ:

«ما بالمدينة أهل بيت هجرة إلا يزرعون على الثلث و الربع»

مدینہ طیبہ میں مہاجرین کا کوئی گھرانہ ایسا نہیں ہے جو تہائی اور چوتھائی پیداوار پر کاشت نہ کرتا ہو۔

اس کے بعد امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ، حضرت سعد بن مالکؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ عمر بن عبدالعزیزؒ، قاسم بن محمدؒ، عروہ بن الزبیرؒ، حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ کی اولاد اور محمد بن سیرینؒ سب مزارعت پر عمل کرتے تھے۔ (۲)

ان دلائل کی روشنی میں یہ بات پوری قوت کے ساتھ ثابت ہو جاتی ہے کہ پیداوار کا فی صد حصہ طے کر کے بٹائی کا معاملہ شریعت میں جائز ہے۔ امام ابو حنیفہ کے بارے میں بیشک یہ مشہور ہے کہ وہ مزارعت کو ناجائز کہتے تھے. لیکن اس کی حقیقت بھی فقہ حنفی کی مشہور کتاب "حاوی القدسی" میں یوں بیان کی گئی ہے کہ:

«كرهها أبو حنيفة، ولم ينه منها أشد النهي»

امام ابو حنیفہؒ نے مزارعت کو ناپسند کیا ہے. لیکن اس سے شدت کے ساتھ منع نہیں کیا

یہی وجہ ہے کہ مزارعت کے معاملے کی جزوی تفصیلات میں امام ابو حنیفہؒ نے بہت سے مسائل بیان فرمائے ہیں۔ اگر مزارعت کا معاملہ ان کے نزدیک بالکل ناجائز ہوتا تو ان مسائل کو بیان کرنے کے کوئی معنی نہیں تھے۔

ہمارے زمانے کی مزارعت کے مفاسد اور ان کا انسداد

مزارعت کے جواز پر مآخذ شریعت سے دلائل کا خلاصہ پیچھے عرض کر دیا گیا ہے۔ اس مسئلے کی مزید تفصیلات اور متعلقہ احادیث پر فنی گفتگو احقر نے صحیح مسلمؒ پر اپنی شرح "تکملہ" فتح الملہم کی پہلی جلد میں کی ہے، جو اہل علم مزید تفصیلات کے خواہش مند ہوں، وہ اس کی طرف رجوع فرما سکتے ہیں (۲) لیکن اس کتاب کی حد تک مذکورہ بالا بحث انشاء اللہ طالبین حق کے لئے کافی ہو گی۔

آخر میں ایک سوال کا جواب دینا مناسب ہو گا۔ آج کل جو حضرات مزارعت کو ناجائز قرار دینے

---

(۲) صحیح البخاری، کتاب الحرث والمزارعۃ، باب المزارعۃ بالشطر ونحوہ۔

پر اصرار فرماتے ہیں. ان کا ایک بنیادی استدلال یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں زمینداری اور جاگیر داری کا جو نظام صدیوں سے رائج ہے. اس میں یہ بات ابھرتا نظر آتی ہے کہ زمینداروں نے اپنے کاشتکاروں پر ناقابل بیان ظلم توڑے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اس ظلم و ستم کا اصل سبب مزارعت کا یہ نظام ہے۔ اگر اسے ختم کر دیا جائے تو کاشتکاروں کو اس ظلم سے نجات مل جائے گی۔

اس سلسلے میں ہم دو نکات کی طرف قارئین کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں:

(۱) بلاشبہ ماضی قریب میں زمینداروں کی طرف سے کاشتکاروں کے ساتھ ظلم و زیادتی اور ناانصافی کے بہت سے روح فرسا واقعات رونما ہوئے ہیں. لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ان افسوسناک واقعات کا سبب "مزارعت" کا معاملہ ہے؟ اگر ان افسوسناک واقعات کا حقیقت پسندی سے جائزہ لیا جائے تو واضح طور پر یہ بات نظر آئے گی کہ ان واقعات کا اصل سبب "مزارعت" کا معاملہ نہیں. بلکہ وہ ناجائز اور فاسد شرطیں ہیں جو زمینداروں نے قولی یا عملی طور سے کاشتکاروں پر عائد کر رکھی تھیں. ان فاسد اور ناجائز شرطوں میں کاشتکاروں سے بیگار لینا. اس پر ناواجبی ادائیگیوں کا بوجھ ڈالنا. اس کی محنت کا منصفانہ معاوضہ نہ دینا. انہیں اپنا غلام یا رعایا سمجھنا. یہ ساری باتیں داخل ہیں۔ حالانکہ شریعت نے جس "مزارعت" کی اجازت دی ہے. وہ دوسرے معاشی معاملات کی طرح ایک معاملہ ہے جس کے دونوں فریق بالکل برابر کی حیثیت رکھتے ہیں. ان میں سے کسی بھی فریق کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو کمتر سمجھے. یا اس پر معاملے کی جائز شرائط کے علاوہ کوئی اضافی شرط عائد کرے. اس سے بیگار لے. یا اس کے ساتھ غلاموں کا سا برتاؤں کرے۔ ان تمام باتوں کا اسلام اور اس کی شریعت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

اسلامی احکام کی رو سے جس طرح ایک شخص اپنا مال دوسرے کو دے کر اس سے مضاربت کا معاملہ کرتا ہے (جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اس مال سے کاروبار کرے، اور جو نفع حاصل کرے وہ دونوں کے درمیان تقسیم ہو جائے) تو اس سے مال دینے والے اور کام کرنے والے کے درمیان ایک معاشی رشتہ قائم ہوتا ہے جس میں دونوں کی حیثیت برابر کے فریقوں کی ہے. ان میں سے کوئی فریق دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں رکھتا. اسی طرح مزارعت میں بھی مالک زمین اور کاشتکار برابر کے دو فریق ہیں. اور کاشتکار کو کمتر سمجھنا. یا اس پر ناواجبی شرائط عائد کرنا اسلامی احکام کے قطعی خلاف ہے۔

اگر ان ناواجب شرائط کو خلاف قانون. بلکہ تعزیری جرم قرار دے کر اس پر موثر عملدر آمد کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ خرابیاں باقی رہیں۔

اس کے علاوہ مزارعت کے معاملے کو ایک منصفانہ معاملہ بنانے کے لئے جس میں کاشت کار کو اپنی محنت کا پورا صلہ مل سکے، حکومت کی طرف سے بہت سے اقدام کئے جا سکتے ہیں جن کے بارے میں معین تجاویز ہم نے آگے "زرعی اصلاحات" کے مقدمے میں اپنے فیصلے کے پیراگراف نمبر ۱۵۰ میں بیان کی ہیں۔

اور اگر بالفرض ان اقدامات کے باوجود کوئی اسلامی حکومت یہ محسوس کرے کہ زمینداروں کی بدعنوانیوں پر قابو پانا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کچھ عرصے کے لئے مزارعت پر پابندی عائد نہ کر دی جائے۔ تو اس کے لئے یہ دعویٰ کرنے کی ضرورت نہیں کہ مزارعت اسلام میں ناجائز ہے، کیونکہ اسلام میں مزارعت جائز ضرور ہے لیکن اسے واجب کسی نے نہیں کہا، بلکہ جیسے پیچھے عرض کیا جا چکا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کوئی مثالی طریقہ بھی قرار نہیں دیا۔ لہذا اگر کوئی صحیح معنی میں اسلامی حکومت ان بدعنوانیوں کے انسداد کے لئے وقتی طور پر "مزارعت" کے طریقے پر پابندی عائد کر دے تو شریعت میں اس کی بھی گنجائش ہے۔ لیکن یہ پابندی اس اشتراکی پروپیگنڈے کے زیر اثر اس بنیاد پر نہیں ہونی چاہئے کہ زمین کی شخصی ملکیت درست نہیں ہے، یا مزارعت بذات خود کوئی ناجائز معاملہ ہے، بلکہ یہ سد ذرائع کے طور پر بدعنوانیوں کے خاتمے کے لئے ہونی چاہئے جو ایک عارضی اور وقتی تدبیر ہوگی، کوئی دائمی حکم نہ ہو گا۔ لیکن زمینداروں کی بدعنوانیوں کو بنیاد بنا کر شخصی ملکیت کے ادارے ہی کو ختم کرنا، یا مزارعت کے معاملے کو اصولی طور پر ہی ناجائز قرار دینا قرآن و سنت کے دلائل کی روشنی میں کسی طرح جائز نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

شوہر کے حقوق اور اس کی حیثیت

جسٹس (ر) مفتی محمد تقی عثمانی

فہرست مضامین

زندگی قانون کے خشک تعلق سے نہیں گزر سکتی

بیوی کے دل میں شوہر کے پیسے کا درد ہو

ایسی عورتوں پر فرشتوں کی لعنت

نفلی روزے کیلئے شوہر کی اجازت

شوہر کی اطاعت نفلی عبادت پر مقدم ہے

گھر کے کام کاج پر اجر و ثواب

جنسی خواہشات کی تکمیل پر اجر و ثواب

اللہ تعالی دونوں کو رحمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں

قضا روزوں میں شوہر کی رعایت

بیوی گھر میں آنے کی اجازت نہ دے

حضرت ام حبیبہؓ کا اسلام لانا

حضور اقدس ﷺ سے نکاح

متعدد نکاح کی وجہ

غیر مسلم کی زبان سے تعریف

معاہدہ کی عہد شکنی

آپ اس بستر کے لائق نہیں

بیوی فوراً آجائے اور روٹی پکانا چھوڑ دے

نکاح جنسی تسکین کا حلال راستہ

نکاح کرنا آسان ہے

برکت والا نکاح

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا نکاح

آج نکاح کو مشکل چیز بنا دیا گیا ہے

جہیز موجودہ معاشرے کی ایک لعنت

عورت کو حکم دیتا کہ وہ شوہر کو سجدہ کرے

یہ دو دلوں کا تعلق ہے

سب سے زیادہ قابل محبت ہستی

جدید تہذیب کی ہر چیز الٹی

بیوی کے حقوق اور اس کی حیثیت

جسٹس (ر) مفتی محمد تقی عثمانی

(صفحہ نمبر 38)

فہرست مضامین

اس کے علاوہ تمہارا ان پر کوئی مطالبہ نہیں

کھانا پکانا عورت کی شرعی ذمہ داری نہیں

ساس، سسر کی خدمت واجب نہیں

ساس سسر کی خدمت اس کی سعادت مندی ہے

بہو کی خدمت کی قدر کریں

ایک عجیب واقعہ

ایسا شخص کھانے کی تعریف نہیں کرے گا

شوہر اپنے ماں باپ کی خدمت خود کرے

عورت کو اجازت کے بغیر باہر جانا جائز نہیں

دونوں مل کر زندگی کی گاڑی کو چلائیں

اگر بے حیائی کا ارتکاب کریں تو؟

خبردار!

بیوی کو جیب خرچ الگ دیا جائے

خرچہ میں فراخدلی سے کام لینا چاہئے

رہائش جائز، آسائش جائز

آرائش بھی جائز

نمائش جائز نہیں

فضول خرچی کی حد

یہ اسراف میں داخل نہیں

ہر شخص کی کشادگی الگ الگ ہے

اس محل میں خدا کو تلاش کرنے والا احمق ہے

غلبہ حال کی کیفیت قابل تقلید نہیں

آمدنی کے مطابق کشادگی ہونی چاہئے

بیویوں کا ہم پر کیا حق ہے؟

اس کا بستر چھوڑ دو

ایسی علیحدگی جائز نہیں

چار ماہ سے زیادہ سفر میں بیوی کی اجازت

بہتر لوگ کون ہیں

آج کے دور میں خوش اخلاقی

حسن اخلاق دل کی کیفیت کا نام ہے

اخلاق پیدا کرنے کا طریقہ

اللہ کی بندیوں کو نہ مارو

حدیث ظنی یا قطعی

صحابہ کرامؓ ہی اس لائق تھے

یہ عورتیں شیر ہوگئیں ہیں

یہ اچھے لوگ نہیں ہیں

دنیا کی بہترین چیز نیک بیوی

بری بیوی سے پناہ مانگو

شوہر کے حقوق اور اس کی حیثیت

آج ہر شخص اپنا حق مانگ رہا ہے!

شریعت میں ہر شخص کو اس بات پر متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے فرائض ادا کرے، حقوق کے مطالبے پر زور نہیں دیا گیا ہے۔ آج کی دنیا حقوق کے مطالبے کی دنیا ہے۔ ہر شخص اپنا حق مانگ رہا ہے۔ اور اس کیلئے مطالبہ کر رہا ہے، تحریکیں چلا رہا ہے، مظاہرے کر رہا ہے ہڑتال کر رہا ہے، گویا کے اپنا حق مانگنے اور اپنے حق کا مطالبہ کرنے کیلئے دنیا بھر کی کوششیں کی جارہی ہیں اور اس کیلئے باقاعدہ انجمنیں قائم کی جارہی ہیں۔ جن کا نام ''انجمن تحفظ حقوق فلاں'' رکھا جاتا ہے، لیکن آج ''ادائیگی فرائض'' کیلئے کوئی انجمن موجود نہیں، کسی بھی شخص کو اس بات کی فکر نہیں ہے کہ جو فرائض میرے ذمے عائد ہیں۔ وہ ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟

مزدور کہتا ہے کہ مجھے میرا حق ملنا چاہئے۔ سرمایہ دار کہتا ہے کہ مجھے میرا حق ملنا چاہئے۔ لیکن دونوں میں سے کسی کو یہ فکر نہیں ہے کہ میں اپنا فریضہ کیسے ادا کروں؟ مرد کہتا ہے کہ مجھے میرے حقوق ملنے چاہئے۔ اور عورت کہتی ہے کہ مجھے میرے حقوق ملنے چاہئے۔ اور اس کیلئے کوشش اور جدوجہد جاری ہے۔ لڑائی ٹھنی ہوئی ہے۔ جنگ جاری ہے۔ لیکن کوئی خدا کا بندہ یہ نہیں سوچتا کہ جو فرائض میرے ذمے عائد ہو رہے ہیں، وہ میں ادا کر رہا ہوں، یا نہیں؟

ہر شخص اپنے فرائض ادا کر رہا ہے!

اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض کی ادائیگی کی طرف توجہ کرے۔ اگر ہر شخص اپنے فرائض ادا کرنے لگے تو سب کے حقوق ادا ہو جائیں۔ اگر مزدور اپنے فرائض ادا کردے تو سرمایہ دار اور مالک کے حقوق ادا ہو گئے، اگر سرمایہ دار اور آجر اپنے فرائض ادا کردے تو مزدور کے حقوق ادا ہو گئے۔ شوہر اگر اپنے فرائض ادا کرے تو بیوی کا حق ادا ہو گیا۔ اور اگر بیوی اپنے فرائض ادا کرے تو شوہر کا حق ادا ہو گیا۔ شریعت کا اصل مطالبہ یہی ہے کہ تم اپنے فرائض ادا کرنے کی فکر کرو۔

پہلے اپنی فکر کرو!

آج ہمارے زمانے میں عجیب الٹی گنگا بہنی شروع ہو گئی ہے۔ کہ جب کوئی شخص اصلاح کا جھنڈا اٹھاتا ہے، تو اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ دوسرا شخص اپنی اصلاح کا آغاز کرے، اپنی فکر نہیں کہ میرے اندر بھی کچھ کوتاہی ہے۔ میں بھی غلطی کا شکار ہوں۔ میں اس کی فکر کروں۔ حالانکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ: ﴿اے ایمان والوں اپنے آپ کی فکر کرو کہ تمہارے ذمے کیا فرائض ہیں اللہ اور اللہ کے

رسول ﷺ کے تم سے کیا مطالبات ہیں؟ شریعت، دیانت، امانت اور اخلاق کے تم سے کیا مطالبات ہیں، ان مطالبات کو بجالاؤ، دوسرا شخص اگر گمراہی میں مبتلا ہے، اور اپنے فرائض انجام نہیں دے رہا ہے تو اس کا نقصان تمہارے اوپر نہیں ہوگا بشرطیکہ تم اپنے فرائض صحیح طریقے سے انجام دے رہے ہو﴾۔

حضور اکرم ﷺ کی تعلیم کا انداز!

حضور اقدس ﷺ کی تعلیم کی بات دیکھئے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں لوگوں سے زکوۃ وصول کرنے کیلئے عامل جایا کرتے تھے۔ جو لوگوں سے زکوۃ وصول کرتے تھے، اور اس زمانے میں زیادہ تر مال مویشیوں یعنی اونٹ، بکریاں، گائے وغیرہ کی شکل میں ہوتا تھا آنحضرت ﷺ جب عاملوں کو بھیجتے تو ان کو ایک ہدایت نامہ عنایت فرماتے کہ تمہیں وہاں جا کر کیا طریقہ اختیار کرنا ہے؟ اس ہدایت نامے میں یہ بھی تحریر فرماتے کہ: ''یعنی تم خود لوگوں کے گھروں پر جا کر زکوۃ وصول کرنا۔ ایسا مت کرنا کے تم ایک جگہ پر بیٹھ جاؤ اور لوگوں کو اس بات کی تکلیف دو کہ وہ زکوۃ کا مال تمہارے پاس لا کر دیں''۔

اور یہ بھی ہدایت فرماتے کہ یعنی جو شخص زکوۃ وصول کرنے میں زیادتی کر رہا ہے، مثلاً جتنی زکوۃ واجب تھی، مقدار میں اس سے زیادہ وصول کر رہا ہے، یا کیفیت میں زیادہ وصول کر رہا ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا کہ ایسا شخص بھی اتنا ہی گناہ گار ہے۔ جتنا زکوۃ نہ دینے والا گناہگار ہے۔ لہذا ایک طرف عاملوں کو تو یہ تاکید کی جارہی ہے کہ تم لوگوں کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔ اور جتنی زکوۃ واجب ہوتی ہے اس سے ایک ذرّہ بھی زیادہ وصول نہ کرو، اگر ایسا کرو گے تو قیامت کے دن تمہاری پکڑ ہوگی۔ دوسری طرف جن لوگوں کے پاس زکوۃ وصول کرنے کیلئے ان عاملوں کو بھیجا جارہا تھا ان سے خطاب کر کے فرمایا کہ: ''یعنی تمہارے پاس زکوۃ وصول کرنے والے آئیں گے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تم سے ناراض ہو کر جائیں۔ تمہارا فرض ہے کہ تم ان کو راضی کرو، اور کوئی ایسی غلطی نہ کرو جس سے وہ ناراض ہو جائیں''۔

کیونکہ درحقیقت وہ میرے فرستادہ اور میرے نمائندے ہیں، اور ان کو ناراض کرنا گویا مجھے ناراض کرنا ہے۔ لہذا عاملین کو یہ تاکید فرمائی کہ تم کسی کے ساتھ زیادتی نہ کرو۔ اور زکوۃ دینے والوں کو یہ تاکید فرمائی کہ جب عاملین تمہارے پاس آئیں تو وہ تم سے راضی ہو کر جائیں۔ ہر ایک کو اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی کا احساس دلایا جارہا ہے۔ آپ ﷺ نے زکوۃ دینے والوں کو یہ نہیں فرمایا کہ تم سب مل کر ایک تحریک چلاؤ کہ یہ جو عاملین زکوۃ وصول کرنے کیلئے آرہے ہیں وہ ہمارے حقوق پامال نہ کریں۔ اس کیلئے انجمن عائد کرو اس

لئے کہ یہ ایک لڑائی کا ذریعہ بن جاتا۔شریعت میں سارا زور اس بات پر ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض کی نگہداشت کرے،فرائض بجا لانے کی فکر کرے،اللہ تعالی کے سامنے ایک ایک عمل کا جواب دینا ہے۔اس کی فکر کرے کہ میں اللہ تعالی کے سامنے ٹھیک ٹھیک جواب دے سکوں گا کہ نہیں؟ دین کا سارا فلسفہ یہ ہے، یہ نہیں ہے کہ ہر شخص دوسروں سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا رہے۔اور اپنے فرائض کی ادائیگی سے غافل رہے۔

زندگی استوار کرنے کا طریقہ!

میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں بھی اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ دونوں کو ان کے فرائض بتادیئے۔شوہر کو بتادیا کہ تمہارے فرائض یہ ہیں،اور بیوی کو بتادیا کہ تمہارے فرائض یہ ہیں۔ ہر ایک اپنے فرائض ادا کرنے کی فکر کرے۔اور درحقیقت زندگی کی گاڑی اسی طرح چلتی ہے کہ دونوں اپنے فرائض کا احساس کریں،اور دوسرے کے حقوق کا پاس کریں۔اپنے حقوق حاصل کرنے کی اتنی فکر نہ ہو۔جتنی دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کی فکر ہو۔اگر یہ جذبہ پیدا ہو جائے تو پھر یہ زندگی استوار ہو جاتی ہے،اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو ہماری زندگی کے استوار کرنے کی اتنی زیادہ فکر ہے کہ قرآن وحدیث ان ہدایات سے بھرے ہوئے ہیں کہ تمہارے فرائض یہ ہیں،اور تمہارے فرائض یہ ہیں۔اور اگر ان فرائض اور تعلقات میں رخنہ پڑ جائے تو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو اس دنیا میں کوئی بات اتنی ناپسند نہیں جتنے میاں بیوی کے باہمی جھگڑے ناپسند ہیں۔

ابلیس کا دربار!

ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ’’یہ ابلیس اور شیطان کبھی کبھی سمندر میں پانی کے اوپر اپنا تخت بچھاتا ہے اور اپنا دربار منعقد کرتا ہے،اس وقت دنیا میں اس کے جتنے چیلے ہیں۔جو اس کی اسکیموں پر اور اس کی ہدایات پر عمل کر رہے ہیں وہ سب اس دربار میں حاضر ہوتے ہیں،اور ان تمام چیلوں سے ان کی کارکردگی کی رپورٹیں طلب کی جاتی ہیں کے تم نے کیا فرائض انجام دیئے؟اس وقت ہر ایک چیلا اپنی کارگزاری بیان کرتا ہے،اور یہ ابلیس تخت پر بیٹھ کر ان کی کارگزاری سنتا ہے۔ایک چیلا آ کر اپنی ایک کارگزاری سناتا ہے کہ ایک شخص نماز پڑھنے کے ارادے سے مسجد کی طرف جا رہا تھا۔میں نے درمیان میں اس کو ایک ایسے کام میں پھنسا دیا،جس سے اس کی نماز چھوٹ گئی ابلیس سن کر خوش ہوتا ہے کہ تم نے اچھا کام کیا۔لیکن بہت زیادہ خوشی کا اظہار نہیں کرتا دوسرا چیلا آ کر بیان کرتا ہے کہ فلاں شخص فلاں عبادت کی نیت سے جا رہا تھا،میں نے اس کو عبادت سے روک دیا۔ابلیس سن کر خوش ہوتا ہے کہ تم نے اچھا کیا۔اسی طرح ہر چیلا اپنی کارگزاری سناتا ہے اور ابلیس سن کر خوش ہو جاتا ہے۔حتی کے ایک چیلا آ کر یہ بیان

کرتا ہے کہ دو میاں بیوی باہمی اتفاق اور محبت کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے، بڑی اچھی زندگی گزر رہی تھی، میں نے جا کر ایک ایسا کام کیا جس کے نتیجے میں دونوں میں لڑائی ہوگئی، اور لڑائی کے نتیجے میں دونوں میں جدائی واقع ہوگئی، جب ابلیس یہ سنتا ہے کہ اس چیلے نے دونوں میاں بیوی کو آپس میں لڑا دیا جو اچھی زندگی گزار رہے تھے۔ خوش ہو کر اپنے تخت سے کھڑا ہو جاتا ہے اور اس چیلے سے معانقہ کرتا ہے۔ اور اس کو گلے لگا لیتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ صحیح معنوں میں میرا نمائندہ تو ہے۔ اور تو نے جو کارنامہ انجام دیا وہ اور کسی نے انجام نہیں دیا''۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو میاں بیوی کے باہمی جھگڑے اور ایک دوسرے سے نفرت اور قطع تعلق کتنے ناپسندیدہ ہیں۔ اور شیطان کو یہ اعمال کتنے محبوب ہیں۔ اس لئے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن و حدیث میں دونوں پر ایک دوسرے کے فرائض اور حقوق بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ اگر انسان ان پر عمل کر لے تو دنیا بھی درست ہو جائے، اور آخرت بھی درست ہو جائے۔

مرد عورت پر حاکم ہے!

اس لئے امام نووی ؒ نے یہ دوسرا باب قائم فرمایا ہے جس کا عنوان ہے ''باب حق الزوجہ علی المراۃ'' یعنی شوہر کے بیوی پر کیا حقوق ہیں اور اس کے تحت قرآنی آیات اور احادیث ذکر فرمائی ہیں۔ سب سے پہلے قرآن کریم کی یہ آیت لائے ہیں۔ یعنی ﴿ مرد عورتوں پر نگہبان اور ان کے منتظم ہیں ﴾۔ بعض حضرات نے اس کا یہ ترجمہ بھی کیا ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ ''قوام'' اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی کام کے کرنے یا اس کا انتظام کرنے کا ذمہ دار ہو، گویا کہ مرد عورتوں پر قوام ہیں۔ ان کے کاموں کے منتظم ہیں۔ اور ان کے حاکم ہیں۔ یہ ایک اصول بیان فرما دیا۔ اس لئے کہ اصولی باتیں ذہن میں نہ ہونے کی صورت میں جتنے کام انسان کرے گا وہ غلط تصورات کے ماتحت کرے گا۔ لہذا مرد کے حقوق بیان کرتے ہوئے عورت کو پہلے اصولی بات سمجھا دی کہ وہ مرد تمہاری زندگی کے امور کا نگہبان اور منتظم ہے۔

آج کی دنیا کا پروپیگنڈا!

آج کی دنیا میں جہاں مرد و عورت کی مساوات ان کی برابری اور آزادیٔ نسواں کا بڑا زور و شور ہے۔ ایسی دنیا میں لوگ یہ بات کرتے ہوئے شرماتے ہیں کہ شریعت نے مرد کو حاکم بنایا ہے اور عورت کو محکوم بنایا ہے۔ اس لئے کہ آج کی دنیا میں یہ پرپیگنڈا کیا جا رہا ہے کہ مرد کی عورت پر بالادستی قائم کر دی گئی ہے۔ اور عورت کو محکوم بنا کر اس کے ہاتھ میں قید کر دیا گیا ہے۔ اور اس کو چھوٹا قرار دے دیا گیا ہے۔

سفر کے دوران ایک کو امیر بنا لو!

لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں، زندگی کا سفر دونوں کو ایک ساتھ طے کرنا ہے، اب زندگی کے سفر کے طے کرنے میں انتظام کی خاطر یہ لازمی بات ہے کہ دونوں میں سے کوئی ایک شخص سفر کا ذمہ دار ہو۔ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے یہ حکم دیا کہ جب بھی دو آدمی کوئی سفر کر رہے ہوں چاہے وہ سفر چھوٹا سا کیوں نہ ہو اس سفر میں اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنا لو امیر بنائے بغیر سفر نہیں کرنا چاہئے۔ تاکہ سفر کے جملہ انتظامات اور پالیسی اس امیر کے فیصلے کے تابع ہوں اگر امیر نہیں بنائیں گے تو ایک بدنظمی ہو جائیگی۔ لہذا جب ایک چھوٹے سے سفر میں امیر بنانے کی تاکید کی گئی ہے تو زندگی کا یہ طویل سفر جو ایک ساتھ گزارنا ہے اس میں یہ تاکید کیوں نہیں ہوگی اپنے میں سے ایک کو امیر بنا لو۔ تاکہ بدنظمی پیدا نہ ہو۔ بلکہ انتظام قائم رہے۔ اس انتظام کو قائم کرنے کیلئے کسی ایک کو امیر بنانا ضروری ہے۔

زندگی کے سفر کا امیر کون ہو!

اب دو راستے ہیں۔ یا تو مرد کو اس زندگی کے سفر کا امیر بنا دیا جائے، یا عورت کو امیر بنا دیا جائے، اور مرد کو اس کا محکوم بنا دیا جائے۔ تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اب انسانی خلقت، فطرت، قوت اور صلاحیتوں کے لحاظ سے بھی اور عقل کے ذریعے انسان غور کرے تو یہی نظر آئے کہ اللہ تعالی نے جو قوت مرد کو عطا کی ہے۔ بڑے بڑے کام کرنے کی جو صلاحیت مرد کو عطا فرمائی ہے۔ وہ عورت کو عطا نہیں کی۔ لہذا اس امارت اور اس سربراہی کا کام صحیح طور پر مرد ہی انجام دے سکتا ہے۔ اور اس کیلئے اپنی عقل سے فیصلہ کرنے کے بجائے اس ذات سے پوچھا جائے جس نے ان دونوں کو بنایا اور پیدا کیا کہ آپ نے دونوں کو سفر پر روانہ کیا۔

اب آپ ہی بتائیں کہ کس کو امیر بنائیں اور کس کو مامور بنائیں اور سوائے اس کے فیصلے کے کسی اور کا فیصلہ قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ خواہ وہ فیصلہ عقلی دلائل سے آراستہ ہو اور اللہ تعالی نے یہ فیصلہ فرما دیا کہ اس زندگی کے سفر کو طے کرنے کیلئے مرد ''قوام، حاکم اور منتظم'' ہیں اگر تم اس فیصلے کو صحیح جانتے ہو، اور مانتے ہو تو اسی میں تمہاری سعادت اور کامیابی ہے۔ اور اگر نہیں مانتے بلکہ اس فیصلے کی خلاف ورزی کرتے ہو۔ اور اس کے ساتھ بغاوت کرتے ہو، تو پھر تم جانو۔ اور تمہاری زندگی جانے، اب تمہاری زندگی خراب ہوگی اور ہو رہی ہے جن لوگوں نے اس فیصلے کے خلاف بغاوت کی ان کا انجام دیکھ لیجئے کہ کیا ہوا؟

اسلام میں امیر کا تصور!

البتہ اللہ تعالی نے جولفظ یہاں استعمال فرمایا، اس کو سمجھ لیجئے، اللہ تعالی نے یہاں ''امیر'' ''حاکم'' اور ''بادشاہ'' کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ ''قوام'' کا لفظ استعمال کیا۔ اور ''قوام'' کے معنی وہ شخص جو کسی کام کا ذمہ دار ہو۔ اور ذمہ دار ہونے کے معنی یہ ہیں کہ بحیثیت مجموعی زندگی گزارنے کی پالیسی وہ طے کرے گا، اور پھر اس پالیسی کے مطابق زندگی گزاری جائے گی۔ لیکن ''قوام'' ہونے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ آقا ہے۔ اور بیوی اس کی کنیز ہے۔ یا بیوی اس کی نوکر ہے۔ بلکہ دونوں کے درمیان امیر اور مامور، حاکم اور محکوم کا رشتہ ہے اور اسلام میں ''امیر'' کا تصور یہ نہیں ہے کہ وہ تخت پر بیٹھ کر حکم چلائے بلکہ اسلام میں امیر کا تصور وہ ہے جو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ: ''قوم کا سرداران کا خادم ہوتا ہے''۔

امیرا ہو تو ایسا!

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ ایک واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ ہم دیوبند سے کسی دوسری جگہ سفر پر جانے لگے تو ہمارے استاد حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ جو دارالعلوم دیوبند میں شیخ الادب کے نام سے مشہور تھے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ سفر میں تھے جب ہم اسٹیشن پر پہنچے تو گاڑی کے آنے میں دیر تھی، مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے فرمایا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب تم کہیں سفر پر جاؤ تو کسی کو اپنا امیر بنالو لہذا ہمیں بھی اپنا امیر بنالینا چاہئے، حضرت والد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ ہم شاگرد تھے وہ استاد تھے۔ اس لئے ہم نے کہا کہ امیر بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ امیر تو بنے بنائے موجود ہیں۔ حضرت مولانا نے پوچھا کہ کون؟ ہم نے کہا کہ امیر آپ ہیں، اس لئے کہ آپ استاد ہیں۔ ہم شاگرد ہیں۔

حضرت مولانا نے کہا اچھا آپ لوگ مجھے امیر بنانا چاہتے ہیں؟ ہم نے کہا کہ جی ہاں: آپ کے سوا اور کون امیر بن سکتا ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ: اچھا ٹھیک ہے، لیکن امیر کا ہر حکم ماننا ہوگا اس لئے کہ امیر کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ہر حکم کی اطاعت کی جائے: جب امیر بنایا ہے تو انشاء اللہ ہر حکم کی اطاعت بھی کریں گے، مولانا نے فرمایا کہ: ٹھیک ہے، میں امیر ہوں اور میرا حکم ماننا جب گاڑی آئی تو حضرت مولانا نے تمام ساتھیوں کا کچھ سامان سر پر اور کچھ ہاتھ میں اٹھایا اور چلنا شروع کر دیا۔ ہم نے کہا کہ: حضرت یہ کیا آپ غضب کر رہے ہیں؟ ہمیں اٹھانے دیجئے۔ مولانا نے فرمایا کہ: نہیں جب امیر بنایا ہے تو اب حکم ماننا ہوگا، اور یہ سامان مجھے اٹھانے دیں، چنانچہ وہ سارا سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھا اور پھر پورے سفر میں جہاں کہیں مشقت کا کام آتا تو وہ کام خود کرتے، اور جب ہم کچھ کہتے تو فوراً مولانا فرماتے کہ دیکھو: تم نے مجھے امیر بنایا ہے اور امیر کا حکم ماننا ہوگا۔ لہذا میرا حکم مانو۔ ان کو امیر بنانا ہمارے لئے

قیامت ہو گیا۔ حقیقت میں امیر کا تصور یہ ہے۔

امیر وہ جو خدمت کرے!

آج ذہن میں جب امیر کا تصور آتا ہے تو وہ بادشاہوں اور بڑے سربراہوں کی صورت میں آتا ہے۔ جو اپنے رعایا کے ساتھ بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے، لیکن قرآن وحدیث کا تصور یہ ہے کہ امیر وہ شخص ہے جو خدمت کرے، جو خادم ہو۔ امیر کے یہ معنی نہیں ہے کہ اس کو بادشاہ بنا دیا گیا ہے اب وہ حکم چلایا کرے گا۔ اور دوسرے اس کے ماتحت نوکر اور غلام بن کر رہیں گے بلکہ امیر کے معنی یہ ہیں کہ بیشک فیصلہ اس کا معتبر ہوگا ساتھ ہی وہ فیصلہ ان کی خدمت کیلئے ہوگا، ان کی راحت اور خیر خواہی کیلئے ہوگا۔

میاں بیوی میں دوستی کا تعلق ہے!

حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ کہ مردوں کو یہ آیت تو یاد رہتی ہے کہ یعنی مرد عورتوں پر حکمران اور حاکم ہیں۔ اب بیٹھ کر عورتوں پر حکم چلا رہے ہیں اور ذہن میں یہ بات ہے کہ عورت کو ہر حال میں تابع اور فرمانبردار ہونا چاہئے اور ہمارا ان کے ساتھ آقا اور نوکر جیسا رشتہ ہے۔ معاذ اللہ۔ لیکن قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور آیت بھی نازل فرمائی ہے۔ وہ آیت مردوں کو یاد نہیں رہتی۔ وہ آیت یہ ہے کہ: (اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہارے جنس کی بیویاں بنائیں تا کہ تم کو ان کے پاس آرام ملے، اور تم دونوں میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی)
(سورہ الروم ۲۱)

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ بیشک مرد عورت کیلئے قوام ہے۔ لیکن ساتھ میں دوستی کا تعلق بھی ہے۔ انتظامی طور پر تو قوام ہے۔ لیکن باہمی تعلق دوستی جیسا ہے، لہذا ایسا تعلق نہیں ہے جیسا آقا اور کنیز کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے دو دوست کہیں سفر پر جا رہے ہوں۔ اور ایک دوست نے دوسرے دوست کو امیر بنا لیا ہو۔ لہذا شوہر اس لحاظ سے تو امیر ہے کہ ساری زندگی کا فیصلہ کرنے کا وہ ذمہ دار ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اس کے ساتھ ایسا معاملہ کرے جیسے نوکروں اور غلاموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس دوستی کے تعلق کے کچھ آداب اور کچھ تقاضے ہیں۔ ان آداب اور تقاضوں میں ناز کی باتیں بھی ہوتی ہیں جن کو حاکم ہونے کے خلاف نہیں کہا جا سکتا۔

ایسا رعب مطلوب نہیں!

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے یہاں بعض مرد حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ ہم حاکم ہیں، لہذا ہمارا اتنا رعب ہونا چاہئے کہ ہمارا نام سن کر بیوی کانپنے لگے اور بے تکلفی کے ساتھ بات نہ کرسکے۔ میرے ایک ہم سبق دوست تھے، انہوں نے ایک مرتبہ بڑے فخر کے ساتھ سے یہ بات کہی کہ جب میں کئی مہینوں کے بعد اپنے گھر جاتا ہوں تو میرے بیوی بچوں کی جرات نہیں ہوتی کہ وہ میرے پاس آجائیں مجھ سے بات کریں۔ بڑے فخر کے ساتھ یہ بات کہہ رہے تھے، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ جب گھر جاتے ہیں تو کیا کوئی درندہ یا شیر چیتا بن جاتے ہیں جس کی وجہ سے بیوی بچے آپ کے پاس آنے سے ڈرتے ہیں؟ انہوں نے کہا نہیں بلکہ اس لئے کہ ہم قوام ہیں، ہمارا رعب ہونا چاہئے۔ اچھی طرح سمجھ لیں کہ قوام ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ بیوی بچے پاس آنے اور بات کرنے سے بھی ڈریں، بلکہ اس کے ساتھ دوستی کا تعلق بھی ہے۔ اور وہ دوستی کا تعلق کس قسم کا ہونا چاہئے؟ سنئے!

حضور ﷺ کی سنت دیکھئے!

ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سے فرمایا کہ ''جب تم مجھ سے راضی ہوتی ہو، اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو، دونوں حالتوں میں مجھے علم ہو جاتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! کس طرح علم ہو جاتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم مجھ سے راضی ہوتی ہو تو رب محمد (محمد ﷺ کے رب کی قسم) کے الفاظ سے قسم کھاتی ہو اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو تو رب ابراہیم (ابراہیم کے رب کی قسم) کے الفاظ سے قسم کھاتی ہو''۔

اس وقت تم میرا نام نہیں لیتیں، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام لیتی ہو، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا نے فرمایا: ''یا رسول اللہ ﷺ میں صرف آپ کا نام چھوڑتی ہوں۔ نام کے علاوہ اور کچھ نہیں چھوڑتی''۔
(صحیح بخاری کتاب الادب باب مایجوز من الھجر ان من عصی حدیث نمبر ۶۰۷۸)

اب آپ اندازہ لگائیں کہ کون ناراض ہو رہا ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا اور کس سے ناراض؟ حضور اقدس ﷺ سے جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا ناز سے بعض اوقات ایسی بات فرما دیتی تھیں جس سے معلوم ہو جاتا تھا کہ ان کے دل میں کدورت اور ناراضگی ہے لیکن اس کو آنحضرت ﷺ نے اپنی ''قوامیت'' کے خلاف نہیں سمجھا بلکہ آنحضرت ﷺ نے بڑی خوش

طبعی کے ساتھ اس کا ذکر فرمایا کہ تمہاری ناراضگی کا مجھے پتہ چل جاتا ہے۔

بیوی کے ناز کو برداشت کیا جائے!

جب ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا پر سنگین تہمت لگائی گئی۔استغفر اللہ۔اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا پر اس تہمت کی وجہ سے قیامت گزر گئی۔آنحضرت ﷺ کو بھی ظاہر ہے کہ اس بات کا قلق تھا کہ لوگوں میں اس قسم کی باتیں پھیل گئی ہیں۔لیکن ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سے یہ فرمادیا کہ:''اے عائشہ! دیکھو بات یہ ہے کہ تمہیں اتنا غمگین ہونے کی ضرورت نہیں اگر تم بے خطا اور بے قصور ہو تو اللہ تعالی ضرور تمہاری برات ظاہر فرمادینگے۔اور اگر خدانخواستہ تم سے کوئی قصور اور غلطی ہوئی ہے تو اللہ تعالی سے توبہ کرلو، استغفار کرلو۔اللہ تعالی معاف فرمادینگے''۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کو یہ بات بہت شاق گزری کہ آپ ﷺ نے یہ دو شقیں کیوں کی کہ اگر بے قصور ہو تو اللہ تعالی برات ظاہر کردیں گے۔اور اگر قصور ہوا ہو تو توبہ کرلو۔اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کے دل میں بھی اس بات کا ہلکا سا احتمال ہے کہ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہوگی۔چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کو اس بات کا بہت سخت صدمہ ہوا، اور صدمہ سے نڈھال ہو کر لیٹ گئیں، اور اسی حال میں اللہ تعالی کی طرف سے برات کی آیات نازل ہوئیں۔اس وقت گھر میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ بھی موجود تھے۔

جب یہ آیات] تو حضور اقدس ﷺ بھی بہت خوش ہوئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ بھی بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ ''اب انشاء اللہ سارا بہتان ختم ہو جائیگا۔اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سے فرمایا کہ خوشخبری سن لو، اللہ تعالی نے تمہاری برات میں آیات نازل فرمادی، اور اب کھڑی ہو جاؤ، اور آکر نبی کریم ﷺ کو سلام کرو، اب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا بستر پر لیٹی ہوئی ہیں، اور برات کی آیات سن لیں، اور لیٹے لیٹے فرمایا کہ یہ تو اللہ تعالی کا کرم ہے کہ اس نے میری برات نازل فرمادی لیکن میں اللہ کے سوا کسی کا شکر ادا نہیں کرتی۔کیونکہ آپ لوگوں نے تو اپنے دل میں یہ احتمال پیدا کرلیا تھا کہ شاید مجھ سے غلطی ہوئی ہے''۔(صحیح بخاری، کتاب التفسیر سورۃ النور باب۔حدیث نمبر ۴۷۵۰)

بظاہر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا نے حضور اقدس کے سامنے کھڑے ہونے سے اعراض فرمایا، لیکن آنحضرت ﷺ نے اس

کو برا نہیں سمجھا، اس لئے کہ یہ ناز کی بات تھی۔ جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کی طرف سے سرزد ہوئی۔ یہ ناز درحقیقت اس دوستی کا تقاضہ ہے، لہذا میاں بیوی کے درمیان صرف حاکمیت اور محکومیت کا رشتہ نہیں ہے بلکہ دوستی کا بھی رشتہ ہے اور اس دوستی کا حق یہ ہے کہ اس قسم کے ناز کو برداشت کیا جائے۔ البتہ جہاں بات بالکل غلط ہوگئی، وہاں آنحضرت ﷺ نے ناگواری اور غصہ کا بھی اظہار فرمایا لیکن اس قسم کی ناز کی باتوں کو حضور اقدس ﷺ نے گوارا فرمایا۔

بیوی کی دلجوئی سنت ہے!

اور دوستی کا حق اس طرح ادا فرمایا کہ کہاں نبی کریم ﷺ کے مقامات اور درجات عالیہ کہ ہر وقت اللہ تعالی کے ساتھ تعلق قائم ہے۔ اور ہم کلامی ہو رہی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ازواج مطہرات ؓ کے ساتھ دلداری اور دلجوئی اور حسن سلوک کا یہ عالم تھا کہ رات کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کو گیارہ عورتوں کا قصہ سنا رہے ہیں کہ یمن کے اندر گیارہ عورتیں تھیں۔ انہوں نے آپس میں یہ طے کیا تھا کہ وہ سب ایک دوسرے کو اپنے اپنے شوہروں کی حقیقی اور واقعی حالت بیان کریں گی یعنی ہر عورت یہ بتائے گی کہ اس کا شوہر کیسا ہے؟ اس کے کیا اوصاف ہیں؟ ان گیارہ عورتوں نے اپنے شوہروں کے اوصاف کس وضاحت اور بلاغت کے ساتھ بیان کئے ہیں کہ ساری ادبی لطافتیں اس پر ختم ہیں۔ وہ سارا قصہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کو سنا رہے ہیں۔

(شمائل ترمذی باب ماجاء فی کلام رسول اللہ ﷺ فی السمر حدیث ام زرع)

بیوی کے ساتھ مذاق سنت ہے!

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں مقیم تھے، اور ان کی باری کا دن تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا نے حضور ﷺ کے لئے ایک حلوہ پکایا اور حضرت سودہ رضی اللہ تعالی عنہا کے گھر پر لائیں، اور لاکر حضور اقدس ﷺ کے سامنے رکھ دیا اور حضرت سودہ بھی سامنے بیٹھی ہوئی تھیں ان سے کہا کہ آپ بھی آجائیں۔ حضرت سودہ رضی اللہ تعالی عنہا کو بات گراں گزری کہ جب حضور اقدس ﷺ میرے گھر میں تھے اور میری باری کا دن تھا تو پھر یہ حلوہ پکا کر کیوں لائیں؟ اس لئے حضرت سودہ نے انکار کر دیا کہ میں نہیں کھاتی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا نے فرمایا کہ یہ حلوہ کھاؤ اور اگر نہیں کھاؤ گی تو پھر یہ حلوہ تمہارے منہ پر مل دونگی۔ حضرت سودہ نے فرمایا کہ میں تو نہیں کھاؤں گی۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا تھوڑا سا حلوہ اٹھا کر حضرت سودہ ؓ کے منہ پر مل دیا۔ اب حضرت

سودہ رضی اللہ تعالی عنہا نے حضور اقدس ﷺ سے شکایت کی کہ یا رسول اللہ! انہوں نے میرے منہ پر حلوہ مل دیا ہے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ قرآن کریم میں آیا کہ: ''یعنی کوئی شخص اگر تمہارے ساتھ برا سلوک کرے تو تم بھی بدلے میں اس کے ساتھ برا سلوک کر سکتے ہو''۔

اب اگر انہوں نے تمہارے منہ پر حلوہ مل دیا ہے تو تم بھی ان کے چہرے پر حلوہ مل دو چنانچہ حضرت سودہ رضی اللہ تعالی عنہا نے تھوڑا سا حلوہ اٹھا کر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کے چہرے پر مل دیا، اب دونوں کے چہروں پر حلوہ ملا ہوا ہے اور یہ سب حضور اقدس ﷺ کے سامنے ہو رہا ہے۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی، پوچھا کون ہے؟ معلوم ہوا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالی عنہ تشریف لائے ہیں (شاید اس وقت تک پردے کے احکام نہیں آئے تھے) جب آپ ﷺ نے یہ سنا کہ حضرت عمرؓ تشریف لائے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم دونوں جلدی جا کر اپنے چہرے دھولو۔ اس لئے کہ عمرؓ آرہے ہیں۔ چنانچہ دونوں نے جا کر اپنے چہرے دھو لیے۔

وہ ذات جس کا ہر آن اللہ جل جلالہ کے ساتھ رابطہ قائم ہے۔ جس کی ہر وقت اللہ تعالی کے ساتھ گفتگو ہو رہی ہے، اور وحی آرہی ہے اور اللہ تعالی کی حضوری کا وہ مقام حاصل ہے جو اس روئے زمین پر کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکتا، لیکن اس کے باوجود ازواج مطہراتؓ کے ساتھ یہ انداز اور ان کی دلداری کا اتنا خیال ہے۔

مقام ''حضوری''!

ہم اور آپ زبان سے ''حضوری'' کا لفظ بول دیتے ہیں۔ لیکن اس کی حقیقت ہمیں معلوم نہیں۔ اگر کوئی شخص اس کا مزہ چکھ لے تو اس کو پتہ لگے گا کہ یہ کیا چیز ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ بعض اوقات اللہ تعالی کے ساتھ حضوری کا خیال اس درجہ بڑھ جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالی کے بعض بندے ایسے ہیں کہ وہ پاؤں پھیلا کر نہیں سوتے، لیٹ نہیں سکتے، اس لئے کہ ہر وقت اللہ تعالی کے سامنے ہونے کا احساس ہوتا ہے، اور جب اپنا بڑا سامنے ہو تو کوئی شخص پاؤں پھیلا کر لیٹے گا؟ ہرگز نہیں لیٹے گا۔

اسی طرح اللہ تعالی کے حاضر ہونے کا احساس اور خیال اس درجہ بڑھ جاتا ہے کہ انسان پاؤں پھیلا کر لیٹ نہیں سکتا۔ لہذا جس ذات

(حضور ﷺ) کو اتنا بڑا مقام حاصل ہو جو دنیا میں کسی اور کو نہیں ہوسکتا۔ وہ ازواج مطہراتؓ کے ساتھ کس طرح خوش طبعی کے معاملات کر لیتے ہیں؟ یہ مقام صرف ایک پیغمبر ہی کو حاصل ہی ہوسکتا ہے۔

ورنہ گھر برباد ہو جائے گا!

بہرحال! چونکہ اللہ تعالی نے مرد کو ''قوام'' بنایا ہے اس لئے فیصلہ اس کا ماننا ہوگا۔ ہاں تم اپنی رائے اور مشورہ دے سکتی ہو۔ اور ہم نے مرد کو یہ ہدایت بھی دے رکھی ہے کہ وہ حتی الامکان تمہاری دلداری کا خیال بھی کرے لیکن فیصلہ اسی کا ہوگا۔ لہذا اگر یہ بات ذہن میں نہ ہو، اور بیگم صاحبہ یہ چاہیں کہ ہر معاملے میں فیصلہ میرا چلے اور مرد قوام نہ بنے، میں قوام بن جاؤں تو یہ صورت فطرت کے خلاف ہے شریعت کے خلاف ہے۔ عقل کے خلاف ہے اور انصاف کے خلاف ہے اور اس کا نتیجہ گھر کی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

عورت کی ذمہ داریاں!

علامہ نوویؒ نے آگے فرمایا کہ: فرمایا کہ نیک عورتوں کا کام کیا ہے؟ نیک عورتوں کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرنے والی۔ اللہ نے جو حقوق شوہر کے عائد کئے ہیں ان حقوق کو صحیح طور بجالانے والی اور شوہر کی غیر موجودگی میں شوہر کے گھر کی حفاظت کرنے والی۔ یہ اللہ تبارک وتعالی نے عوت کا لازمی وصف قرار دیا۔ اور اس کے ذمے یہ فریضہ عائد کیا کہ جب شوہر گھر میں موجود نہ ہو تو اس وقت وہ اس کے گھر کی حفاظت کرے۔

گھر کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ اول تو خود اپنی حفاظت کرے کہ کسی گناہ میں مبتلا نہ ہو اور شوہر کا جو مال ومتاع ہے، اس کی حفاظت کرے۔ اس لئے اس کی حفاظت کی ذمہ داری بیوی پر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ: (صحیح بخاری، کتاب الجمعۃ باب الجمعۃ فی القری والمدن رقم ۸۹۳) عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے یعنی اس کے مال ومتاع کی حفاظت عورت کے ذمہ داری ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اکثر حالات میں عورت کے ذمہ کھانا پکانا واجب نہیں ہوتا۔ لیکن شوہر کے گھر کی حفاظت اور اس کے مال ومتاع کی اس طرح حفاظت کہ وہ مال بیجا خرچ نہ ہو۔ قرآن کریم نے یہ اس کی ذمہ داری قرار دی ہے۔

زندگی قانون کے خشک تعلق سے نہیں گزر سکتی!

یہ جو میں نے کہا کہ عورت کے ذمے کھانا پکانے کی ذمہ داری نہیں ہے۔ وہ ایک قانون کی بات تھی۔ لیکن زندگی قانون کے خشک تعلق

سے نہیں چلا کرتی، لہذا جس طرح قانوناً عورت کے ذمے کھانا پکانا نہیں ہے۔ اسی طرح اگر عورت بیمار ہو جائے تو قانونا شوہر کے ذمہ اس کا علاج کرانا، یا علاج کیلئے خرچہ دینا بھی ضروری نہیں اور قانوناً شوہر کے ذمہ یہ بھی نہیں ہے کہ وہ عورت کو اس کے والدین کے گھر ملاقات کیلئے لیجایا کرے۔ اور نہ یہ ضروری ہے کہ جب عورت کے ماں باپ اپنی بیٹی سے ملاقات کے لئے آئیں تو ان کو گھر میں بٹھائے۔

بلکہ فقہاء کرام نے یہاں تک لکھا ہے کہ ß میں صرف ایک دن عورت کے ماں باپ آئیں اور دور سے ملاقات اور زیارت کر کے چلے جائیں۔ گھر میں بٹھا کر ملاقات کرانا شوہر کے ذمہ ضروری نہیں۔ لہذا اگر قانون کے خشک تعلق کی بنیاد پر اگر زندگی بسر ہونی شروع ہو جائے تو دونوں کا گھر برباد ہو جائے۔ بات جب چلتی ہے جب دونوں میاں بیوی قانون کی بات سے آگے بڑھ کر سنت رسول اللہ ﷺ کی اتباع کریں۔ اور عورتیں ازواج مطہرات ؓ کی سنت کی اتباع کرے۔

بیوی کے دل میں شوہر کے پیسے کا درد ہو!

حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ نے مواعظ میں ذکر فرمایا کہ عورت کے فرائض میں داخل ہے کہ اس کے دل میں شوہر کے پیسے کا درد ہو ،شوہر کا پیسہ غلط جگہ پر بلا وجہ خرچ نہ ہو۔ اور فضول خرچی میں اس کا پیسہ ضائع نہ ہو۔ یہ چیز عورت کے فرائض میں داخل ہے یہ نہ ہو کہ شوہر کا پیسہ دل کھول کر خرچ کیا جا رہا ہے۔ یا گھر کو نوکرانیوں پر چھوڑ دیا گیا ہے وہ جس طرح چاہ رہی ہیں کر رہی ہیں۔ اگر کوئی عورت ایسا کرتی تو یہ قانونی فرائض کے خلاف کر رہی ہے۔

ایسی عورتوں پر فرشتوں کی لعنت!

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی مرد اپنی بیوی کو اپنی طرف بلائے اور یہ میاں بیوی کے مخصوص تعلقات سے کنایہ ہے کہ یعنی شوہر اپنی بیوی کو ان تعلقات کو قائم کرنے کیلئے بلائے اور وہ عورت نہ آئے یا ایسا طرز عمل اختیار کرے کہ جس سے شوہر کا وہ منشاء پورا نہ ہوا اور اس کی وجہ سے شوہر ناراض ہو جائے ساری رات صبح تک فرشتے اس عورت پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں کہ اس عورت پر خدا کی لعنت ہو اور لعنت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالی کی رحمت اس کو حاصل نہیں ہوگی اس لئے کہ تمہارے اتنے حقوق بیان کئے گئے تمہارے حقوق کا لحاظ کیا گیا اس کا منشاء درحقیقت یہ ہے کہ تمہارے اور تمہارے شوہر کے درمیان جو تعلق ہے وہ درست ہو جائے۔

اور اس تعلق کی درستگی کا ایک لازمی حصہ یہ ہے کہ تمہارے ذریعہ شوہر کو عفت حاصل ہو پاک دامنی حاصل ہو نکاح کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ پاک دامنی حاصل ہو اور نکاح کے بعد شوہر کو کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہ رہے۔ اس لئے تمہارے ذمے یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ اس معاملے میں تمہاری طرف سے کوئی کوتاہی نہ ہو اگر کوتاہی ہوگی تو پھر فرشتوں کی طرف سے تم پر لعنت ہوتی رہے گی دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ اگر کوئی عورت اپنے شوہر کا بستر چھوڑ کر رات گزارے تو اس کو فرشتے لعنت کرتے رہتے ہیں یہاں تک کے صبح ہو جائے اب آپ اندازہ لگائیں کہ حدیث شریف میں ایک چھوٹی بات کہی گئی ہے کہ اگر شوہر نے بیوی کو اس کام کیلئے دعوت دی ہے اور وہ انکار کرے یا ایسے طرز عمل اختیار کرے جس سے شوہر کا منشاء پورا نہ ہو سکے تو ساری رات لعنت ہوتی رہتی ہے۔ اور اگر شوہر کی اجازت اور شوہر کی مرضی کے بغیر عورت گھر سے باہر چلی جائے جب تک وہ گھر سے باہر رہے گی اللہ تعالی کے فرشتوں کی لعنت ہوتی رہے گی ان تمام معاملات کی نبی کریم ﷺ نے تفصیل کے ساتھ ایک ایک چیز بیان فرمادی اس لئے کہ یہی چیزیں جھگڑا اور فساد کا باعث ہوتی ہیں۔

شوہر کی اجازت سے نفلی روزے نہ رکھے!

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ''کسی عورت کیلئے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے شوہر کی موجودگی میں روزے رکھے مگر شوہر کی اجازت سے یعنی کسی عورت کیلئے نفلی روزہ رکھنا شوہر کی اجازت کے بغیر حلال نہیں ۔نفلی عبادت کے کتنے فضائل احادیث میں مذکور ہیں لیکن عورت شوہر کی اجازت کے بغیر نہیں رکھ سکتی۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ دن کے وقت روزہ ہونے کی وجہ سے شوہر کو تکلیف ہو اس لئے پہلے شوہر سے اجازت لے لے البتہ شوہر کو چاہئے کہ وہ بلا وجہ بیوی کو نفلی روزے سے منع نہ کرے۔ بلکہ روزے کی اجازت دے دے بعض اوقات میاں بیوی کے درمیان اس بات پر جھگڑا ہو جاتا ہے کہ بیوی کہتی ہے کہ میں روزہ رکھنا چاہتی ہوں اور شوہر کہتا ہے کہ میں اجازت نہیں دیتا اس لئے مرد کو چاہئے کہ وہ بلا وجہ اس فضیلت کو حاصل کرنے سے بیوی کو منع نہ کرے لیکن عورت کیلئے بلا اجازت روزہ رکھنا جائز نہیں اگر شوہر اجازت نہیں دیتا تو عورت وہ نفلی روزہ چھوڑ دے اس لئے کہ شوہر کی اطاعت زیادہ مقدم ہے۔

شوہر کی اطاعت نفلی عبادت پر مقدم ہے!

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے شوہر کی اطاعت کو تمام نفلی عبادتوں پر فوقیت عطا فرمائی ہے۔ لہذا جو ثواب اس

عورت کو روزہ رکھ کر ملتا، اب شوہر کی اطاعت کرنے میں اس سے زیادہ ثواب ملے گا اور وہ عورت یہ نہ سمجھے میں روزہ سے محروم ہوگئی۔ اس لئے کہ وہ یہ سوچے کہ روزہ کس لئے رکھ رہی تھی؟ روزہ تو اسلئے رکھ رہی تھی کہ ثواب ملے گا۔ اور اللہ تعالی راضی ہوں گے اور اللہ تعالی یہ فرمارہے ہیں کہ میں اس وقت راضی نہیں ہوں گا جب تک تیرا شوہر تجھ سے راضی نہیں ہوگا اس لئے جو ثواب تمہیں روزہ رکھ کر ملتا، وہی روزے کا ثواب کھانے پینے کے بعد بھی ملے گا۔ انشاء اللہ

گھر کے کام کاج پر اجر وثواب!

بعض مرتبہ ہم لوگوں کے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات ایک دنیاوی قسم کا معاملہ ہے اور یہ صرف نفسیاتی خواہشات کی تکمیل کا معاملہ ہے، ایسا ہرگز نہیں بلکہ یہ دینی معاملہ بھی ہے اس لئے کہ اگر عورت یہ نیت کرلے کہ اللہ تعالی نے میرے ذمے یہ فریضہ عائد کیا ہے، اور اس تعلق کا مقصد شوہر کو خوش کرنا ہے اور شوہر کو خوش کرنے کے واسطے سے اللہ تعالی کو خوش کرنا ہے تو پھر یہ سارا عمل ثواب بن جاتا ہے گھر کا جو کام خواتین کرتی ہیں، اور اس میں نیت شوہر کو خوش کرنے کی ہے تو صبح سے لیکر شام تک وہ جتنا کام کررہی ہیں وہ سب اللہ تعالی کے ہاں عبادت میں لکھا جاتا ہے چاہے وہ کھانا پکانا ہو گھر کی دیکھ بھال ہو یا بچوں کی تربیت ہو یا شوہر کا خیال ہو یا شوہر کے ساتھ خوش دلی کی باتیں ہوں ان سب پر اجر لکھا جارہا ہے بشرطیکہ نیت درست ہو۔

جنسی خواہشات کی تکمیل پر اجر وثواب!

اور اس موضوع پر صریح حدیث موجود ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا ''کہ میاں بیوی کے جو باہمی تعلقات ہوتے ہیں اللہ تعالی ان پر بھی اجر عطا فرماتے ہیں صحابہ کرامؓ نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ وہ انسان اپنی نفسیانی خواہشات کے تحت کرتا ہے اس پر کیا اجر؟ آپ ﷺ نے فرمایا اگر وہ ان نفسانی خواہشات کو ناجائز طریقے سے پورا کرتے تو اس پر گناہ ہوتا یا نہیں؟ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! گناہ ضرور ہوتا کیونکہ میاں بیوی ناجائز طریقے کو چھوڑ کر جائز طریقے سے نفسانی خواہشات کو میری وجہ سے اور میرے حکم کے ماتحت کررہے ہیں اس لئے اس پر بھی ثواب ہوگا'' (مسند احمد بن حنبلؒ ج ۵ ص ۱۶۹۱۶۷)

اللہ تعالی دونوں کو رحمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں!

ایک حدیث جو میں نے خود تو نہیں دیکھی مگر البتہ حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ کے مواعظ میں یہ حدیث پڑھی ہے اور حضرت تھانوی نے کئی جگہ اس حدیث کا ذکر فرمایا وہ حدیث یہ ہے کہ ''شوہر باہر سے گھر کے اندر داخل ہوا اور اس نے محبت کی نگاہ سے بیوی کو دیکھا اور

بیوی نے محبت کی نگاہ سے شوہر کو دیکھا تو اللہ تعالی دونوں کو رحمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں''۔لہذا یہ میاں بیوی کے تعلقات محض دنیاوی قصہ نہیں ہے یہ آخرت اور جنت اور جہنم بنانے کا راستہ بھی ہے۔

قضا روزوں میں شوہر کی رعایت!

ترمذی شریف میں حدیث ہے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا فرماتی ہیں کہ ''رمضان کے مہینے میں طبعی مجبوری کی وجہ سے روزے مجھ سے قضا ہو جاتے تھے، میں عام طور پر ان روزوں کو آنے والے شعبان کے مہینے میں رکھا کرتی تھی یعنی تقریبا گیارہ ماہ بعد، یہ میں اس لئے کرتی تھی کہ آنحضرت ﷺ بھی کثرت سے روزے رکھا کرتے تھے''۔لہذا اگر اس زمانے میں میں بھی روزے سے ہوں گی اور آپ بھی روزے سے ہوں گے تو یہ صورت زیادہ بہتر ہے۔

بنسبت اس کے کہ میں روزے سے ہوں اور آپ ﷺ کا روزہ نہ ہو حالانکہ وہ نفلی روزے نہیں تھے بلکہ رمضان کے قضا روزے تھے اور قضا روزوں کے بارے میں حکم یہ ہے کہ ان کو جتنا جلدی ہو سکے، ادا کر لینے چاہئے ،لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا صرف آپ ﷺ کی تکلیف کے خیال سے شعبان تک موخر فرماتی تھیں۔
(صحیح مسلم کتاب الصیام باب قضاء رمضان فی شعبان حدیث نمبر ۱۱۴۶۶)

بیوی گھر میں آنے کی اجازت نہ دے!

اس حدیث کا اگلا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ یعنی ''عورت کے ذمے یہ بھی فرض ہے کہ شوہر کے گھر میں آنے میں کسی کو شوہر کی اجازت کے بغیر داخل ہونے کی اجازت نہ دے''۔ یہ کسی ایسے شخص کو گھر کے اندر آنے کی اجازت دینا جس کو شوہر نہ پسند کرتا ہو۔ یہ عورت کیلئے بالکل ناجائز اور حرام ہے۔ایک دوسری حدیث میں اس بات کو اور تفصیل سے بیان فرمایا کہ ''یاد رکھو! تمہارا تمہاری بیویوں پر بھی کچھ حق ہے اور تمہاری بیویوں کے تم پر کچھ حق ہے''۔یعنی دونوں کے ذمے ایک دوسرے کے کچھ حقوق ہیں اور دونوں کے حقوق کی نگہداشت اور پاس داری فریقین پر لازم ہے وہ حقوق کیا ہیں؟

وہ یہ ہیں کہ اے مردوں! تمہارا حق ان بیویوں پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستروں کو ایسے لوگوں کو استعمال نہ کرنے دیں جنہیں تم ناپسند کرتے ہو اور تمہارے گھر میں ایسے لوگوں کو آنے کی اجازت نہ دیں ،جن کا آنا تم ناپسند کرتے ہو، یہاں دو حق بیان فرمائے ایک یہ کہ

بیوی کے ذمے یہ فرض ہے کہ وہ گھر کے اندر کسی ایسے شخص کو آنے نہ دے جس کے آنے کو شوہر ناپسند کرتا ہو، حتی کہ اگر بیوی کے کسی عزیز کا گھر میں آنا شوہر کو ناپسند ہو تو اس صورت میں اپنے عزیزوں کو بھی گھر میں آنے کی اجازت دینا بھی جائز نہیں۔ اور والدین کو بھی صرف اتنی اجازت ہے کہ ß میں ایک مرتبہ آکر بیٹی کی صورت دیکھ لیں۔ اس سے تو شوہر ان کو روک نہیں سکتا۔ لیکن ان کیلئے بھی شوہر کی اجازت کے بغیر گھر میں ٹھہرنا اور رہنا جائز نہیں۔ اسلئے کہ حضور اقدس ﷺ نے صاف لفظوں میں فرمایا کہ جن کو تم ناپسند کرتے ہو ان کو آنے کی اجازت نہ دو چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ اور دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ وہ بیویاں تمہارے بستروں کو استعمال کرنے کی اجازت نہ دیں، جن کو تم ناپسند کرتے ہو، بستر کے استعمال میں سب چیزیں داخل ہیں یعنی بستر پر بیٹھنا، بستر پر لیٹنا، بستر پر سونا یہ سب اس میں داخل ہیں۔

حضرت ام حبیبہؓ کا اسلام لانا!

ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالی عنہا حضور اقدس ﷺ کی زوجہ مطہرہ ہیں۔ حضرات صحابہ کرامؓ کے واقعات کے اندر نور بھرا ہوا ہے۔ یہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالی عنہا حضرت ابوسفیان رضی اللہ تعالی عنہ کی بیٹی ہیں۔ جنہوں نے تقریبا اکیس سال حضور اقدس ﷺ کی مخالفت میں گزارے اور حضور اقدس ﷺ کے خلاف جنگیں لڑیں اور مکہ مکرمہ کے سرداروں میں سے تھے اور آخر میں فتح مکہ کو موقع پر مسلمان ہو کر صحابیؓ بن گئے اور اللہ تعالی کی قدرت کاملہ کا کرشمہ تھا کہ کافروں کے اتنے بڑے سردار کی بیٹی حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالی عنہا اور ان کے شوہر دونوں مسلمان ہو گئے باپ مسلمانوں کی مخالفت اور ان کے ساتھ عداوت میں لگا ہوا ہے۔

اور بیٹی اور داماد دونوں مسلمان ہو گئے، ان دونوں کے مسلمان ہونے سے ابوسفیان کے کلیجے پر چھری چلتی تھی اور ان کو بیٹی اور داماد کا مسلمان ہونا برداشت نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ان کو تکلیفیں پہنچانے کے درپے رہتے تھے۔ اس زمانے میں بہت سے مسلمان کافروں کی تکلیفوں سے تنگ آکر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں میں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالی عنہا اور ان کے شوہر بھی تھے۔ یہ دونوں وہاں جا کر رہنے لگے۔ لیکن اللہ تعالی کی مشیت کے عجیب وغریب انداز ہیں۔ جب حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالی عنہا نے اپنے شوہر کے ساتھ حبشہ میں قیام کیا تو کچھ دنوں کے بعد انہوں نے خواب میں دیکھا کہ میرے شوہر کی صورت بالکل بدل گئی ہے۔ اور مسخ ہو گئی ہے۔ جب یہ بیدار ہوئیں تو ان کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے شوہر کے دین و ایمان پر کچھ خلل آجائے اس کے بعد جب کچھ دن گزرے تو اس خواب کی تعبیر سامنے آگئی اور یہ ہوا کہ شوہر ایک عیسائی کے پاس جایا کرتے تھے اس کے پاس جانے کے نتیجے میں ایمان نکل گیا اور عیسائی بن گئے۔

اب حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالی عنہا پر تو بجلی گر گئی اسلام کے خاطر ماں باپ کو چھوڑا، وطن کو چھوڑا، سارے عزیز واقارب کو چھوڑا اور آ کر اس دیارِ غربت میں مقیم ہوگئے اور لے دے کر ایک شوہر جو ہمدرد اور دم ساز ہوسکتا تھا۔ وہ کافر ہو گیا، اب ان پر تو قیامت گزر گئی۔ اور کچھ دنوں کے بعد ان کے شوہر کا اسی حالت میں انتقال ہو گیا۔ اب یہ حبشہ کے اندر بالکل تنہا رہ گئیں، کوئی پوچھنے والا نہیں۔

حضور اقدس ﷺ سے نکاح!

ادھر حضور اقدس ﷺ کو مدینے میں اس کی اطلاع ملی کے ان کے شوہر عیسائی بن کر انتقال کر گئے ہیں۔ حضرت ام حبیبہؓ دیارِ غیر میں اکیلی اور تنہا ہیں تو حضور ﷺ نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو پیغام بھیجا کہ کیونکہ ام حبیبہؓ دیار غیر میں اکیلی اور تنہا ہیں۔ ان کو میری طرف سے نکاح کا پیغام دیدو چنانچہ نجاشی کی معرفت میں ان کو نکاح کا پیغام بھیجا گیا۔ چنانچہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالی عنہا خود اپنا واقعہ سناتی ہیں کہ ایک دن میں اسی بے بسی کے عالم میں گھر میں بیٹھی تھی اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک کنیز کھڑی ہوئی ہے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالی عنہا اس سے پوچھا کہ کہاں سے آئی ہو؟ اس کنیز نے جواب دیا کہ مجھے حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے بھیجا ہے۔

(یہ وہی نجاشی ہیں جو حضور اقدس ﷺ پر ایمان لاکر مسلمان ہو گئے تھے) انہوں نے پوچھا کہ کیوں بھیجا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ آپ کو حضرت محمد ﷺ نے نکاح کا پیغام بھیجا ہے اور نجاشی بادشاہ کی معرفت بھیجا ہے۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالی عنہا فرماتی ہیں کہ جس وقت یہ الفاظ میرے کان میں پڑے اس وقت مجھے اس قدر مسرت اور حیرت ہوئی کے میرے پاس اس وقت جو کچھ بھی تھا وہ میں نے اٹھا کر کنیز کو دیدیا اور کہا کہ تو میرے لئے اتنی اچھی خبر لائی ہے اس لئے یہ تیرا انعام ہے، اور آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ میں تھے اور کچھ عرصے کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان کو مدینہ منورہ بلوانے کا انتظام فرمایا۔
(الاصابۃ فی تمییز الصحابہ ج ۴ ص ۲۹۸)

متعدد نکاح کی وجہ!

واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو متعدد نکاح فرمائے۔ ناحق شناس لوگ تو معلوم نہیں کیا کیا باتیں کرتے ہیں۔ لیکن ہر نکاح کے پیچھے

بڑی عظیم الشان حکمتیں ہیں۔اس نکاح میں دیکھ لیجئے کہ ام حبیبہ رضی اللہ تعالی عنہا حبشہ میں کس بے بسی کی حالت میں زندگی گزار رہی تھیں۔کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔اب اگر آنحضرت ﷺ ان کی اس طرح دلداری نہ فرماتے تو ان کا کیا بنتا،آپ ﷺ نے اس طریقے سے ان سے نکاح فرما کر ان کو مدینہ طیبہ بلوایا۔

غیر مسلم کی زبان سے تعریف!

یہ بھی آنحضرت ﷺ کا کرشمہ اور معجزہ ہے کہ جس وقت ام حبیبہ رضی اللہ تعالی عنہا کا آپ ﷺ سے نکاح ہو گیا تو اس کی اطلاع حضرت ابوسفیان کو پہنچی اور اس وقت حضرت ابوسفیان حضور ﷺ کے دشمن اور کافر تھے جب ان کو یہ اطلاع ملی کے میری بیٹی کا نکاح آنحضرت ﷺ سے ہو گیا اس وقت بے ساختہ ان کی زبان پر جو کلمہ آیا وہ یہ تھا کہ یہ خبر تو خوشی کی خبر ہے اس لئے کہ محمد ﷺ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جن کے پیغام کو رد کیا جائے۔لہذا یہ تو خوش قسمتی کی بات ہے کہ ام حبیبہ (رضی اللہ تعالی عنہا) وہاں چلی گئیں۔

معاہدہ کی عہد شکنی!

صلح حدیبیہ کے موقع پر آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوسفیان کے درمیان جنگ بندی کا ایک معاہدہ ہوا تھا قطب سیرت میں جس کی تفصیل موجود ہے۔ایک سال تک حضرت ابوسفیان اور دوسرے کافروں نے اس معاہدے کے شرائط کی پابندی کی لیکن ایک سال کے بعد انہوں نے عہد شکنی شروع کر دی اس عہد شکنی کے نتیجے میں حضور اقدس ﷺ نے یہ اعلان فرما دیا کہ اب ہم اس معاہدے کے پابند نہیں رہے اس لئے اب ہم جب چاہیں گے مکہ مکرمہ پر حملہ کر دیں، کیونکہ ہمارے دشمنوں نے جب عہد کا پاس نہیں کیا تو اب ہم بھی اس کے پابند نہیں رہے۔اس اعلان کے بعد حضرت ابوسفیان کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا کے کسی وقت بھی حضور اقدس ﷺ مکہ مکرمہ پر حملہ کر سکتے ہیں۔

آپ اس بستر کے لائق نہیں ہیں!

ایک مرتبہ حضرت ابوسفیان شام سے واپس آرہے تھے کہ مسلمانوں نے ان کو اور ان کے قافلے کو گرفتار کر لیا تو حضرت ابوسفیان رات و رات چھپ چھپا کر مدینہ منورہ میں داخل ہوئے اور یہ خیال ہوا کہ میری بیٹی تو حضور اقدس ﷺ کے گھر میں ہے۔لہذا میں اس سے بات کروں گا تو شاید میری جان بخشی ہو جائے۔چنانچہ یہ چھپ کر حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالی عنہا کے گھر میں داخل ہو گئے بیٹی نے ان کا استقبال کیا۔جس وقت یہ گھر میں داخل ہوئے اس وقت حضور اقدس ﷺ کا بستر گھر میں بچھا ہوا تھا حضرت ابوسفیان نے گھر میں داخل ہو کر اس بستر پر بیٹھنے کا ارادہ کیا،تو حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالی عنہا تیزی سے آگے بڑھیں اور حضور اقدس ﷺ کا بستر ایک

طرف ہٹا کر لپیٹ کر رکھ دیا۔ (حضرت ابوسفیان کو بیٹی کے طرزعمل سے بڑا اچھنبا ہوا، اور عجیب محسوس ہوا اور ایک جملہ یہ کہا کہ رملہ کیا یہ بستر میرے لائق نہیں یا میں اس بستر کے لائق نہیں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالی عنہا نے جواب دیا کہ ''ابا جان یہ بات ہے کہ آپ اس بستر کے لائق نہیں اس واسطے کہ یہ محمد رسول ﷺ کا بستر ہے اور جو آدمی مشرک ہو میں اس کو اپنی زندگی میں اس بستر پر بیٹھنے کی اجازت نہیں دے سکتی'' اس پر (حضرت ابوسفیان (رضی اللہ تعالی عنہ) نے کہا کہ رملہ! مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم اتنی بدل جاؤ گی کہ اپنے باپ کو بھی اس بستر پر بیٹھنے کی اجازت نہیں دو گی حضرت ام حبیبہ کا یہ عمل کہ حضور اقدس ﷺ کے بستر پر اپنے باپ کو بھی بیٹھنے سے منع فرمایا یہ درحقیقت اس حدیث پر عمل ہے کہ جن کو تم ناپسند کرتے ہو ان لوگوں کو وہ بیویاں تمہارا بستر استعمال کرنے کی اجازت نہ دیں

(الاصابة فی تمییز الصحابه ص ۲۹۸)

بیوی فوراً آ جائے!

حضرت طلق بن علی رضی اللہ تعالی عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جب مرد اپنی بیوی کو بلائے تو اس عورت پر واجب ہے کہ وہ فوراً آ جائے خواہ وہ تنور پر ہی کیوں نہ ہو''۔ مراد یہ ہے کہ اگرچہ وہ عورت روٹی پکانے کے کام میں ہی مشغول ہو اس وقت بھی اگر شوہر اپنی حاجت کیلئے اس کو دعوت دے اور بلائے تو انکار نہ کرے۔

نکاح جنسی تسکین کا حلال راستہ!

ان سارے احکام کا مقصد درحقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالی نے ہر مرد وعورت کے اندر فطری طور پر ایک جنسی جذبہ اور خواہش رکھی ہے اور اس فطری جذبہ اور خواہش کی تسکین کیلئے ایک حلال راستہ تجویز فرما دیا ہے۔ وہ ہے نکاح کا راستہ اور شوہر بیوی کے تعلقات میں اس ضرورت کو پورا کرنا اولین اہمیت کا حامل ہے۔ اس لئے حلال کے سارے راستے کھول دیئے تا کہ کسی بھی مرد وعورت کو حرام طریقے سے اس جذبے اور خواہش کی تسکین کا خیال پیدا نہ ہو۔

بیوی کو شوہر سے اور شوہر کو بیوی سے تسکین ہو تا کہ دوسروں کی طرف دیکھنے کی ضرورت پیش نہ آئے نکاح کرنا آسان ہے۔ اسی واسطے اللہ تعالی نکاح کے رشتے کو بہت آسان بنایا کہ صرف مرد وعورت موجود ہوں اور دو گواہ موجود ہوں اور وہ مرد عورت ان گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کر لیں بس نکاح ہو گیا حتی کہ خطبہ نکاح پڑھنا بھی ضروری نہیں البتہ خطبہ پڑھنا سنت ہے۔ اسی طرح کسی قاضی سے یا کسی اور سے نکاح پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے اگر دوسرے سے پڑھوالے تو یہ سنت ہے۔ لیکن اس کے بغیر بھی اگر مرد

وعورت خود دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کرلیں ایک کہے کہ میں نے تم سے نکاح کیا اور دوسرا کہے میں نے قبول کیا۔ نکاح منعقد ہوگیا نکاح کے لئے نہ تو مسجد میں جانے کی ضرورت ہے اور نہ درمیان میں تیسرے شخص کو ڈالنے کی ضرورت ہے تا کہ حلال کا راستہ آسان سے آسان ہو جائے۔

برکت والا نکاح!

اور دوسری طرف یہ تاکید فرمائی کہ نکاح کا معاملہ اور نکاح کی تقریب سادگی اور آسانی کے ساتھ انجام دی جائے۔کوئی رسم کوئی شرط کوئی لمبی چوڑی تقریب کرنے کی ضرورت نہیں حدیث شریف میں فرمایا کہ ''جب اولاد بالغ ہو جائے تو اس کے نکاح کی فکر کرو تا کہ اس کو حرام کی طرف جانے کی خواہش اور ضرورت پیدا نہ ہو اور حلال کا راستہ آسان ہو جائے ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ''سب سے زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جس میں بہت زیادہ آسانی ہو'' اور سادگی ہو نکاح کو جتنا پھیلایا جائے گا اور جتنا اس کے اندر دھوم دھڑکا ہو گا اسی قدر اس میں برکت کم ہوتی چلی جائے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا نکاح!

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالی عنہ جلیل القدر صحابی ہیں اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔یعنی ان دس خوش نصیب صحابہ میں سے ہیں جن کو حضور اقدس ﷺ نے دنیا ہی میں خوش خبری سنادی تھی کہ یہ جنت میں جائیں گے،ایک مرتبہ جب حضور اقدس ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوئے تو حضور اقدس ﷺ نے دیکھا کہ ان کی قمیض کے اوپر زرد نشان اور رنگ لگا ہوا ہے۔آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تمہاری قمیض پر یہ زرد نشان کیسا لگا ہوا ہے؟ انہوں نے جواب میں عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! میں نے ایک خاتون سے نکاح کرلیا ہے۔اور نکاح کے وقت ایک خوشبو لگائی تھی۔اور یہ خوشبو کا نشان ہے،حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ: (صحیح بخاری،کتاب البیوع ،باب''فاذا قضیت الصلاۃ فانتشروا'' حدیث نمبر ۲۰۴۸) اللہ تعالی اس میں تمہارے لئے برکت عطا فرمائیں ولیمہ کرلو چاہے وہ ایک بکری سے کیوں نہ ہو اس حدیث میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں،اور حضور اقدس ﷺ کے انتہائی قریبی صحابی ہیں،لیکن نکاح کی تقریب میں صرف یہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ کو بلایا نہیں بلکہ ذکر تک نہیں کیا اور پھر جب خود حضور اقدس ﷺ نے رنگ کے بارے میں پوچھا تو اس کے جواب کے ضمن میں نکاح کی اطلاع دی۔اور نکاح کی خبر سن کر حضور اقدس ﷺ نے یہ شکایت نہیں کی کہ تم اکیلے نکاح کر کے بیٹھ گئے۔ہمیں بلایا تک نہیں۔۔۔اس لئے کہ شریعت نے نکاح کی تقریب پر سرے سے کوئی شرط اور قید عائد نہیں کی۔

آج نکاح کو مشکل بنا دیا گیا ہے!

حضرت جابر رضی اللہ تعالی عنہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں آئے ،اور عرض کیا ''یا رسول اللہ! میں نے ایک خاتون سے نکاح کرلیا ہے'' (صحیح بخاری ، کتاب النکاح ، باب تزویج الثیبات ، حدیث نمبر ۵۰۷۹) یہ حضور اقدس ﷺ کے بہت قریبی صحابہ میں سے تھے۔اور ہر وقت حضور ﷺ سے ملتے رہتے تھے ،لیکن نکاح میں شرکت کی دعوت نہیں دی۔اس لئے کہ حضور اقدس ﷺ کے عہد مبارک میں اس کا عام رواج تھا کہ نکاح کیلئے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا جاتا تھا یہ نہیں تھا کہ نکاح ہو رہا ہے تو ایک طوفان برپا ہے مہینوں سے اس کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور پورے خاندان میں اس کی دھوم ہے اس کے بغیر نکاح نہیں ہوسکتا۔شریعت نے نکاح کو جتنا آسان کیا تھا ، ہم نے اس کو اپنی غلط رسموں کے ذریعہ اتنا ہی مشکل بنا دیا اس کا نتیجہ دیکھ لیجئے کہ لڑکیاں بغیر نکاح کے گھروں میں بیٹھی ہیں۔

وہ اس لئے گھروں میں بیٹھی ہیں کہ جہیز کرنے کیلئے پیسے نہیں ہیں۔ یا عالی شان تقریب کرنے کیلئے پیسے نہیں ہیں۔اب ان کاموں کیلئے پیسے جمع کرنے کیلئے حلال وحرام ایک ہو رہا ہے۔یہ سب رسومات ہم نے ہندوؤں سے اور عیسائیوں سے لے لی ہیں۔اور حضور ﷺ نے سنت کا جو طریقہ ہمارے لئے فرمایا تھا کہ وہ ہم نے چھوڑ دیا اور آج اس کا نتیجہ ہے کہ حلال کے راستے بند ہیں ، حلال طریقے سے خواہش پوری کرنے کیلئے بہت دولت ہونا ضروری ہے لاکھوں روپیہ ہو۔تب جا کر نکاح کر سکے گا۔ورنہ نہیں ، اور دوسری طرف حرام کے ذرائع چاروں طرف چوپٹ کھلے ہیں۔

جب چاہے ، جس طرح چاہے پوری کرلے۔۔۔دن رات گھر میں ٹی وی چل رہا ہے ، فلمیں آرہی ہیں ، اور اس کے ذریعے نفسانی اور شہوانی جذبات کو برانگیختہ کیا جا رہا ہے۔ان کو بھڑکایا جا رہا ہے ، اگر بازار میں نکلو تو آنکھوں کو پناہ ملنی مشکل ہے۔اور اس کے نتیجے میں فحاشی ، عریانی ، بے غیرتی اور بے حیائی ، اور بے پردگی کی لعنت مسلط ہو رہی ہیں۔لہذا ان رسومات نے ہمارے معاشرے کو تباہی کے کنارے پر پہنچا دیا ہے۔

جہیز موجودہ معاشرے کی ایک لعنت!

اس معاملے میں سب سے زیادہ ذمہ داری ان لوگوں پے عائد ہوتی ہے ، جو کھاتے پیتے ، امیر اور دولت مند گھرانے کہلاتے ہیں۔اس عذاب سے نجات اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کھاتے پیتے اور امیر کہلانے والے لوگ اس بات کا اقدام نہ کریں کہ ہم اپنے

خاندان میں شادیاں اور نکاح سادگی کے ساتھ کریں گے، اوران غلط رسموں کوختم کریں گے۔اس وقت تک تبدیلی نہیں آئے گی، اس لئے کہ ایک غریب آدمی تو یہ سوچتا ہے کہ مجھے اپنے سفید پوشی برقرار رکھتے ہوئے اوراپنی ناک اونچی رکھنے کیلئے مجھے یہ کام کرنا ہی ہے اس کے بغیر میرا گزارہ نہیں ہوگا، اگرلڑکی کو جہیز نہیں دیں گے تو سسرال والے طعنے دیاں کریں گے کہ کیا لیکر آئی تھی۔

آج جہیز کوشادی کا ایک لازمی حصہ سمجھ لیا گیا ہے۔گھر کا سامان ½ کرنا جوشوہر کے ذمے واجب تھا۔وہ آج بیوی کے باپ کے ذمے واجب ہے، گویا کہ وہ باپ اپنی بیٹی اوراپنے جگر کا ٹکڑا بھی شوہر کو دے دے، اوراس کے ساتھ لاکھوں روپیہ بھی دے، گھر کا فرنیچر ½ کرے اوراس طرح وہ دوسرے کا گھر آباد کرے۔شریعت میں اس کی کوئی اصل موجود نہیں ٹھیک ہے اگر کوئی باپ اپنی بیٹی کو کوئی چیز دینا چاہتا ہے تو وہ سادگی کے ساتھ دے دے بہرحال جو متمول اور کھاتے پیتے گھرانے کہلا لتے ہیں، ان پر یہ ذمہ داری زیادہ عائد ہوتی ہے کہ وہ جب تک اس سادگی کو نہیں اپنائیں گے اوراس کو ایک تحریک کی شکل میں نہیں چلائیں گے اس وقت تک اس عذاب سے نجات ملنی مشکل ہے۔اللہ تعالی اپنی رحمت سے یہ بات ہمارے دلوں میں ڈال دے۔آمین

عورت کوحکم دیتا کہ وہ شوہر کوسجدہ کرے!

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اگر میرے لئے کسی کو یہ حکم دینا جائز ہوتا کہ ایک شخص دوسرے کوسجدہ کرے تو میں عورت کوحکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کوسجدہ کرے۔لیکن چونکہ اللہ تعالی کے علاوہ دوسرے کے آگے سجدہ کرنا جائز نہیں، لہذا میں یہ سجدہ کرنے کا حکم نہیں دیتا۔لیکن اگراس دنیا میں کسی انسان کیلئے دوسرے انسان کوسجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورت کوحکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کوسجدہ کرے''۔

یہ دو دِلوں کا تعلق ہے!

زندگی کے سفر میں جہاں مرد وعورت ساتھ زندگی بسر کررہے ہیں۔اس میں اللہ تعالی نے مرد کو ''امیر'' اور ''نگران'' بنایا ہے اس ''امارت'' کے علاوہ اورجتنی امارتیں ہیں وہ سب وقتی اور عارضی ہیں۔آج ایک آدمی امیر اور حاکم بن گیا۔یا ملک کا بادشاہ بنادیا گیا لیکن اس کی حاکمیت اور بادشاہت اورامارت ایک مخصوص وقت تک کیلئے ہے۔کل تک حکام اورامیر بنا ہوا تھا، اورآج وہ جیل خانے میں ہے، کل تک بادشاہ بنا ہوا تھا۔اورآج دوکوڑی کیلئے پوچھنے کو تیار نہیں، لہذا یہ امارتیں اورحکومتیں آنی جانی چیزیں ہیں۔آج ہے اورکل نہیں۔لیکن میاں بیوی کا تعلق یہ زندگی بھر کا تعلق ہے۔دم دم کا ساتھ ہے ایک ایک لمحے کی رفاقت ہے۔لہذا اس تعلق کے نتیجے

میں مرد کو جو امارت حاصل ہوتی ہے وہ مرتے دم تک برقرار رہتی ہے یا جب تک نکاح کا رشتہ برقرار ہے اسلئے یہ ''امارت'' عام امارتوں سے مختلف ہے۔ دوسری امارتوں حاکم کا محکوم کے ساتھ، امیر کا رعیت کے ساتھ صرف ایک ضابطہ کا دستوری اور قانونی تعلق ہوتا ہے، لیکن میاں بیوی کا تعلق محض ضابطہ قانون اور محض خانہ پُری کا تعلق نہیں ہے بلکہ یہ دلوں کا جوڑ ہے یہ دلوں کا تعلق ہے۔ جس کے اثرات ساری زندگی پر محیط ہیں اسی واسطے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ''اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے'' کیونکہ وہ اس کی زندگی بھر کے سفر کا امیر ہے۔

سب سے زیادہ قابل محبت ہستی!

نبی کریم ﷺ کی سنت یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے فرائض کی طرف توجہ دلاتے ہیں جب شوہر سے خطاب تھا اس وقت ساری باتیں عورت کے حقوق کے بارے میں بیان کی جارہی تھیں، کہ عورت کے یہ حقوق ہیں عورت کے یہ حقوق ہیں اور جب عورت سے خطاب ہو رہا ہے تو عورت کو اس کے فرائض کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے، کہ تمہیں یہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے بعد تمہارے لئے سب سے زیادہ قابل احترام اور سب سے زیادہ قابل محبت ہستی اس روئے زمین تمہارا شوہر ہے۔ جب تک یہ بات نہیں سمجھو گی شوہر کے حقوق صحیح طور پر ادا نہیں کر پاؤ گی البتہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا حکم سب پر مقدم ہے۔ جب اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا حکم آجائے تو پھر نہ باپ کی اطاعت نہ ماں کی اطاعت اور نہ شوہر کی اطاعت لیکن اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے بعد شوہر کا درجہ ہے اس کو خوش کرنے کی فکر کرو اس کے حقوق ادا کرنے کی فکر کرو اس کی اطاعت کی فکر کرو۔

جدید تہذیب کی ہر چیز الٹی!

آج ہمارے دور میں ہر چیز کے اندر الٹی گنگا بہنے لگی ہے۔ حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ آج کی تہذیب میں ہر چیز الٹی ہوگئی ہے۔ یہاں تک کہ پہلے چراغ تلے اندھیرا ہوا کرتا تھا اور اب بلب کے اوپر اندھیر ہوتا ہے اور اس درجہ الٹی ہوگئی ہے کہ گھر کا کام کاج اگرچہ شرعاً عورت کے ذمے واجب نہ ہو لیکن حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سنت ضرور ہے، اس لئے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا گھر کا سارا کام خود اپنے ہاتھ سے کیا کرتی تھیں، اور دوسری طرف عورت کو شوہر کی اطاعت کا بھی حکم دیا گیا کہ ان کی اطاعت کرو اب اگر ایک عورت گھر کا کام کاج کرتی ہے، اور اپنے شوہر اور بچوں کیلئے کھانا پکاتی ہے، تو اس پر اس کیلئے اعلیٰ ترین اجر و ثواب لکھا جاتا ہے۔ لیکن آج کی الٹی تہذیب کا فیصلہ یہ ہے کہ عورت کا گھر میں بیٹھنا اور گھر کے کام کاج کو رجعت پسندی دقیانوسیت اور پرانا طریقہ ہے، اور یہ عورت کو گھر کی چار دیواری میں بند کرنا ہے۔ لیکن اگر وہی عورت ہوائی جہاز میں ائیر ہوسٹس بن کر چار سو

آدمیوں کو کھانا کھلائے اوران کے سامنے ٹرے سجا کر لے جائے اور چار سو آدمیوں کی ہولناک نگاہوں کا نشانہ بنے ایک شخص اس سے کوئی خدمت لے رہا ہے، دوسرا شخص اس سے کوئی خدمت لے رہا ہے، اور بعض اوقات بلا وجہ خدمت لیتے ہیں۔کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی کسی نے بیل بجا کر اس کو بلایا اور اسی سے کہا کہ یہ تکیہ اٹھا کر دے دو۔اس خدمت کا نام آج کی جدید تہذیب میں آزادی ہے۔

اور اگر وہی عورت گھر میں اپنے شوہر اپنے بچوں اور اپنے بہن بھائیوں کیلئے یہ خدمت انجام دے، تو اس کا نام ''دقیانوسیت'' ہے، اور یہ ترقی کے خلاف ہے۔اگر وہی عورت ہوٹل میں ''ویٹرس'' بنی ہوئی ہے، اور دن رات لوگوں کی خدمت انجام دے رہی ہے، کھانا کھلا رہی ہے تو وہ ''آزادی نسواں'' کا ایک حصہ ہے، یا وہ کسی کی سکیٹری بن جائے، یا وہ عورت کسی کی اسٹینوگرافر بن جائے، یہ تو آزادی ہے، اور اگر یہی عورت کام گھر میں رہ کر اپنے شوہر اپنے بچوں اور ماں باپ کیلئے یہ کام کرے تو اس کو ''دقیانوسیت'' کا نام دے دیا گیا ہے۔

عورت کی ذمہ داری!

حضور اقدس ﷺ فرمارہے ہیں کہ عورت کے ذمے دنیا کے کسی فرد کی خدمت واجب نہیں، نہ اس کے ذمے کوئی ذمہ داری ہے اور نہ اس کے کاندھوں پر کسی کی ذمہ داری کا بوجھ ہے، تم ہر بوجھ اور ہر ذمہ داری سے آزاد ہو۔لیکن صرف ایک بات ہے کہ تم اپنے گھر میں قرار سے رہو۔اور اپنے شوہر کی اطاعت کرو، اور اپنے بچوں کی تربیت کرو، یہ تمہارا فریضہ اور اس کے ذریعے تم قوم کی تعمیر کرو اور اس کی معمار بن جاؤ۔حضور اقدس ﷺ نے تمہیں عزت کا یہ مقام دیا تھا۔اب تم میں سے جو چاہے اس عزت کے مقام کو اختیار کرے، اور جو چاہے ذلت کے مقام کو اختیار کرے۔جو آنکھوں سے نظر آرہا ہے۔

وہ عورت سیدھی جنت میں جائے گی!

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالی عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس عورت کا انتقال اس حالت میں ہوا کہ اس کا شوہر اس سے خوش ہو تو وہ سیدھی جنت میں جائے گی''۔

وہ تمہارے پاس چند دن کا مہمان ہے!

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''جب کبھی کوئی بیوی اپنے شوہر کو کوئی تکلیف پہنچاتی ہے، (اس لئے کہ بسا اوقات عورت کی طبیعت سلامتی کی حامل نہیں ہوتی اور اس کی طبیعت میں فساد و بگاڑ ہوتا ہے۔ اور اس فساد و بگاڑ کے نتیجے میں اپنے شوہر کو تکلیف پہنچا رہی ہے) تو اس کے شوہر کی جو بیویاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جنت میں حوروں کی شکل میں اس کیلئے مقدر فرمائی ہیں۔ وہ حوریں جنت سے اس دنیاوی بیوی سے خطاب کر کے کہتی ہیں کہ ''تو اس کو تکلیف مت پہنچا اس لئے کہ یہ تمہارے پاس چند دن کا مہمان ہے اور قریب ہے کہ وہ تم سے جدا ہو کر ہمارے پاس آ جائے''۔

یہ بات حضور اقدس ﷺ فسادی طبیعت رکھنے والی بیوی کو متوجہ کر کے فرما رہے ہیں کہ تم جو اپنے شوہر کو جو تکلیف پہنچا رہی ہو اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا اس لئے کہ دنیا میں تو اس کو جو چاہو گی تکلیف پہنچا دو گی، لیکن آخرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا رشتہ ایسی ''حورین'' کے ساتھ قائم فرمائیں گے۔ جو ان شوہروں سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ ان کے دل کو ابھی سے اس بات کی تکلیف ہو رہی ہے کہ دنیا میں ہمارے شوہر کے ساتھ یہ کیسا تکلیف پہنچانے والا معاملہ کیا جا رہا ہے۔

مردوں کیلئے شدید ترین آزمائش!

حضرت سلمہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ''میں نے اپنے بعد کوئی فتنہ ایسا نہیں چھوڑا جو مردوں کیلئے زیادہ نقصان دہ ہو بنسبت عورتوں کے فتنے کے''۔ عورتوں کا فتنہ اس دنیا میں مردوں کیلئے شدید ترین فتنہ ہے۔ اس فتنے کی اگر تشریح لکھی جائے تو ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے کہ یہ عوتیں مردوں کیلئے کس کس طریقے سے فتنہ ہے۔

عورت کس طرح آزمائش ہے!

فتنے کے معنی ہیں ''آزمائش'' اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اس دنیا میں مردوں کی آزمائش کیلئے مقرر فرمایا ہے، اور یہ عورت کس کس طریقے سے آزمائش ہے؟ ایک مختصر مجلس میں اس کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ یہ عورت اس طریقے سے بھی آزمائش ہے، جس طریقے سے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ پیش آئی یعنی مرد کی طبیعت میں عورت کی طرف کشش کا ایک میلان رکھ دیا گیا۔ اب اس کے حلال راستے بھی بیان کر دیئے اور حرام راستے بھی بیان کر دیئے۔ اب آزمائش اس طرح ہے کہ یہ مرد حلال کا راستہ اختیار کرتا ہے یا حرام کا راستہ اختیار کرتا ہے۔

یہ اللہ کی طرف سے سب سے بڑی آزمائش ہے۔اس کے ذریعے دوسری آزمائش اس طرح ہے کہ یہ بیوی تو اس کیلئے حلال ہے اس کے ساتھ کیسا معاملہ کرتا ہے۔اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے جیسے سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، ویسا سلوک کرتا ہے یا اس کی حق تلفی کرتا ہے۔تیسری آزمائش یہ ہے کہ یہ شخص بیوی کی محبت اور اس کے حقوق کی ادائیگی میں ایسا غلو اور انہماک تو نہیں کرتا کہ اس مقابلے میں دین کے احکام کو پس پشت ڈال دے۔ یہ تو اس نے سن لیا کہ بیوی کو خوش کرنا چاہئے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہئے لیکن اب حرام اور ناجائز کاموں میں بھی اس کی دل جوئی کر رہا ہے۔اور اس کی صحیح دینی تربیت نہیں کر رہا اس طرح بھی یہ آزمائش ہے اس لئے کہ مرد کو دونوں طرف خیال رکھنا ہے۔ایک طرف محبت کا تقاضا یہ ہے کہ بیوی پر روک ٹوک نہ کرے، اور دوسری طرف دین کا تقاضا یہ ہے کہ خلاف شرع کاموں پر روک ٹوک کرے۔غرض آزمائشوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔اور اللہ تعالی کی توفیق ہی سے انسان ان تمام آزمائشوں سے سرخ روئی کے ساتھ اس طرح نکل سکتا ہے کہ اس کے حقوق بھی ادا کرے۔اس کی تعلیم وتربیت کا بھی خیال رکھے۔ اس کے نفع ونقصان کا بھی خیال رکھے، اور حرام کی طرف بھی متوجہ نہ ہو، ان تمام باتوں کا خیال کرنا صرف اللہ تبارک وتعالی کی خاص توفیق ہی کے ذریعے ہوسکتا ہے، اسلئے نبی کریم ﷺ نے ایک دعا تلقین فرمائی جو آپ کی ماثورہ دعاؤں میں سے ہے۔

''اے اللہ! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں عورتوں کے فتنے'' سے اشارہ اس بات کی طرف دیا گیا ہے کہ اس آزمائش میں کھرا اترنا اور سرخرو ہونا اللہ تعالی کی خاص توفیق کے بغیر ممکن نہیں۔لہذا انسان کو اللہ تعالی سے رجوع کرتے رہنا چاہئے کہ اے اللہ مجھے اس آزمائش میں پورا اتار دیجئے، اور بہکنے اور پھسلنے سے اور غلطی کا مرتکب ہونے سے بچا لیجئے۔اس لئے اس ماثور دعا کو اپنی دعاؤں میں شامل کر لینا چاہئے۔

ہر شخص نگہبان ہے!

یہ بڑی عجیب وغریب حدیث ہے، اور جوامع الکلم میں سے ہے، اور ہم سے ہر شخص اس حدیث کا مخاطب ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ''تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر شخص اس کے زیر نگہبان اشیاء اور افراد کے بارے میں سوال ہوگا''۔یعنی جن چیزوں کی نگہبانی اس کے سپرد کی گئی تھی اس کے بارے میں اس سے سوال ہوگا۔''راعی'' کے اصل معنی ہوتے ہیں''نگہبان'' اور چرواہے کو بھی''راعی'' کہتے ہیں۔اس لئے کہ وہ بکریوں کی نگہداشت کرتا ہے اور''راعی'' کے معنی''حاکم'' کے بھی ہوتے ہیں اور حکم کے جو ماتحت ہوتے ہیں، ان کو''رعیت'' کہا جاتا ہے۔اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص''راعی'' ہے اور ہر شخص اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا کہ ان کی نگہبانی تم نے کس طرح کی؟

''امیر'' رعایا کا نگہبان ہے!

ہر امیر اپنے زیر نگہبانی افراد کا ''راعی'' اور'' نگہبان'' ہے، اور اس سے سوال ہوگا کہ تم نے ان کی کیسی نگہبانی کی ''امیر'' کے بارے میں اسلام کا تصور یہ نہیں کہ وہ امارت کا تاج سر پر لگا کر لوگوں سے الگ ہو کر بیٹھ جائے، بلکہ امیر کا تصور یہ ہے کہ وہ راعی ہے۔ اسی واسطے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ اگر دریائے فرات کے کنارے اگر کوئی کتا بھی بھوکا مرجائے تو مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ قیامت کے روز مجھ سے سوال ہوگا کہ اے عمر! تیری حکومت میں ایک کتا بھوکا مر گیا۔

''خلافت'' ذمہ داری کا ایک بوجھ!

یہی وجہ ہے کہ جب فاروق اعظم رضی اللہ تعالی عنہ شہادت سے پہلے زخمی ہوئے، تو لوگوں نے کہا کہ آپؓ اپنے بعد خلیفہ بنانے کیلئے کسی کو نامزد کر دیں اور اسی وقت لوگوں نے آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالی عنہ کا نام لیا کہ ان کو خلافت کیلئے نامزد فرمادیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالی عنہ بلا شبہ جلیل القدر صحابی تھے۔ ان کے علم و فضل، تقوی، اخلاص میں کسی کو کوئی شک نہیں ہوسکتا۔

جب لوگوں نے حضرت فاروق اعظم کے سامنے ان کے بیٹے کا نام لیا تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالی عنہ نے پہلے تو ایک جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ تم میرے بعد ایسے شخص کو مجھ سے خلیفہ نامزد کرانا چاہتے ہو جس کو اپنی بیوی کو طلاق دینا بھی نہیں آتا۔ جس کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے زمانے میں ایک مرتبہ اپنی اâ کو ایسی حالت میں طلاق دے دی تھی۔ جب ان کی اâ ماہواری کی حالت میں تھیں، اور ماہواری کی حالت میں طلاق دینا ناجائز ہے۔ ان کو یہ مسئلہ معلوم نہیں تھا۔ اس لئے طلاق دے دی۔ بعد میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اس طلاق سے رجوع کرلو۔ چنانچہ انہوں نے اس طلاق سے رجوع کرلیا۔ اس واقعہ کی طرف حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالی عنہ نے اشارہ فرمایا کہ تم مجھ سے ایسے شخص کو خلیفہ بنوانا چاہتے ہو۔ جسے اپنی بیوی کو طلاق دینی بھی نہیں آتی۔ میں اس کو کیسے خلیفہ بنادوں؟ لوگوں نے پھر اصرار کیا اور کہا حضرت! وہ قصہ آیا گیا ہوگیا۔ مسئلہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے ایسا کرلیا تھا۔ اس واقعہ کی وجہ سے خلافت کی اہلیت سے تو نہیں نکلے، بلکہ وہ اس کے اہل ہیں، آپ ان کو بنادیں اس کے جواب میں جو جملہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالی عنہ نے ارشاد فرمایا وہ یاد رکھنے کے قابل ہے فرمایا کہ بات اصل میں یہ ہے کہ خلافت کا پھندہ خطاب کی اولاد میں سے ایک ہی شخص کے گلے میں پڑ گیا تو کافی ہے۔ اب میں اپنے خاندان میں سے کسی اور

فرد کے گلے میں یہ پھندہ ڈالنا نہیں چاہتا۔ اس لئے یہ امارت اور خلافت درحقیقت ذمہ داری کا بہت بڑا بوجھ ہے، اور آخرت میں جب اللہ تعالی کے سامنے جا کر حساب کتاب دوں۔ تو اگر برابر سرا بر بھی چھوٹ جاؤں تو بہت غنیمت سمجھوں گا۔ یہ ہے امیر کا تصور اور اس کے راعی ہونے کا تصور کہ اس نے امارت کے حق کو کیسے ادا کیا۔ آگے فرمایا کہ:

مرد بیوی بچوں کا نگہبان ہے!

یعنی مرد اپنے گھر والوں کا راعی اور نگہبان ہے۔ گھر والوں میں بیوی اور بچے جو اس کے ماتحت ہیں، جس فیملی کا وہ سربراہ ہے وہ سب آ گئے۔ ہر مرد سے اس کے بارے میں سوال ہوگا کہ اس کے گھرانے کو تمہارے زیر انتظام کیا گیا تھا، بیوی بچے تھے ان کے ساتھ تمہارا کس طرح معاملہ رہا؟ اور ان کی کیسی نگہبانی کی؟ ان کے حقوق کیسے ادا کئے؟ اور کیا تم نے اس بات کی نگہبانی کی کہ وہ دین پر چل رہے ہیں یا نہیں؟ کہیں وہ جہنم کی طرف تو نہیں جا رہے؟ یہ کام تم نے کیا یا نہیں اس کام کا خیال تمہارے دل میں آیا یا نہیں؟ قیامت کے روز مرد سے ان تمام چیزوں کے بارے میں سوال ہوگا جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا کہ ﴿اے ایمان والوں اپنے آپ کو بھی آگ سے بچاؤ اور اپنے گھر والوں کو بھی آگ سے بچاؤ۔﴾

ایسا کرنا درست نہیں کہ خود تو آگ سے بچ کر بیٹھ گئے۔ خود تو نماز بھی پڑھ رہے اور روزہ بھی رکھ رہے ہو، فرائض اور واجبات اور نوافل وتسبیحات سب ادا کر رہے ہو، اور دوسری طرف اولاد غلط راستے کی طرف جا رہی ہے۔ اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔ اس کا کوئی خیال نہیں تو پھر یاد رکھو قیامت کے روز تم سوال سے بچ نہیں سکو گے تم سے بھی سوال ہوگا اور اس کا عذاب بھی ہوگا، کہ تم نے اپنا فریضہ کیوں انجام نہیں دیا تھا؟ اس لئے فرمایا کہ مرد اپنے گھر والوں کیلئے ''راعی ہے آگے فرمایا ''عورت'' شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی نگہبان ہے۔

اور عورت اپنے شوہر کے گھر پر اور اس کی اولاد پر نگہبان ہے۔ گویا عورت کو دو چیزیں سپرد کی گئیں ہیں، ایک شوہر کا گھر دوسرا اس کی اولاد یعنی گھر کی حفاظت کرے۔ گھر کا انتظام صحیح رکھے گھر کے معاملات کی دیکھ بھال صحیح کرے اور دوسرے اولاد کی دیکھ بھال صحیح کرے۔ دنیاوی دیکھ بھال بھی اور دینی دیکھ بھال بھی یہ عورت کے فرائض میں داخل ہے، اور اس حدیث میں ہر ایک کے فرائض بیان کر دیئے گئے ہیں۔

خواتین حضرت فاطمہؓ کی سنت اختیار کریں!

حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالی عنہا جنت کی خواتین کی سردار، نکاح کے بعد حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کے گھر تشریف لے گئیں، تو حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالی عنہما نے آپس میں یہ بات طے کی کہ حضرت علیؓ گھر کے باہر کے کام کریں گے اور حضرت فاطمہؓ گھر کے اندر کے کام کریں گی۔ چنانچہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالی عنہا بڑی محنت سے گھر کے کام انجام دیتی تھیں اور بڑے شوق وذوق سے کرتی تھیں اور اپنے شوہر کی خدمت کرتی تھیں۔لیکن محنت کا کام بہت زیادہ ہوتا تھا۔ وہ زمانہ آج کل کے زمانے کی طرح تو تھا نہیں آج کل تو بجلی کا سوئچ آن کر دیا اور کھانا تیار ہو گیا۔ بلکہ کھانا تیار کرنے کیلئے چکی کے ذریعے آٹا پیتیں، تنور کے لئے لکڑیاں کاٹ کر لاتیں اور تنور سلگاتیں اور پھر روٹی پکاتیں ایک لمبا چوڑا عمل تھا۔جس میں حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالی عنہا کو بڑی مشقت اٹھانی پڑتی تھی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالی عنہا بڑے شوق وذوق سے یہ مشقت اٹھاتی تھیں لیکن جب غزوہ خیبر کے موقع پر حضور اقدس ﷺ کے پاس بہت مال غنیمت آیا، اس مال غنیمت میں غلام اور باندیاں بھی تھیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے صحابہ اکرام میں ان کو تقسیم کرنا شروع کیا، تو حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالی عنہا سے کسی نے کہا کہ آپ بھی جا کر حضور اقدس ﷺ کہہ دیں ایک کنیز اور ایک باندی آپ کو بھی دیدیں۔

چنانچہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالی عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کے گھر میں حاضر ہوئیں، اور ان سے کہا کہ آپ حضور اقدس ﷺ سے کہیں کہ چکی پیستے پیستے میرے ہاتھوں میں گڑھے پڑھ گئے ہیں اور پانی کی مشک اٹھاتے اٹھاتے سینے پر نیل پڑ گئے ہیں۔ اس وقت چونکہ مال غنیمت میں اتنے سارے غلام اور باندیاں آئیں ہیں، کوئی غلام یا باندی اگر مجھے مل جائے تو میں اس مشقت سے نجات پالوں۔ یہ کہہ کر حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالی عنہا واپس اپنے گھر آ گئیں۔ جب حضور اقدس ﷺ اپنے گھر تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا نے حضور اقدس ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ تشریف لائیں تھیں اور یہ فرما رہی تھیں، آخر باپ تھے اور جب ایک باپ کے سامنے چہیتی بیٹی یہ جملہ کہے کہ چکی پیستے پیستے میرے ہاتھوں میں گڑھے پڑ گئے ہیں، اور پانی کی مشک اٹھانے سے سینے پر نیل کے نشان آ گئے ہیں۔ آپ اندازہ لگائیں کہ اس وقت باپ کے جذبات کا کیا عالم ہوگا۔ لیکن حضور اقدس ﷺ نے ان کو اپنے گھر بلایا اور فرمایا کہ فاطمہ! تم نے مجھ سے باندی یا غلام کی درخواست کی ہے لیکن جب تک سارے اہل مدینہ کو غلام اور باندی میسر نہ آ جائیں، اس وقت تک میں محمد ﷺ کی بیٹی کو غلام اور باندی دینا پسند نہیں کرتا۔

خواتین کے لئے نسخہ کیمیا ''تسبیح فاطمی''!

البتہ میں تمہیں ایک ایسا نسخہ بتاتا ہوں، جو تمہارے لئے غلام اور باندی سے بہتر ہوگا وہ نسخہ یہ ہے کہ جب تم رات کے وقت بستر پر لیٹنے

لگو تو اس وقت ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھ لیا کرو، یہ تمہارے لئے غلام اور باندی سے زیادہ بہتر ہوگا بیٹی بھی سرکار دو عالم ﷺ کی بیٹی تھی پلٹ کر کچھ نہیں کہا، بلکہ جو کچھ حضور ﷺ نے فرمایا اسی پر مطمئن ہوگئیں، اور واپس تشریف لے گئیں۔ اسی وجہ سے اس تسبیح کو تسبیح فاطمی کہا جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی بیٹی کو خواتین کیلئے ایک مثال بنا دیا کہ بیوی ایسی ہو قانونی اعتبار سے خواہ کچھ بھی حق ہو لیکن سنت یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے، اور نگہبان ہونے کی وجہ سے وہ اس کے کاموں کو اپنا سمجھ کر انجام دے رہی ہے۔

اولاد کی تربیت ماں کے ذمے ہے!

اور وہ عورت صرف گھر کی ذمہ دار نہیں ہے بلکہ اس کی اولاد کی بھی نگہبان ہے۔ اولاد کی پرورش اولاد کی خدمت اولاد کی تربیت اور ان کی تعلیم کی ذمہ داری حضور ﷺ نے عورت پر ڈالی ہے۔ اگر اولاد کی تربیت صحیح نہیں ہو رہی ہے، ان کے اندر اسلامی آداب نہیں آرہے ہیں، تو اس کے بارے میں پہلے عورت سے سوال ہوگا اور بعد میں مرد سے ہوگا۔ اس لئے کہ ان چیزوں کی پہلے ذمہ داری عورت کی ہے لہذا عورت سے سوال ہوگا۔ تمہاری گود میں پلنے والے بچوں میں دین و ایمان کیوں پیدا نہیں ہوا؟ ان کے دلوں میں اسلامی آداب کیوں پیدا نہیں ہوئے؟ اس لئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ عورت سے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کے بارے میں سوال ہوگا۔ آگے پھر دوبارہ وہی جملہ دہرا دیا کہ تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور ہر شخص سے اس کی زیر رعایت چیزوں کے بارے میں سوال ہوگا۔ اللہ تعالی کی رحمت سے ہم سب ان فرائض کے سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

بیوی کے حقوق اور اس کی حیثیت

حقوق العباد کی اہمیت!

آیات قرآنیہ اور احادیث کی روشنی میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ حقوق العباد کا بیان شروع فرما رہے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے اور اس کے پیغمبر نبی اکرم ﷺ نے بندوں کے جو حقوق ضروری قرار دیئے ہیں اور جن کے تحفظ کا حکم دیا ہے۔ان کا بیان یہاں سے شروع فرما رہے ہیں۔جیسا کہ میں پہلے بھی بار بار عرض کر چکا ہوں کہ ''حقوق العباد'' دین کا بہت اہم شعبہ ہے اور یہ اتنا اہم شعبہ ہے کہ ''حقوق اللہ'' تو توبہ سے معاف ہو جاتے ہیں،یعنی اگر خدانخواستہ حقوق اللہ سے متعلق کوئی کوتاہی سرزد ہو جائے (خدا نہ کرے) تو اس کا علاج بہت آسان ہے کہ انسان کو جب کبھی اس پر ندامت پیدا ہو تو توبہ استغفار کر لینے سے معاف ہو جاتے ہیں،لیکن بندوں کے حقوق ایسے ہیں کہ اگر ان میں کوتاہی ہو جائے تو اگر اس پر کبھی ندامت ہو اور اس پر توبہ استغفار کرے تب بھی وہ گناہ معاف نہیں ہوتے جب تک کے حقدار کو اس کا حق نہ پہنچایا جائے،یا جب تک صاحب حق اس کو معاف نہ کر دے،اسلئے کہ حقوق العباد کا معاملہ بڑا سنگین ہے۔

حقوق العباد سے غفلت!

حقوق العباد کا معاملہ جتنا سنگین ہمارے معاشرے میں اس سے غفلت اتنی ہی عام ہے۔ہم لوگوں نے چند عبادات کا نام دین رکھ لیا ہے یعنی نماز،روزہ،حج،زکوۃ،ذکر،تلاوت،تسبیح وغیرہ ان چیزوں کو تو ہم دین سمجھتے ہیں لیکن حقوق العباد کو ہم نے دین سے خارج کیا ہوا ہے،اور اسی طرح معاشرتی حقوق کو بھی دین سے خارج کر رکھا ہے۔اس میں اگر کوئی شخص کوتاہی یا غلطی کرتا ہے تو اس کو اس کی سنگینی کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

غیبت حقوق العباد میں داخل ہے!

اسکی سادہ سی مثال یہ ہے کہ (خدا نہ کرے) کوئی مسلمان شراب نوشی کی لت میں مبتلا ہو۔تو ہر وہ مسلمان ; ذرہ سا بھی دین سے لگاؤ ہے وہ اس کو برا سمجھے گا،اور خود وہ شخص بھی اپنے فعل پر نادم ہوگا کہ میں یہ گناہ کا کام کر رہا ہوں،لیکن ایک دوسرا شخص ہے جو لوگوں کی غیبت کرتا ہے۔اس غیبت کرنے والے کو معاشرے میں شراب پینے والے کے برابر بُرا نہیں سمجھا جاتا،اور نہ خود غیبت کرنے والا اپنے کو گناہ گار اور مجرم خیال کرتا ہے۔حالانکہ گناہ کے اعتبار سے شراب پینا جتنا بڑا گناہ ہے،غیبت کرنا بھی اتنا ہی بڑا گناہ ہے، بلکہ غیبت اس لحاظ سے شراب پینے سے زیادہ سنگین ہے کہ اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے،اور اس لحاظ سے بھی زیادہ سنگین ہے کہ قرآن

کریم میں اللہ تعالی نے اس کی ایسی مثال دی ہے کہ دوسرے گناہوں کی ایسی مثال نہیں دی۔ چنانچہ فرمایا کہ غیبت کرنے والا ایسا ہے جیسا مردہ بھائی کا گوشت کھانے والا، لیکن اتنی سنگینی کے باوجود یہ گناہ معاشرے میں عام ہوگیا ہے شاید ہی کوئی مجلس اس گناہ سے خالی ہو اور پھر اس کو برُا بھی نہیں سمجھا جاتا گویا کہ دین کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

احسان ہر وقت مطلوب ہے!

میرے شیخ ڈاکٹر عبدالحئی صاحب قدس اللہ سرہ اللہ تعالی ان کے درجات بلند کرے (آمین)۔ ایک دن فرمانے لگے کہ ایک صاحب میرے پاس آئے اور آکر بڑے فخر یہ انداز میں خوشی کے ساتھ کہنے لگے کہ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے ''احسان'' کا درجہ حاصل ہوگیا ہے ''احسان'' ایک بڑا درجہ ہے جس کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ یعنی ''اللہ تعالی کی عبادت اس طرح کرو جیسے کہ اللہ تعالی دیکھ رہا ہے اور اگر یہ نہ ہوسکے تو کم ازکم اس خیال کے ساتھ عبادت کرو کہ اللہ تعالی تجھے دیکھ رہے ہیں اس کو درجہ ''احسان'' کہا جاتا ہے''۔

ان صاحب نے حضرت والا سے کہا کہ مجھے ''احسان'' کا درجہ حاصل ہوگیا ہے، حضرت ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے ان کو مبارکباد دی کہ اللہ تعالی مبارک فرمائے، یہ تو بہت بڑی نعمت ہے، البتہ میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کو یہ ''احسان'' کا درجہ صرف نماز میں حاصل ہوتا ہے، اور جب بیوی بچوں کے ساتھ معاملات کرتے وقت بھی آپ کو یہ خیال آتا ہے کہ اللہ تعالی مجھے دیکھ رہے ہیں؟ یا یہ خیال اس وقت نہیں آتا؟ وہ صاحب جواب میں فرمانے لگے کہ حدیث میں تو یہ آیا ہے کہ جب عبادت کرے تو اس طرح عبادت کرے گویا کہ وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے یا اللہ تعالی اس کو دیکھ رہے ہیں وہ تو صرف عبادت میں ہے ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ ''احسان'' کا تعلق صرف نماز سے ہے، دوسری چیزوں کے ساتھ احسان کا کوئی تعلق نہیں۔

حضرت ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ میں نے اسی لئے آپ سے یہ سوال کیا تھا، اس لئے کہ آج کل عام طور پر غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ ''احسان'' صرف نماز ہی میں مطلوب ہے یا ذکر وتلاوت ہی میں مطلوب ہے، حالانکہ احسان ہر وقت مطلوب ہے زندگی کے ہر مرحلے وشعبے میں مطلوب ہے، دکان پر بیٹھ کر تجارت کر رہے ہو وہاں پر ''احسان'' مطلوب ہے۔ یعنی دل میں یہ استحضار ہونا چاہئے کہ اللہ تعالی مجھے دیکھ رہے ہیں جب اپنے ماتحتوں کے ساتھ معاملات کر رہے ہو اس وقت بھی ''احسان'' مطلوب ہے۔ جب بیوی بچوں اور دوست احباب اور پڑوسیوں سے معاملات کر رہے ہو۔ اس وقت بھی یہ استحضار ہونا چاہئے کہ اللہ تعالی مجھے دیکھ رہے ہیں حقیقت میں

''احسان'' کا مرتبہ یہ ہے کہ صرف نماز تک محدود نہیں ہے۔

وہ خاتون جہنم میں جائیگی!

خوب سمجھ لیں کے نبی اکرم ﷺ کی تعلیم ہمارے زندگی کے ہر شعبے کے ساتھ ہے اسی واسطے روایت میں آتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ سے ایک خاتون کے بارے میں پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ایک خاتون ہے جو دن رات عبادت میں لگی رہتی ہے، نفل نماز اور ذکر وتلاوت بہت کرتی ہے اور ہر وقت اسی میں مشغول رہتی ہے اس خاتون کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کہ اس کا انجام کیسا ہوگا؟ تو آپ نے اُن صحابہ سے پوچھا کہ وہ خاتون پڑوسیوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہے؟ تو صحابہ کرامؓ نے جواب دیا کہ پڑوسیوں کے ساتھ اُسکا سلوک اچھا نہیں ہے۔ پڑوس کی خواتین تو اُس سے خوش نہیں ہیں آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ خاتون جہنم میں جائیگی۔
(الادب المفرد للبخاری ص ۴۸ رقم ۱۱۹ باب لایجزی جارۃ)

وہ خاتون جنت میں جائینگی!

پھر ایک ایسی خاتون کے بارے میں آپ سے پوچھا گیا کہ جو نفلی عبادت تو زیادہ نہیں کرتی تھی صرف فرائض اور واجبات پر اکتفاء کرتی تھی اور زیادہ سے زیادہ سنت موکدہ ادا کرلیتی بس اس سے زیادہ نوافل ذکر وتلاوت نہیں کرتی تھی مگر پڑوسیوں اور دوسروں کے ساتھ اس کے معاملات اچھے تھے آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ خاتون جنت میں جائیگی۔ (حوالۂ بالا)

مفلس کون!

ان احادیث میں آنحضرت ﷺ نے یہ بات واضح فرمادی کہ اگر کوئی شخص نفلی عبادت کرے تو یہ بڑی اچھی بات ہے اور اگر نفلی عبادت نہ کرے تو آخرت میں سوال نہیں ہوگا کہ تو نے فلاں نفلی عبادت کیوں نہ کی اس لئے کہ نفل کا مطلب ہی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کرے تو ثواب ملے گا اور اگر نہ کرے کوئی گناہ بھی نہیں ہوگا لیکن حقوق العباد وہ چیز ہے کہ اس کے بارے میں قیامت کے روز سوال ہوگا اور اس پر جنت اور جہنم کا فیصلہ موقوف ہے چنانچہ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے روز بڑی مقدار میں نماز روزے لے کر آئیگا لیکن دنیا میں کسی کا حق مار دیا کسی کو بُرا کہہ دیا کسی کی دل آزاری کردی تھی اور کسی کا دل دکھایا تھا۔

اب اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ اعمال لیکر آیا تھا وہ سارے کے سارے دوسروں کو دیدیئے اور دوسروں کے گناہ اس پر ڈال دیئے گئے

اس لئے حقوق العباد کا باب شریعت کا بہت اہم باب ہے۔(ترمذی باب ماجاء فی شان الحساب والقصاص۔۔۔۔۲۵۳۳)

حقوق العباد تین چوتھائی دین ہے!

اور یہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ''اسلامی فقہ''جس میں شریعت کے احکام بیان کئے جاتے ہیں۔اس کو اگر چار برابر حصوں میں تقسیم کیا جائے تو اس کا ایک حصہ عبادات کے بیان پر مشتمل ہے اور بقیہ تین حصے حقوق العباد کے بیان میں ہے یعنی معاملات اور معاشرت کو بیان کیا گیا ہے آپ نے''ھدایہ''کا نام سنا ہوگا جو فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہے یہ چار جلدوں پر مشتمل ہے اس کی پہلی جلد میں عبادات کا ذکر ہے جس میں طہارت،نماز،روزہ،زکوۃ اور حج کے احکام بیان کئے گئے ہیں باقی تین جلدیں معاملات معاشرت اور حقوق العباد سے متعلق ہیں اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حقوق العباد تین چوتھائی دین ہے اس لئے یہ بڑا اہم باب شروع ہو رہا ہے۔اللہ تعالی اپنی رحمت سے اس کو عمل کے جذبے سے پڑھنے اور سننے کی توفیق عطا فرمائے اور حقوق العباد کی اپنی رضا اور خوشنودی کے مطابق ادائیگی کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

اسلام سے پہلے عورت کی حالت!

علامہ نووی رحمہ اللہ نے پہلا باب یہ قائم فرمایا''باب الوصیۃ بالنساء''یعنی ان نصیحتوں کے بارے میں جو حضور اکرم ﷺ نے عورتوں کے حقوق سے متعلق بیان فرمائی ہیں اور سب سے پہلے یہ باب اس لئے قائم فرمایا کہ سب سے زیادہ بے اعتدالیاں اور سب سے زیادہ کوتاہیاں اس حق میں ہوتی ہیں جب تک اسلام نہیں آیا تھا اور جب تک نبی کریم ﷺ کی تعلیمات نہیں آئی تھیں اس وقت تک عورت کو ایسی مخلوق سمجھا جاتا تھا جو معاذ اللہ گویا انسانیت سے خارج ہے،اور اس کے ساتھ بھیڑ بکریوں جیسا سلوک کیا جاتا تھا اس کو انسانیت کے حقوق دینے سے لوگ انکار کرتے تھے کسی بھی معاملے میں اس کے حقوق کی پرواہ نہیں کی جاتی تھی اور یہ سمجھا جاتا تھا جیسے کسی نے اپنے گھر میں بھیڑ بکری پالی بالکل اسی طریقے سے اپنے گھر میں ایک عورت کو لا کر بٹھا دیا سلوک کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔

خواتین کے ساتھ حسن سلوک!

حضور اقدس ﷺ نے پہلی بار اس دنیا کو جو آسمانی ہدایت سے بے خبر تھی۔خواتین کے حقوق کا احساس دلایا کہ خواتین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔علامہ نووی رحمہ اللہ نے سب سے پہلے قرآن کریم کی ایک آیت نقل فرمائی ہے جو اس باب میں جامع ترین آیت ہے اس

میں تمام مسلمانوں سے خطاب ہے کہ تم خواتین کے ساتھ ''معروف''یعنی نیکی کے ساتھ اچھا سلوک کر کے زندگی گزارو ان کے ساتھ اچھی معاشرت برَتو انکو تکلیف نہ پہنچاؤ۔

یہ عام ہدایت ہے۔ یہ آیت گویا اس باب کا متن اور عنوان ہے اور حضور اقدس ﷺ نے اس آیت کی تشریح اپنے اقوال اور افعال سے فرمائی، اور حضور اقدس ﷺ کو خواتین کے ساتھ حسن سلوک کا اس درجے اہتمام تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم میں سے سب سے بہترین وہ لوگ ہیں جو اپنی خواتین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے ہیں اور میں تم میں اپنی خواتین کے ساتھ بہترین برتاؤ کرنے والا ہوں''۔ (ترمذی باب ماجاء فی حق المراۃ علی زوجہ حدیث نمبر ۱۱۷۲)

آنحضرت ﷺ کو خواتین کے حقوق کی نگہداشت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا اتنا اہتمام تھا کہ بے شمار احادیث میں اس کی تشریح فرمائی چنانچہ سب سے پہلی حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''میں تم کو عورتوں کے بارے میں بھلائی کی نصیحت کرتا ہوں تم میری اس نصیحت کو قبول کرلو''۔

قرآن کریم صرف اصول بیان کرتا ہے آگے بڑھنے سے پہلے یہاں ایک بات عرض کردوں کہ قرآن کریم میں آپ یہ دیکھیں گے عام طور پر قرآن کریم موٹے موٹے اصول بیان کر دیتا ہے تفصیلات اور جزئیات میں نہیں جاتا انہیں بیان نہیں کرتا یہاں تک کہ نماز جیسا اہم رکن جو دین کا ستون ہے، جس کے بارے میں قرآن کریم میں تہتر ۷۳ مقامات پر حکم کیا کہ نماز قائم کرو۔ لیکن نماز کیسے نماز پڑھی جاتی ہے؟ اس کا طریقہ کیا ہوتا ہے؟ اس کی رکعتیں کتنی ہوتی ہیں؟ اور کن چیزوں سے نماز ٹوٹ جاتی ہے؟ اور کن چیزوں سے نہیں ٹوٹتی؟ یہ تفصیلات قرآن نے بیان نہیں کیں یہ حضور اقدس ﷺ کی تعلیمات پر چھوڑ دیں۔

یہ آپ ﷺ نے اپنی سنت سے بیان فرمائیں، اس طرح زکوۃ کا حکم بھی قرآن کریم میں کم وبیش اتنی ہی مرتبہ آیا ہے لیکن زکوۃ کا نصاب کیا ہوتا ہے؟ کس پر فرض ہوتی ہے کتنی فرض ہوتی ہے؟ کن کن چیزوں پر فرض ہوتی ہے یہ تفصیلات قرآن کریم نے بیان نہیں کیں۔ بلکہ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات پر چھوڑ دیں، معلوم ہوا کہ قرآن کریم عام طور پر اصول بیان کرتا ہے، تفصیلی جزئیات میں نہیں جاتا۔

گھریلو زندگی، پورے تمدّن کی بنیاد ہے!

لیکن مرد اور عورت کے تعلقات، خاندانی تعلقات ایسی چیز ہیں کہ قرآن کریم نے اس کے نازک جزوی مسائل بھی صراحت کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ایک ایک چیز کو کھول کر بیان کر دیا ہے، اور پھر بعد میں نبی کریم ﷺ نے اس کی تشریح فرمائی۔

اس کی کیا وجہ ہے؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ مرد اور عورت کے جو تعلقات ہیں اور انسان کی جو گھریلو زندگی ہے یہ پورے تمدن کی بنیاد ہوتی ہے۔اور اس پر پورے تہذیب و تمدن کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔اگر مرد و عورت کے تعلقات استوار ہیں خوشگوار ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے حقوق ادا کر رہے ہیں تو اس سے گھر کا نظام درست ہوتا ہے اور گھر کا نظام درست ہونے سے اولاد درست ہوتی ہے اور اولاد درست ہونے سے معاشرہ سنورتا ہے اور اس پر پورے معاشرے کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

لیکن اگر گھر کا نظام خراب ہو، اور میاں بیوی کے درمیان رات دن تُو تُو میں میں ہوتی ہے۔تو اس سے اولاد پر بُرا اَثر پڑے گا۔اور اس کے نتیجے میں جو قوم تیار ہو گی اُس کے بارے میں آپ تصور کر سکتے ہیں کہ کسی شائستہ قوم کے افراد بن سکتے ہیں یا نہیں۔اس واسطے اس کو''عائلی احکام'' یعنی گھر داری کے احکام کہا جاتا ہے۔اس لئے قرآن کریم نے ان تعلقات کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی بیان فرمایا ہے۔

عورت کی پیدائش ٹیڑھی پسلی سے ہونے کا مطلب!

اس کے بعد حضور اقدس ﷺ نے بہت اچھی تشبیہ بیان فرمائی ہے، اور یہ اتنی عجیب و غریب اور حکیمانہ تشبیہ ہے کہ ایسی تشبیہ ملنا مشکل ہے۔فرمایا کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے بعض لوگوں نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ اللہ تعالی نے سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اس کے بعد حضرت حوا علیہ السلام کو اُنہی کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔

اور بعض علماء نے اس کی دوسری تشریح یہ بھی کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عورت کی تشبیہ دیتے ہوئے فرما رہے ہیں۔عورت کی مثال پسلی کی سی ہے، کہ جس طرح پسلی دیکھنے میں ٹیڑھی معلوم ہوتی ہے، لیکن پسلی کا حسن اور اس کی صحت اس کے ٹیڑھا ہونے میں ہی ہے، چنانچہ کوئی شخص اگر یہ چاہے کہ پسلی ٹیڑھی ہے، اس کو سیدھا کر دوں تو جب اسے سیدھا کرنا چاہے گا تو وہ سیدھی تو نہیں ہو گی البتہ ٹوٹ جائیگی وہ پھر پسلی نہیں رہے گی۔اب دوبارہ پھر اس کو ٹیڑھا کر کے پلستر کے ذریعے جوڑنا پڑے گا۔

اس طرح حدیث شریف میں عورت کے بارے میں بھی یہی فرمایا ہے: ''اگر تم اسی پسلی کو سیدھا کرنا چاہو گے تو وہ پسلی ٹوٹ جائیگی اور اگر اس سے فائدہ اٹھانا چاہو تو اس کے ٹیڑھے ہونے کے باوجود فائدہ اٹھاؤ گے''۔ یہ بڑی عجیب وغریب اور حکیمانہ تشبیہ حضور اقدس ﷺ نے بیان فرمائی، کہ اس کی صحت ہی اس کے ٹیڑھے ہونے میں ہے اگر وہ سیدھی ہوگی تو وہ بیمار ہے صحیح نہیں ہے۔

یہ عورت کی مذمت کی بات نہیں ہے بعض لوگ اس تشبیہ کو عورت کی مذمت میں استعمال کرتے ہیں کہ عورت ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے، لہذا اس کی اصل ٹیڑھی ہے۔ چنانچہ میرے پاس بہت سے لوگوں کے خطوط آتے ہیں جس میں کئی لوگ یہ لکھتے کہ یہ عورت ٹیڑھی پسلی کی مخلوق ہے۔ گویا کہ اس کو مذمت اور برائی کے طور پر استعمال کرتے ہیں، حالانکہ خود نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد پر منشا یہ نہیں ہے۔

عورت کا ٹیڑھا پن ایک فطری تقاضا ہے!

بات یہ ہے کہ اللہ تعالی نے مرد کو کچھ اور اَوصاف دے کر پیدا فرمایا ہے، اور عورت کو کچھ اور اَوصاف دے کر پیدا فرمایا ہے، دونوں کی فطرت اور سرشت میں فرق ہے۔ سرشت میں فرق ہونے کی وجہ سے مرد عورت کے بارے میں یہ محسوس کرتا ہے کے یہ میری طبعیت اور فطرت کے خلاف ہے، حالانکہ عورت کا تمہاری طبعیت کے خلاف ہونا یہ کوئی عیب نہیں، کیونکہ یہ ان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ ٹیڑھی ہو۔ کوئی شخص پسلی کے بارے میں یہ کہے کہ پسلی کے اندر جو ٹیڑھا پن وہ اس کے اندر عیب ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ عیب نہیں، بلکہ اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ ٹیڑھی ہو، اس لئے آنحضرت ﷺ یہ ارشاد فرمارہے ہیں کہ اگر تمہیں عورت میں کوئی ایسی بات نظر آتی ہے جو تمہاری طبیعت کے خلاف ہو، اور اس کی وجہ سے تم اس کو ٹیڑھا سمجھ رہے ہو تو اس کو اس بناء پر کنڈم نہ کرو، بلکہ یہ سمجھو کہ اس کی فطرت کا مقتضا یہ ہے، اور اگر تم اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی اور اگر فائدہ اٹھانا چاہو گے تو ٹیڑھا ہونے کی حالت میں بھی فائدہ اٹھا سکو گے۔

''غفلت'' عورت کیلئے حسن ہے!

آج الٹا زمانہ آگیا ہے، اس واسطے قدریں بدل گئی ہیں، خیالات بدل گئے، ورنہ بات یہ ہیکہ جو چیز مرد کے حق میں عیب ہے بسا اوقات وہ عورت کے حق میں حسن اور اچھائی ہوتی ہے اگر ہم قرآن کریم کو غور سے پڑھیں تو قرآن کریم میں یہ بات نظر آجاتی ہے کہ جو چیز مرد کے حق میں عیب تھی، وہی چیز عورت کے بارے میں حسن قرار دی گئی۔ اور اس کو نیکی اور اچھائی کی بات کہا گیا ہے۔ مثلا

مرد کے حق میں یہ بات عیب ہے کہ وہ جاہل اور غافل ہو۔

اور دنیا کی اس کو خبر نہ ہو اس لئے کے مرد پر اللہ تعالی نے دنیا کے کاموں کی ذمہ داری رکھی ہے، اس لئے اسکے پاس علم بھی ہونا چاہیئے اور اس کو باخبر بھی ہونا چاہیئے، اگر باخبر نہیں ہے، بلکہ غافل ہے، اور غفلت میں نکلا تو یہ مرد کے حق میں عیب ہے لیکن قرآن کریم نے غفلت کو عورت کے حق میں حسن قرار دیا چنانچہ سورہ نور میں فرمایا: ''یعنی وہ لوگ جو ایسی عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں جو پاک دامن ہیں اور غافل ہیں، یعنی دنیا سے بے خبر ہیں'' تو دنیا سے بے خبری کو ایک حسن کی صفت کے طور پر قرآن کریم نے بیان فرمایا۔

معلوم ہوا کہ عورت اگر دنیا کے کاموں سے بے خبر ہو۔ اور اپنے فرائض کی حق تک واقف ہو اور دنیا کے معاملات اتنے نہ جانتی ہو تو وہ عورت کے حق میں عیب نہیں بلکہ وہ صفت حسن ہے، جس کو قرآن کریم صفت حسن کے طور پر ذکر فرمایا ہے۔

زبردستی سیدھا کرنے کی کوشش نہ کرو!

لہذا جو چیز مرد کے حق میں عیب تھی، وہ عورت کے حق میں عیب نہیں اور جو چیز مرد کے حق میں عیب نہیں تھی بعض اوقات وہ عورت کے حق عیب ہوتی ہے۔ اسلئے اگر تمہیں ان کے اندر کوئی ایسی چیز نظر آئے جو تمہارے لئے تو عیب ہے لیکن عورت کے لئے عیب نہیں تو اس کی وجہ سے عورت کے ساتھ برتاؤ میں خرابی نہ کرو اس لئے کہ پسلی ہونے کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے تمہاری طبیعت سے مختلف ہو تو اب اس کو زبردستی سیدھا کرنے کی کوشش نہ کرو۔

سارے جھگڑوں کی جڑ!

یہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ اور آپ سے زیادہ مرد و عورت کی نفسیات سے کون واقف ہوسکتا ہے، اسلئے حضور اقدس ﷺ نے سارے جھگڑوں کی جڑ پکڑ لی کے سارے جھگڑے صرف اس بناء پر ہوتے ہیں کہ مرد یہ چاہتا ہے کہ جیسا میں خود ہوں، یہ بھی ویسی بن جائے، تو بھائی! جو چیزیں اس کے حق میں اس کے حالات کے لحاظ اس کی فطرت اور سرشت کے لحاظ سے اس کے لئے عیب ہیں، ان کی اصلاح کی فکر کرو، اور انکی اصلاح کی فکر بھی مرد کی ذمہ داری ہے۔ لیکن اگر تم یہ چاہو کہ وہ تمہارے مزاج اور طبیعت کے موافق ہو جائے، یہ نہیں ہوسکتا۔

اس کی کوئی عادت پسندیدہ بھی ہوگی!

اِس باب کی دوسری حدیث بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے۔اُس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ایک عجیب و غریب اصول بیان فرمایا کہ'' کوئی مومن مرد کسی مومن عورت سے بالکل یہ بغض نہ رکھے''،یعنی یہ نہ کرے اس کو بالکلیہ کنڈم قرار دیدے،اور یہ کہے کہ اس میں تو کوئی اچھائی نہیں۔اگر اس کی کوئی بات ناپسند ہے تو اس کی دوسری کوئی بات پسند بھی ہوگی۔

پہلا اصول نبی کریم ﷺ نے یہ بتادیا کہ جب دو انسان ایک ساتھ رہتے ہیں تو کوئی بات دوسرے کی اچھی لگتی ہے،اور کوئی بری لگتی۔اگر کوئی بات بُری لگ رہی ہے تو اس کی وجہ سے اس کو علی الاطلاق بُرا نہ سمجھو،بلکہ اس وقت اسکے اچھے اَوصاف کا اِستحضار کرو،اسکے اندر آخر کوئی اچھائی بھی تو ہوگی بس اس اچھائی کا اِستحضار کر کے اللہ تعالی کا شکر ادا کرو کہ یہ اچھائی تو اس کے اندر ہے۔اگر یہ عمل کروگے تو ہوسکتا ہے کہ اسکے اندر جو برائیاں ہیں تمہارے دل کے اندر اس کی اتنی زیادہ اہمیت باقی نہ رہے۔اصل بات یہ ہے کہ آدمی ناشکرا ہے اگر دو تین باتیں ناپسند اور بری لگیں،بس!انہیں تو لیکر بیٹھ گیا کہ اس میں تو یہ خرابی ہے۔اس میں تو وہ خرابی ہے۔اب اچھائی کی طرف دھیان نہیں۔اس لئے ہر وقت روتا رہتا ہے۔اور ہر وقت اس کی برائیاں کرتا رہتا ہے۔اور اس کے نتیجے میں اس کے ساتھ بدسلوکی کرتا ہے۔

ہر چیز خیر و شر سے مخلوط ہے!

دنیا کے اندر کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ جس کے اندر برائی نہ ہو اور اس میں کوئی نہ کوئی اچھائی نہ ہو۔اللہ تعالی نے یہ دنیا بنائی ہے اس میں ہر چیز کے اندر خیر اور شر مخلوط ہے۔کوئی چیز اس کائنات میں خیر مطلق نہیں اور کوئی شر مطلق نہیں اس میں خیر و شر ملے جلے ہوتے ہیں،کوئی کافر یا مشرک یا کوئی بُرا انسان ہے،اگر اس کے اندر بھی اچھائی تلاش کروگے تو کوئی نہ کوئی اچھائی ضرور مل جائے گی۔

انگریزی کی ایک کہاوت!

انگریزی کی ایک کہاوت ہے۔اور ہمارے حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ'' حکمت کی بات مومن کی گمشدہ متاع ہے۔جہاں وہ اس کو پائے۔اُسے لے لے۔''لہذا انگریزی کی کہاوت ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ضرور غلط ہی ہو۔بات بڑی حکیمانہ ہے،کسی نے کہا کہ وہ'' گھنٹا یا گھڑی جو بند ہوگئی ہو۔وہ بھی دن میں دوبار سچ بولتی ہے۔''مثلاً فرض کروکے بارہ بج کر پانچ منٹ پر گھڑی بند ہوگئی،اب ظاہر ہے کہ ہر وقت تو وہ صحیح ٹائم نہیں بتائیگی۔بلکہ غلط بتائے گی۔لیکن دن میں دو مرتبہ ضرور صحیح ٹائم بتائے گی۔ایک دن

میں بارہ بج کر پانچ منٹ پر اور ایک رات بارہ بج کر پانچ منٹ پر، تو دو مرتبہ وہ ضرور سچ بولے گی۔

اچھائی تلاش کروگے تو مل جائے گی کہاوت کہنے والے کا مقصد یہ ہے کہ چاہے کتنی بھی بے کار اور بُری چیز ہو۔لیکن اس میں اچھائی تلاش کروگے تو مل ہی جائے گی۔اسی طرح دنیا کے اندر کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسکے اندر کوئی نہ کوئی اچھائی نہ ہو۔

کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں!

ہمارے والد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ اقبال مرحوم کا ایک شعر بہت پڑھا کرتے تھے ۔ نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں مطلب یہ ہے کہ جو چیز بھی اللہ تعالی نے پیدا کی ہے۔اپنی حکمت اور مشیت سے پیدا فرمائی ہے۔اگر غور کروگے تو ہر ایک کے اندر حکمت اور مصلحت نظر آئیگی۔لیکن ہوتا یہ ہے کہ آدمی صرف برائیوں کو دیکھتا رہتا ہے اچھائیوں کی طرف نگاہ نہیں کرتا۔اس وجہ سے وہ بددل ہوکر ظلم اور ناانصافی کا ارتکاب کرتا ہے۔

عورت کے اچھے وصف کی طرف نگاہ کرو!

چنانچہ اللہ تعالی نے فرمادیا کہ: ''اگر تمہیں وہ عورتیں پسند نہیں ہیں جو تمہاری نکاح میں آگئیں تو اگرچہ وہ تمہیں ناپسند ہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالی نے ان میں بہت خیر رکھی ہو''۔اس لئے حکم یہ ہیکہ عورت کے اچھے وصف کی طرف نگاہ کرو اس سے تمہارے دل کو تسلی بھی ہوگی اور بدسلوکی کے راستے بھی بند ہوں گے۔

ایک بزرگ کا سبق آموز واقعہ!

حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ تعالی نے ایک بزرگ کا قصہ لکھا ہے کہ ایک بزرگ کی بیوی بہت لڑنے جھگڑنے والی تھی۔ ہر وقت لڑتی رہتی تھی جب گھر میں داخل ہوتے تو لعنت ملامت لڑائی جھگڑا شروع ہوجاتا۔کسی صاحب نے ان بزرگ سے کہا کہ دن رات کی جھک جھک اور لڑائی آپ نے کیوں پالی ہوئی ہے؟ یہ قصہ ختم کردیجئے اور طلاق دیدیجے۔تو ان بزرگ نے جواب دیا کے بھائی! طلاق دینا تو آسان ہے، جب چاہوں گا، دیدوں گا، بات دراصل یہ ہے کہ اس عورت میں اور تو بہت سی خرابیاں نظر آتی ہیں۔

لیکن اس کے اندر ایک وصف ایسا ہے۔ جس کی وجہ سے میں ان کو نہیں چھوڑوں گا۔ اور کبھی طلاق نہیں دوں گا۔ اور وہ یہ ہیکہ اللہ تعالی نے اسکے اندر وفاداری کا ایسا وصف رکھا ہے کہ اگر بالفرض میں گرفتار ہو جاؤں اور پچاس سال تک جیل میں بند رہوں تو مجھے یقین ہے کہ میں اس کو جس کونے میں بٹھا کر جاؤں گا اسی کونے میں بیٹھی رہیگی۔ اور کسی اور کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھے گی۔ اور یہ وفاداری ایسا وصف ہے کہ اسکی کوئی قیمت نہیں ہوسکتی۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ اور نازک مزاجی!

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کا نام سنا ہوگا۔ بڑے ولی اللہ گزرے ہیں اور ایسے نفیس مزاج اور نازک مزاج بزرگ تھے کہ اگر کسی صراحی کے اوپر گلاس ٹیڑھا رکھ دیا تو اس کو ٹیڑھا دیکھ کر سر میں درد ہو جاتا تھا۔ ایسے نازک مزاج آدمی تھے۔ ذرا بستر پر شکنیں آ جائیں تو سر میں درد ہو جاتا تھا۔ لیکن ان کو بیوی جو ملی وہ بڑی بدسلیقہ، بدمزاج، زبان کی پھوہڑ، ہر وقت کچھ نہ کچھ بولتی رہتی تھیں۔ اللہ تعالی اپنے نیک بندوں کو عجیب عجیب طریقوں سے آزماتے ہیں اور انکے درجات بلند فرماتے ہیں یہ اللہ تعالی کی طرف سے ایک آزمائش تھی لیکن انہوں نے ساری عمر ان کے ساتھ نبھایا۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالی میرے گناہوں کو شاید اس طرح معاف فرمادیں۔

ہمارے معاشرے کی خواتین دنیا کی حوریں ہیں!

ہماری حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے ہندوستان پاکستان کے معاشرے کی خواتین دنیا کی حوریں ہیں۔ اور اسکی وجہ سے یہ بیان فرماتے کہ ان کے اندر وفاداری کا وصف ہے جب سے مغربی تہذیب وتمدن کا وبال آیا ہے اس وقت سے رفتہ رفتہ یہ وصف بھی ختم ہوتا جارہا ہے لیکن اللہ تعالی ان کے اندر وفاداری کا ایسا وصف رکھا ہے کہ چاہے کچھ ہو جائے لیکن یہ اپنے شوہر پر جان نثار کرنے کیلئے تیار ہے اور اس کی نگاہ شوہر کے علاوہ کسی اور پر نہیں پڑتی۔

بہرحال ان بزرگ نے حقیقت میں اسی حدیث پر عمل کر کے دکھلایا کہ اگر ایک بات ناپسند ہے اس عورت کی، تو دوسری بات پسند بھی ہوگی اس کی طرف دھیان اور خیال کرو، اور اس کے نتیجے میں اس کے ساتھ حسن سلوک کرو، ساری خرابی یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ برائیوں کی طرف نگاہ ہوتی ہے، اچھائیوں کی طرف نگاہ نہیں ہوتی۔

بیوی کو مارنا بداخلاقی ہے!

اس باب کی تیسری حدیث ہے۔ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور اس خطبے میں بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں لیکن اس خطبے میں اس باب سے متعلق جو باتیں ارشاد فرمائیں وہ یہ کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "یہ بُری بات ہے کہ تم میں سے ایک شخص اپنی بیوی کو اسطرح مارتا ہے جیسے آقا اپنے غلام کو مارتا ہے۔ اور دوسری طرف اسی سے اپنے جنسی خواہش بھی پوری کرتا ہے" یہ کتنی بداخلاقی اور بے غیرتی کی بات ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو اس طرح مارے جس طرح غلام کو مارا جاتا ہے۔

بیوی کی اصلاح کے تین درجات!

جیسا کہ میں نے عرض کیا، قرآن کریم نے میاں بیوی کے تعلقات کی چھوٹی چھوٹی جزئیات اور مسائل کا حکم بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے میاں بیوی کے درمیان چپقلش کا پہلا درجہ یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ شوہر کو بیوی کی کوئی بات ناپسند ہوگئی اس کا حل قرآن کریم نے یہ بتادیا کہ جب ایک بات تمہیں ناپسند ہوگئی تو تم یہ دیکھو کہ دوسری بات اس کے اندر پسندیدہ ہوگی اور پھر بھی اگر شوہر یہ سمجھتا ہے کہ اس کے اندر بعض باتیں ایسی ہیں جو قابل برداشت نہیں ہیں بلکہ اصلاح کے لائق ہیں اور ظاہر ہے مرد کو اس بات کا بھی مکلّف بنایا گیا ہے کہ اگر وہ بیوی میں کوئی بات قابل اصلاح اور بری دیکھے تو اس کی اصلاح کی فکر کرے لیکن اس کی اصلاح کا طریقہ کیا ہونا چاہئے؟ وہ طریقہ قرآن کریم نے یہ بتادیا کہ سب سے پہلے تو ان کو نرمی خوش اخلاقی اور محبت سے نصیحت کرو، یہ اصلاح کا پہلا درجہ ہے، اگر نصیحت کے ذریعے وہ باز آجائیں تو بس، اب آگے قدم نہ بڑھاؤ، اور اگر وعظ ونصیحت کا اثر نہ ہو تو پھر اصلاح کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ ان کیساتھ سونا چھوڑ دو، اپنا بستر الگ کردو، اگر ذرا بھی سمجھ ہوگی، فہم میں درستگی ہوگی تو اب باز آجائینگی، (بستر الگ کرنے کی تفصیل مستقل حدیث کے تحت آرہی ہے)

بیوی کو مارنے کی حد!

اور اگر اصلاح کا دوسرا درجہ بھی کارگر ثابت نہ ہو تو پھر تیسرا درجہ اختیار کرو، وہ ہے مارنا، لیکن مار کیسی ہونی چاہئے؟ اور کس قدر ہونی چاہئے؟ اسکے بارے میں حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم ﷺ اُمّت کو جو آخری نصیحتیں فرمائیں، اُن میں یہ نصیحت بھی فرمائی کہ "یعنی اوّل تو مار کا مرحلہ آنا ہی نہیں چاہئے اور اگر آئے بھی تو اس صورت کو صرف اس وقت استعمال کیا جائے جب اسکے علاوہ کوئی چارہ باقی نہ رہ جائے اس لئے کہ مار بالکل آخری چارۂ کار ہے، اور اس میں یہ قید لگادی کے وہ مار تکلیف دینے والی نہ ہو، یعنی اس مار سے تکلیف دینا مقصود نہ ہو بلکہ تادیب مقصود ہو، اور اصلاح مقصود ہو اس لئے تکلیف دینے والی ایسی مار جائز نہیں جس سے نشان پڑ

جائیں ۔(مارنے کے بارے میں مزید تفصیل انشاء اللہ آگے مستقل حدیث کے تحت آ رہی ہے)

بیویوں کے ساتھ آپ کا سلوک !

اور جب نبی کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے اس وقت نو ازواج مطہرات ؓ آپ ﷺ کے نکاح میں تھیں، اور وہ ازواج مطہرات آسمان سے نازل کئے ہوئے فرشتے نہیں تھیں وہ اسی معاشرے کے افراد میں سے تھیں اور ان کے درمیان وہ باتیں بھی ہوا کرتی تھیں جو سوکنوں کے درمیان آپس میں ہوا کرتی ہیں ۔اور وہ مسائل بھی کھڑے ہوتے تھے جو بعض اوقات شوہر اور بیوی میں کھڑے ہو جاتے ہیں، لیکن عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا فرماتی ہیں کہ ’’ساری عمر نہ صرف یہ کہ کسی خاتون پر ہاتھ نہیں اٹھایا بلکہ جب کبھی گھر کے اندر داخل ہوتے تو چہرہ مبارک پر تبسم ہوتا تھا‘‘۔

آپ ﷺ کی سنت !

تو سرکار دو عالم کی سنت یہی ہے کہ ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا جائے ،اور مارنے کی جو اجازت ہے، وہ ناگزیر حالت کے اندر ہے، ورنہ عام حالت میں تو مارنے کی اجازت بھی نہیں اور نبی کریم ﷺ کی سنت بھی نہیں ہے، سنت وہ ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے چہرہ مبارک پر تبسم ہوتا تھا۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی کرامت !

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب قدس اللہ سرہ اللہ تعالی ان کے درجات بلند فرمائے آمین ہمیں کبھی کبھی تعلیم کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ ’’ آج میرے نکاح کو پچپن سال ہو گئے ہیں لیکن الحمد للہ کبھی اس پچپن سال کے عرصے میں لہجہ بدل کر بات نہیں کی‘‘ میں کہا کرتا ہوں کہ لوگ پانی پر تیرنے اور ہوا میں اڑنے کو کرامت سمجھتے ہیں اصل کرامت تو یہ ہے کہ پچپن سال بیوی کے ساتھ زندگی گزاری اور یہ تعلق ایسا ہوتا ہے کہ جس میں یقیناً ناگواریاں پیدا ہوتی ہیں ۔ یہ بات ممکن نہیں کے ناگواری نہ ہوتی ہو، لیکن فرماتے ہیں کہ ’’میں نے لہجہ بدل کر بات نہیں کی‘‘ اور اس سے آگے بڑھ کر ان کی اâ اور ہماری پیرانی صاحبہ فرماتی ہیں کہ ساری عمر مجھ سے یہ نہیں کہا کہ ’’ مجھے پانی پلا دو‘‘ یعنی اپنی طرف سے کسی کام کا حکم نہیں دیا کہ یہ کام کر دو، میں خود اپنے شوق اور جذبے سے سعادت سمجھ کر ان کا خیال رکھتی اور ان کے کام کرتی تھی ،لیکن ساری عمر زبان سے انہوں نے مجھے کسی چیز کا حکم نہیں دیا۔

طریقت بجز خدمت خلق نیست !

حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحبؒ فرماتے تھے کہ میں نے تو اپنے آپ کو یہ سمجھ لیا ہے اور اسی پر اعتقاد رکھتا ہوں، اور اسی پر خاتمہ چاہتا ہوں کہ میں تو خادم ہوں، مجھے تو اللہ تعالی نے خدمت کیلئے دنیا میں بھیجا ہے، جتنے میرے اہل تعلقات ہیں، ان کی خدمت میرے ذمے ہے میں مخدوم بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ دوسرے لوگ میری خدمت کریں، بلکہ میں خادم ہوں، اپنی بیوی کا بھی خادم، اپنے بچوں کا خادم، اپنے مریدین کا بھی خادم اور اپنے متعلقین کا بھی خادم ہوں اس لئے کہ بندے کیلئے خادمیت کا مقام اچھا ہے۔

اس لئے میں خادم ہوں، فرمایا کہ طریقت درحقیقت خدمت خلق ہی کا نام ہے، حضرت فرمایا کرتے تھے کہ جب میں نے یہ سمجھ لیا کہ میں خادم ہوں، مخدوم نہیں ہوں۔تو خادم دوسروں پر کیسے حکم چلائے کہ یہ کام کردو۔ساری عمر اس طرح گزاری کہ جب ضرورت پیش آتی خود کام کرتے کسی سے نہیں کہتے۔یہ ہے نبی کریم ﷺ کی سنت کا اتباع، ظاہری چیزوں میں تو ہم لوگ سنت کا اتباع کر لیتے ہیں۔لیکن اخلاق میں معاملات میں معاشرت میں اور زندگی گزارنے کے طریقوں میں بھی سنت کی اتباع کرنی چاہئے۔

صرف دعوی کافی نہیں !

اتباعٔ سنت بڑی عجیب وغریب چیز ہے۔یہ انسان کی دنیا بھی بناتی ہے اور آخرت بھی بناتی ہے اور زندگی کو استوار کرتی ہے اور یہ صرف دعوی کرنے سے حاصل نہیں ہوتی۔(یعنی لیلی سے محبت کا دعوی تو ہر شخص کر رہا ہے، لیکن خود لیلی ان کے اس دعوے کا اقرار نہیں کرتی ہے) یہ صرف عمل سے حاصل ہوتی ہے کہ آدمی اپنے اخلاق میں اپنے کردار میں اور اپنے عمل سے اس چیز کو اپنائے کہ جس کے ساتھ ادنی تعلق بھی ہو گیا، اس کو اپنی ذات سے ادنی سی تکلیف بھی نہ پہنچائے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم نے بیوی کی اصلاح کا تیسرا درجہ جو بتایا ہے۔اس کی تشریح نبی کریم ﷺ نے اپنے عمل سے اس طرح فرمائی ہے کہ ساری عمر میں کبھی بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھایا، چاہے کتنی ناگواری کیوں نہ ہوگئی، اور ان لوگوں کو جو اپنی بیویوں پر ہاتھ اٹھاتے ہیں برے لوگ اور بدترین لوگ قرار دیا۔

خطبہ حجۃ الوداع !

اس حدیث میں حضور اکرم ﷺ کے آخری خطبہ کا ایک اقتباس بیان کیا گیا ہے، یہ خطبہ جو آنحضرت ﷺ نے اپنے آخری حج، حجۃ الوداع کے موقع پر دیا تھا۔اس خطبہ میں صراحتا آپ ﷺ نے یہ فرما دیا کہ شاید اس سال کے بعد میں تم کو یہاں نہ دیکھ سکوں، لہذا اس

خطبہ میں آپ ﷺ نے دو باتیں چن چن کر ارشاد فرمائیں جن کے اندر امت کے پھسل جانے اور گمراہ ہوجانے کا اندیشہ تھا۔تاکہ قیامت تک امت کیلئے ایک دستورالعمل اور ایک لائحہ عمل سامنے آجائے؟ اور امت کی گمراہی کے جتنے راستے ہیں۔اس خطبے میں ان راستوں کو بند کرنے کی کوشش فرمائی۔

خطبہ تو بہت طویل ہے،لیکن اس خطبہ کے مختلف حصے مختلف مقامات پر بیان ہوئے ہیں اور یہ بھی اسی خطبہ کا حصہ ہے،جس میں مرد و عورت کے باہمی حقوق کو بیان فرمایا گیا ہے پھر خاص کر مردوں کو عورتوں کے حقوق پہچاننے اوران کا خیال رکھنے کی تاکید فرمائی گئی ہے آپ ان حقوق کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں یہ حقوق آپ ﷺ خطبہ حجۃ الوداع میں ایسے موقع پر ارشاد فرمارہے ہیں جبکہ یہ خیال بھی ہے کہ آئندہ اس طرح سب لوگوں کے سامنے بات کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔لہٰذا حضوراقدس ﷺ نے دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے جن چیزوں کو بیان کرنے کیلئے منتخب فرمایا،اور جن باتوں کی اہمیت آپ ﷺ نے محسوس فرمائی کہ امت کو ہرحال میں ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے،ان میں مردوعورت کے باہمی حقوق بھی داخل ہیں۔

میاں بیوی کے تعلقات کی اہمیت!

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی زندگی میں شوہراور بیوی کے تعلقات کو کتنی اہمیت حاصل ہے اور خود صاحب شریعت یعنی نبی کریم ﷺ نے اس کی کتنی اہمیت محسوس فرمائی ہے۔کیونکہ اگر میاں بیوی ایک دوسروں کے حقوق صحیح طور پرادانہ کریں،اور باہم تلخیوں پر کمر باندھ لیں تو اس کے ذریعہ صرف ایک دوسرے کے حقوق ہی ضائع نہیں ہوتے، بلکہ بالآخر اس کا اثر دونوں خاندانوں پر پڑتا ہے اور بچوں پر اس کا اثر پڑتا ہے اوراس کی وجہ سے اولاد خراب ہوتی ہے اور چونکہ سارے تمدّن کی بنیاد خاندان اور گھر پر ہے اس لئے اس کے نتیجے میں پورا تمدّن بگڑ جاتا ہے اس واسطے حضوراقدس ﷺ نے بڑی اہمیت کے ساتھ اس کی تاکید فرمائی۔

عورتیں تمہارے پاس مقید ہیں!

چنانچہ حضرت عمرو بن الاحوص حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس خطبہ میں آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان فرمائی،اور وعظ ونصیحت فرمائی اور پھر فرمایا کہ خوب سن لو،اور میں تمہیں عورتوں کے ساتھ بھلائی کی نصیحت کرتا ہوں تم اس نصیحت کو قبول کرلو،یہ وہی جملہ ہے جو پچھلی حدیث میں آیا تھا۔اور اگلا جملہ یہ ارشاد فرمایا اس لئے کہ وہ خواتین تمہارے پاس تمہارے گھروں میں مقید رہتی

ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے خواتین کا یہ ایک ایسا وصف بیان فرمایا کہ اگر مرد صرف اس وصف پر غور کرے تو اس کو کبھی ان کے ساتھ بدسلوکی کا خیال بھی نہ آئے۔

ایک نادان لڑکی سے سبق لو!

ہمارے حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک نادان اور غیر تعلیم یافتہ لڑکی سے سبق لو کہ صرف دو بول پڑھ کر جب ایک شوہر سے تعلق قائم ہوگیا ایک نے کہا کہ میں نے نکاح کیا۔ اور دوسرے نے کہا کہ میں نے قبول کرلیا۔ اس لڑکی نے اس دو بول کی ایسی لاج رکھی کہ ماں کو اس نے چھوڑا، باپ کو اس نے چھوڑا، بہن بھائیوں کو اس نے چھوڑا۔ اپنے خاندان کو چھوڑا، اور پورے کنبے کو چھوڑا، اور شوہر کی ہوگئی۔ اور اس کے پاس آکر مقید ہوگئی تو اس دو بول کی اس نادان لڑکی نے اتنی لاج رکھی اور اتنی وفاداری کی۔ تو حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ ایک نادان لڑکی تو اس دو بول کا اتنا بھرم رکھتی ہے کہ سب کو چھوڑ کر ایک کی ہوگئی، لیکن تم سے یہ نہیں ہوسکا کہ تم یہ دو بول لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ کر اس اللہ کے ہو جاؤ جس کیلئے یہ دو بول پڑھے تھے۔ تم سے تو وہ نادان لڑکی اچھی ہے کہ یہ دو بول پڑھ کر اس کا اتنا لاج رکھتی ہے تم سے اتنی لاج بھی نہیں رکھی جاسکتی کہ اس اللہ کے ہو جاؤ۔

عورت نے تمہارے لئے کتنی قربانیاں دی ہیں!

تو اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ فرمارہے ہیں کہ یہ دیکھو کہ اس نے تمہاری خاطر کتنی بڑی قربانی دی۔ اگر بالفرض معاملہ برعکس ہوتا۔ اور تم سے یہ کہا جاتا کہ تمہاری شادی ہوگئی، لیکن تمہیں اپنا خاندان چھوڑنا ہوگا۔ اپنے ماں باپ چھوڑنے ہوں گے۔ تو یہ تمہارے لئے کتنا مشکل کام ہوتا، ایک اجنبی ماحول، اجنبی گھر، اجنبی آدمی کے ساتھ زندگی بھر نباہ کیلئے وہ عورت مقید ہوگئی۔ اس لئے نبی کریم ﷺ فرمارہے ہیں کہ یہ کیا تم اس قربانی کا لحاظ نہیں کروگے؟ اس قربانی کا لحاظ کرو، اور اس کے ساتھ اچھا معاملہ کرو۔

اس کے علاوہ تمہارا ان پر کوئی مطالبہ نہیں!

اس کے بعد بڑا سنگین جملہ ارشاد فرمایا، جب کبھی اس جملے کی تشریح کی نوبت آتی ہے تو مرد لوگ ناراض ہوجاتے ہیں وہ جملہ یہ ہے کہ ''یعنی تمہیں ان پر صرف اتنا حق حاصل ہے کہ وہ تمہارے گھر میں رہیں، اس کے علاوہ شرعاً ان پر تمہارا کوئی مطالبہ نہیں۔

کھانا پکانا عورت کی شرعی ذمہ داری نہیں !

اسی بنیاد پر فقہاء کرام نے یہ مسئلہ بیان کیا جو بڑا نازک مسئلہ ہے۔جس کے بیان کرنے سے بہت سے لوگ ناراض ہو جاتے ہیں ،وہ مسئلہ یہ ہے کہ گھر کا کھانا پکانا عورت کی شرعی ذمی داری نہیں ہے۔یعنی شرعا یہ فریضہ ان پر عائد نہیں ہوتا کہ وہ ضرور کھانا پکائیں۔ بلکہ فقہاء کرام نے یہاں تک لکھا ہے کہ عورتوں کی دو قسمیں ہیں۔پہلی قسم ان عورتوں کی ہے جو اپنے گھر میں اپنے 3 میں بھی گھر کا کام کیا کرتی تھی۔اور دوسری قسم کی عورتیں وہ ہیں۔ جو اپنے گھر میں کھانا نہیں پکاتیں تھیں۔ بلکہ نوکر چاکر تھے۔وہ کھانا پکاتے تھے۔اگر دوسری قسم کی عورت شادی کے بعد شوہر کے گھر آجائے تو اس کے ذمہ کھانا پکانا کسی طرح بھی واجب نہیں نہ دیانتا ،نہ قضاء ،نہ اخلاقا ،نہ شرعا ، بلکہ وہ عورت شوہر سے کہ سکتی ہے کہ میرا نفقہ تو تمہارے ذمہ واجب ہے

بجائے اس کے کہ میں کھانے پکاؤں تم میرے لئے پکا پکایا یا کھانا لاکر دو چنانچہ فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ اس صورت میں پکا پکایا کھانا لاکر عورت کو دینا یہ شوہر کی ذمہ داری ہے۔اور اس عورت سے نہ قضاء کھانا پکانے کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے اور نہ دیانتا ،اس لئے کہ حضور اقدس ﷺ نے صاف اور واضح الفاظ میں یہ فرمایا: یعنی تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ ان کو اپنے گھر پر رکھو اور تمہاری اجازت کے بغیر ان کو گھر سے باہر جانا جائز نہیں۔لیکن اس کے علاوہ ان پر کوئی ذمہ داری شرعا نہیں ہے۔

اور اگر وہ پہلی قسم کی عورت ہے یعنی جو اپنے گھر میں کھانا پکاتی تھی۔اور کھانا پکاتی ہوئی شوہر کے گھر آئی ہے تو اس کے ذمہ کھانا پکھا قضاء واجب نہیں ہے۔لیکن دیانتاً واجب ہے۔یعنی بزور عدالت تو اس سے کھانا پکانے کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں !البتہ اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنا کھانا خود پکائے۔اس صورت میں شوہر کے ذمہ یہ ہے کہ وہ کھانا پکانے کا سامان لاکر دے دے۔ باقی شوہر یا بچوں کیلئے کھانا پکانا۔ یہ اس کی ذمہ داری بھی نہیں ہے۔اور یہ عورت شوہر سے یہ مطالبہ نہیں کرسکتی کہ تم میرے لئے پکا پکایا کھانا لاکر دو۔لیکن اگر وہ شوہر اور بچوں کیلئے کھانا پکانے سے انکار کردے تو اب اس سے عدالت کے زور پر کھانا پکانے کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا ،فقہاء کرام نے تفصیل کے ساتھ یہ مسائل بیان فرمائے ہیں۔

ساس ،سسر کی خدمت واجب نہیں !

ایک بات اور سمجھ لیجئے جس میں بڑی کوتاہی ہوتی ہے۔وہ یہ کہ جب عورت کے ذمہ شوہر کا اور اس کی اولاد کا کھانا پکانا واجب نہیں تو شوہر کے جو ماں باپ اور بہن بھائی ہیں ان کیلئے کھانا پکانا اور ان کی خدمت کرنا بطریق اولی واجب نہیں۔ ہمارے یہاں یہ دستور چل

پڑا ہے کہ جب بیٹے کی شادی ہوتی ہے۔تو اس بیٹے کے ماں باپ یہ سمجھتے ہیں کہ بہو پر بیٹے کے حق بعد میں ہے،اور ہمارا حق پہلے ہے،لہذا یہ بہو ہماری خدمت ضرور کرے۔ چاہے بیٹے کی خدمت کرے یا نہ کرے اور پھراس کے نتیجے میں ساس بہو بہاوج اور نندوں کے جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں،اوران جھگڑوں کے نتیجے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔

ساس سسر کی خدمت اس کی سعادت مندی ہے!

خوب سمجھ لیجئے اگر والدین کو خدمت کی ضرورت ہے تو لڑکے کے ذمے واجب ہے کہ وہ خود ان کی خدمت کرے البتہ اس لڑکے کی بیوی کی سعادتمندی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے والدین کی خدمت بھی خوش دلی سے اپنی سعادت اور باعث اجر سمجھ کرانجام دے،لیکن لڑکے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے والدین کی خدمت کرنے پر مجبور کرے،جبکہ وہ خوش دلی سے ان کی خدمت پر راضی نہ ہو۔اور نہ والدین کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی بہو کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ ہماری خدمت کرے،لیکن اگر وہ بہوخوش دلی سے اپنی سعادتمندی سمجھ کر اپنے شوہر کے والدین کی جتنی خدمت کرے گی انشاءاللہ اس کے اجر میں بہت اضافہ ہوگا۔اس بہو کو ایسا کرنا بھی چاہئے۔تاکہ گھر کی فضا خوش گوار رہے۔

بہو کی خدمت کی قدر کریں!

لیکن ساتھ ہی دوسری جانب ساس،سسر اور شوہر کو بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ اگر یہ خدمت انجام دے رہی ہے تو یہ اس کا حسن سلوک ہے اس کا حسن اخلاق ہے اس کے ذمہ یہ خدمت فرض واجب نہیں ہے۔لہذا ان کو چاہئے کہ وہ بہو کی اس خدمت کی قدر کریں۔اور اس کا بدلہ دینے کی کوشش کریں۔ان حقوق اور مسائل کو نہ سمجھنے کے نتیجے میں آج گھر کے گھر برباد ہو رہے ہیں۔ساس بہو کی اور بہاوج اور نندوں کی لڑائیوں نے گھر کے گھر اجاڑ دیئے۔یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ ان حقوق کی وہ حدود جو نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائی ہیں وہ ذھنوں میں موجود نہیں ہیں۔

ایک عجیب واقعہ!

میرے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ نے ایک دن بڑا عجیب واقعہ سنایا کہ میرے متعلقین میں ایک صاحب تھے۔وہ اور ان کی بیوی دونوں میری مجلس میں آیا کرتے تھے اور کچھ اصلاحی تعلق بھی قائم کیا ہوا تھا۔دونوں نے ایک مرتبہ اپنے گھر میری دعوت کی چنانچہ،میں ان کے گھر گیا،اور جا کر کھانا کھایا اور کھانا بڑا اچھا بنا ہوا تھا۔ہمارے حضرت والا قدس اللہ سرہ کی å ہی عادت تھی کہ

جب کھانا کھاتے تو کھانے کے بعد کھانا بنانے والی خاتون کی تعریف کرتے کہ تم نے بہت اچھا کھانا پکایا، تاکہ اس کی حوصلہ افزائی ہو، اس کا دل بڑھے۔

چنانچہ جب حضرت والا کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو وہ خاتوں پردے کے پیچھے آئیں اور آکر حضرت والا کو سلام کیا تو حضرت والا نے فرمایا تم نے بڑا لذیذ کھانا اور اچھا کھانا بنایا کھانا کھانے میں بڑا مزہ آیا حضرت والا فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ جملہ کہا تو پردے کے پیچھے سے اس خاتون کی سسکیاں لینے اور رونے کی آواز آئی میں حیران ہوگیا کہ معلوم نہیں کہ میری کس بات سے اس کو تکلیف پہنچی اور ان کا دل ٹوٹا میں نے پوچھا کہ: کیا بات ہے؟ آپ کیوں رو رہی ہیں؟ ان خاتون نے اپنے رونے پر بمشکل قابو پاتے ہوئے یہ کہا کہ حضرت آج مجھے ان شوہر کے ساتھ رہتے ہوئے چالیس سال ہوگئے ہیں لیکن اس پورے عرصے میں کبھی میں نے ان کی زبان سے یہ جملہ نہیں سنا کہ ''آج کھانا اچھا بنا ہے'' آج جب آپ کے منہ سے یہ جملہ سنا تو مجھے رونا آ گیا۔

ایسا شخص کھانے کی تعریف نہیں کرے گا!

حضرت والا بکثرت یہ واقعہ سنا کر فرماتے تھے کہ وہ شخص یہ کام ہرگز نہیں کرسکتا جس کے دل میں یہ احساس ہو کہ یہ بیوی کھانے پکانے کی جو خدمت انجام دے رہی ہے یہ اس کا حسن سلوک اور حسن معاملہ ہے جو وہ میرے ساتھ کر رہی ہے، لیکن جو شخص اپنی بیوی کو نوکر اور خادم سمجھتا ہو کہ یہ میری خادمہ ہے، اس کو تو یہ کام ضرور انجام دینا ہے۔ کھانا پکانا اس کا فرض ہے۔ اگر کھانا اچھا پکا رہی ہے تو اس پر اس کی تعریف کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ایسا شخص کبھی اپنی بیوی کی تعریف نہیں کرے گا۔

شوہر اپنے ماں باپ کی خدمت خود کرے!

ایک مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ والدین ضعیف ہیں۔ یا بیمار ہیں۔ اور ان کی خدمت کی ضرورت ہے۔ گھر میں صرف بیٹا اور بہو ہے، اب کیا کیا جائے؟ اس صورت میں بھی شرعی مسئلہ یہ ہے کہ بہو کے ذمے واجب نہیں کہ وہ شوہر کے والدین کی خدمت کرے، البتہ اس کی سعادت اور خوش نصیبی ہے اور اجر و ثواب کا موجب ہے، اگر خدمت کرے گی، تو انشاءاللہ بڑا ثواب حاصل ہوگا۔ لیکن بیٹے کو یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ کام میرا ہے۔ مجھے چاہئے کہ اپنے والدین کی خدمت کروں اب چاہے وہ خدمت خود کرے یا کوئی نوکر اور خادمہ رکھے، لیکن اگر بیوی خدمت کر رہی ہے تو یہ اس کا احسان سلوک اور احسان سمجھنا چاہئے۔

عورت کو اجازت کے بغیر باہر جانا جائز نہیں!

لیکن ایک قانون اس کے ساتھ اور بھی سن لیں، ورنہ معاملہ الٹا ہو جائے گا۔ اس لئے کہ لوگ جب یک طرفہ بات سن لیتے ہیں تو اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے تفصیل کے ساتھ عرض کیا کہ کھانا پکانا عورت کے ذمہ شرعاً واجب نہیں۔ لیکن حضور اقدس ﷺ نے یہ جو فرمایا کہ یہ تمہارے گھروں میں مقید رہتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری اجازت کے بغیر ان کیلئے کہیں جانا جائز نہیں۔ لہذا جس طرح فقہاء کرام نے کھانا پکانے کا مسئلہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، اس طرح فقہاء نے یہ قانون بھی لکھا ہے کہ اگر شوہر عورت سے یہ کہہ دے کہ تم گھر سے باہر نہیں جا سکتیں اور اپنے عزیز و اقارب سے ملنے نہیں جا سکتیں۔ حتی کہ اس کے والدین سے بھی ملنے کیلئے جانے سے منع کر دے تو عورت کیلئے ان سے ملاقات کیلئے گھر سے باہر جانا جائز نہیں۔ البتہ اگر والدین اپنی بیٹی سے ملنے کیلئے اس کے گھر آ جائیں تو اب شوہر ان والدین کو ملاقات کرنے سے نہیں روک سکتا، لیکن فقہاء نے اس کی حد مقرر کر دی ہے کہ اس کے والدین ہفتے میں ایک مرتبہ آئیں اور ملاقات کر کے چلے جائیں۔ یہ اس عورت کا حق ہے۔ شوہر اس سے نہیں روک سکتا لیکن اجازت کے بغیر اس کیلئے جانا جائز نہیں۔ تو اللہ تعالی نے دونوں کے درمیان اس طرح توازن برابر کیا ہے کہ عورت کے ذمے قانونی اعتبار سے کھانا پکانا واجب نہیں تو دوسری طرف قانونی اعتبار سے اس کا گھر سے باہر نکلنا شوہر کی اجازت کے بغیر جائز نہیں۔

دونوں مل کر زندگی کی گاڑی کو چلائیں!

یہ قانون کی بات تھی لیکن حسن سلوک کی بات یہ ہے کہ وہ اس کی خوشی کا خیال رکھے۔ اور یہ اس کی خوشی کا خیال رکھے حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالی عنہا نے بھی اپنے درمیان یہ تقسیم کار فرما رکھی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ گھر کے باہر کے تمام کام انجام دیتے تھے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالی عنہا گھر کے اندر کے تمام کام انجام دیتی تھیں۔ یہی نبی کریم ﷺ کی سنت ہے۔ اور اسی پر عمل ہونا چاہئے۔ دونوں میاں بیوی قانون کی باریکیوں میں ہر وقت نہ پڑے رہیں۔ بلکہ شوہر بیوی کے ساتھ اور بیوی شوہر کے ساتھ خوش اسلوبی کا معاملہ کرے۔ اور یہ فطری تقسیم بھی ہے کہ گھر کے کام بیوی کے ذمے اور باہر کے کام شوہر کے ذمہ ہوں اس طرح دونوں مل کر زندگی کی گاڑی کو چلائیں۔

اگر بے حیائی کا ارتکاب کریں تو!

ہاں اگر وہ عورتیں گھر میں کسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں تو وہ بے حیائی کسی قیمت پر بھی برداشت نہیں، اس صورت میں قرآن کریم کے بتائے ہوئے نسخے کے مطابق پہلے ان کو نصیحت کرو۔ اور اس کے بعد اگر وہ باز نہ آئیں تو ان کا بستر الگ کر دو۔ اور پھر بھی اگر باز

نہ آئیں تو بدرجہ مجبوری اس بے حیائی پر مارنے کی بھی اجازت ہے بشرطیکہ وہ مار تکلیف دینے والی نہ ہو۔ اوراس کے بعد اگر وہ تمہاری اطاعت کرلیں۔ اور باز آجائیں تو اب اس کے بعد کوئی راستہ ان کے خلاف تلاش نہ کرو، یعنی ان کو مزید تکلیف پہنچانے کی گنجائش نہیں۔

خبردار!

ان عورتوں کا تم پر یہ حق ہے کہ تم ان کے ساتھ اچھا معاملہ کرو، ان کے لباس میں اوران کے کھانے میں اوران کی دوسری ضروریات جو تمہارے ذمہ واجب ہیں تم ان میں احسان سے کام لو، صرف یہ نہیں کہ انتہائی ناگزیر ضرورت پوری کردی، بلکہ احسان، فراخدلی اور کشادگی سے کام لو، اوران کے لباس اور کھانے پر خرچ کرو۔

بیوی کو جیب خرچ الگ دیا جائے!

یہاں دو تین باتیں اس سلسلے میں عرض کرنی ہیں، جن پر حکیم الامت حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ نے اپنے مواعظ میں جابجا زور دیا ہے اور عام طور پر ان باتوں کی طرف سے غفلت پائی جاتی ہے۔ پہلی بات جو حضرت تھانویؒ نے بیان فرمائی، وہ یہ نفقہ صرف یہ نہیں کہ بس! کھانے کا انتظام کردیا، اور کپڑے کا انتظام کردیا۔ بلکہ نفقہ کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ کھانے اور کپڑے کے علاوہ بھی کچھ رقم بطور جیب خرچ کے بیوی کی دی جائے۔ جس کو وہ آزادی کے ساتھ اپنی خواہش کے مطابق صرف کرسکے۔ بعض لوگ کھانے اور کپڑے کا تو انتظام کردیتے ہیں، لیکن جیب خرچ کا اہتمام نہیں کرتے، حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ جیب خرچ دینا بھی ضروری ہے اسلئے کہ انسان کی بہت سی ضروریات ایسی ہوتی ہیں جس کو بیان کرتے ہوئے بھی انسان شرماتا ہے یا اس کو بیان کرتے ہوئے الجھن محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے کچھ رقم بیوی کے پاس ایسی ضروریات کیلئے بھی ہونی چاہئے، تاکہ وہ دوسرے کی محتاج نہ ہو، یہ بھی نفقہ کا ایک حصہ ہے حضرت والا نے فرمایا کہ جو لوگ یہ جیب خرچ نہیں دیتے، وہ اچھا نہیں کرتے۔

خرچہ میں فراخدلی سے کام لینا چاہئے!

دوسری بات یہ ہے کہ کھانے پینے میں اچھا سلوک کرو یہ نہ ہو کہ صرف ''قوت لا یموت'' دیدی یعنی اتنا کھانا دیدیا جس سے موت نہ آئے۔ بلکہ احسان کرو اور احسان کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی آمدنی کے معیار کے مطابق فراخی اور کشادگی کے ساتھ گھر کا خرچہ اس کو دے۔ بعض لوگوں کے دلوں میں یہ خلفان رہتا ہے کہ شریعت میں ایک طرف تو فضول خرچی اور اسراف کی ممانعت آئی ہے، اور

دوسری طرف یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ گھر کے خرچ میں تنگی مت کرو، بلکہ، کشادگی سے کام لو، اب سوال یہ ہے کہ دونوں میں حدِ فاصل کیا ہے؟ کونسا خرچہ اسراف میں داخل ہے اور کونسا خرچہ اسراف میں داخل نہیں؟

رہائش جائز آسائش جائز!

اس خلجان کے جواب میں حضرت تھانویؒ نے گھر کے بارے میں فرمایا کہ ایک ''گھر'' وہ ہوتا ہے جو قابل رہائش ہو۔ مثلاً جھونپڑی ڈال دی، یا چھپر ڈال دیا۔ اس میں بھی آدمی رہائش اختیار کرسکتا ہے۔ یہ تو پہلا درجہ ہے جو بالکل جائز ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ رہائش بھی ہو اور ساتھ میں آسائش بھی ہو مثلاً پختہ مکان ہے۔ جس میں انسان آرام کے ساتھ رہ سکتا ہے۔ اور گھر میں آسائش کیلئے کوئی کام کیا جائے تو اس کی ممانعت نہیں ہے اور یہ بھی اسراف میں داخل نہیں مثلاً ایک شخص ہے وہ جھونپڑی میں بھی زندگی بسر کرسکتا ہے اور دوسرا شخص جھونپڑی میں نہیں رہ سکتا اس کو تو رہنے کیلئے پختہ مکان چاہئے، اور پھر اس مکان میں بھی اس کو پنکھا اور بجلی چاہئے۔ اب اگر وہ شخص اپنے گھر میں پنکھا اور بجلی اس لئے لگاتا ہے تاکہ اس کو آرام حاصل ہو۔ تو یہ اسراف میں داخل نہیں۔

آرائش بھی جائز!

تیسرا درجہ یہ ہے کہ مکان میں آسائش کے ساتھ آرائش بھی ہو۔ مثلاً ایک شخص کا پختہ مکان بنا ہوا ہے۔ پلاستر کیا ہوا ہے بجلی بھی ہے پنکھا بھی ہے۔ لیکن اس مکان پر رنگ نہیں کیا ہوا ہے، اب ظاہر ہے کہ رہائش تو ایسے مکان میں بھی ہوسکتی ہے لیکن رنگ روغن کے بغیر آرائش نہیں ہوسکتی اب اگر کوئی شخص آرائش کے حصول کے لئے مکان پر رنگ و روغن کرائے تو شرعاً وہ بھی جائز ہے۔
خلاصہ یہ ہے کہ رہائش جائز، آسائش جائز، آرائش جائز، اور آرائش کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی انسان اپنے دل کو خوش کرنے کیلئے کوئی کام کرلے تاکہ دیکھنے میں اچھا معلوم ہو، دیکھ کر دل خوش ہو جائے۔ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، شرعاً یہ بھی جائز ہے۔

نمائش جائز نہیں!

اس کے بعد چوتھا درجہ ہے ''نمائش'' اب جو کام کر رہا ہے اس سے نہ تو آرام مقصود ہے، نہ آرائش مقصود ہے۔ بلکہ اس کام کا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگ مجھے بڑا دولت مند سمجھیں اور لوگ یہ سمجھیں کہ اس کے پاس بہت پیسہ ہے اور تاکہ اس کے ذریعہ دوسروں پر اپنی فوقیت جتاؤں، اور اپنے آپ کو بلند ظاہر کروں، یہ سب ''نمائش'' کے اندر داخل ہے اور یہ شرعاً ناجائز ہے۔ اور اسراف میں داخل ہے

فضول خرچی کی حد!

یہی چار درجات لباس اور کھانے میں بھی ہیں بلکہ ہر چیز میں ہیں ایک شخص اچھا اور قیمتی کپڑا اس لئے پہنتا ہے تاکہ مجھے آرام ملے اور تاکہ مجھے اچھا لگے اور میرے گھر والوں کو اچھا لگے، اور میرے ملنے جلنے والے اس کو دیکھ کر خوش ہوں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اگر کوئی شخص اچھا اور قیمتی لباس اس نیت سے پہنتا ہے تاکہ مجھے دولت مند سمجھا جائے مجھے بہت پیسے والا سمجھا جائے، اور میرا بڑا مقام سمجھا جائے تو یہ نمائش ہے اور ممنوع ہے۔ اس لئے حضرت تھانویؒ نے اسراف کے بارے میں ایک واضح فاصل کھینچ دی کہ اگر ضرورت پوری کرنے کیلئے کوئی خرچ کیا جارہا ہے۔ یا آسائش کے حصول کیلئے یا اپنے دل کو خوش کرنے کیلئے آرائش کی خاطر کوئی خرچہ کیا جارہا ہے وہ اسراف میں داخل نہیں۔

یہ اسراف میں داخل نہیں!

میں ایک مرتبہ کسی دوسرے شہر میں تھا۔ اور واپس کراچی آنا تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ ایئر کنڈیشن کوچ میں میرا ٹکٹ بک کرادو، اور میں نے ان کو پیسے دے دیئے۔ ایک دوسرے صاحب پاس بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے فوراً کہا کہ صاحب! یہ تو آپ اسراف کررہے ہیں، اس لئے کہ ایئر کنڈیشن کوچ میں سفر کرنا تو اسراف میں داخل ہے۔ بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اگر اوپر کے درجے میں سفر کرلیا تو یہ اسراف میں داخل ہے۔

خوب سمجھ لیجئے! اگر اوپر کے درجے میں سفر کرنے کا مقصد راحت حاصل کرنا ہے، مثلاً گرمی کا موسم ہے۔ گرمی برداشت نہیں ہوتی، اللہ تعالی نے پیسے دیئے ہیں تو پھر اس درجے میں سفر کرنا کوئی گناہ اور اسراف نہیں ہے۔ لیکن اگر اوپر کے درجے میں سفر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب میں ایئر کنڈیشن کوچ میں سفر کروں گا تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ یہ بڑا دولت مند آدمی ہے تو پھر وہ اسراف اور ناجائز ہے اور نمائش میں داخل ہے، یہی تفصیل کپڑے اور کھانے میں بھی ہے۔

ہر شخص کی کشادگی الگ الگ ہے!

لہذا شوہر کو چاہے کہ ان درجات کو مدنظر رکھتے ہوئے بیوی کے نفقہ اور لباس میں کشادگی کے ساتھ خرچ کرے۔ ہر آدمی کی کشادگی الگ الگ ہوتی ہے۔ میرے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحبؒ ایک مرتبہ بیان فرماتے ہوئے کہنے لگے کہ بھائی! ایک آدمی ایسا ہے جس کا نہ کوئی آگا نہ پیچھا، یعنی نہ کوئی اس کا رشتہ دار ہے۔ نہ کوئی عزیز و اقارب ہے، اور نہ کوئی دوست ہے، اگر ایسا شخص اپنے گھر میں

ایک بستر ایک رکابی، ایک ڈونگا رکھ لے تو بس! اس کیلئے یہ برتن کافی ہیں۔ اب اگر اور زیادہ برتن جمع کرے گا تو اس کا مقصد سوائے نمائش کے اور کچھ نہ ہوگا۔ اور اسراف ہوگا، لیکن ایک دوسرا آدمی جس کے مہمان آتے ہیں، جس کے تعلقات وسیع ہیں۔ جس کے عزیز واقارب بہت زیادہ ہیں، اس کی ضرورت اور کشادگی کا معیار اور ہے اب اگر ایسے شخص کے گھر میں بعض اوقات برتنوں کے سوسیٹ بھی ہوں یا سو بستر بھی ہوں تب بھی ان میں سے ایک برتن اور ایک بستر بھی اسراف میں داخل نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ یہ سب اس کی ضرورت میں داخل ہیں، اس لئے فرمایا کہ ہر آدمی کا کشادگی کا معیار الگ ہوتا ہے۔

اس محل میں خدا کو تلاش کرنے والا احمق ہے!

بعض اوقات لوگ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ جو بڑے بادشاہ تھے ان کا قصہ سن کر اسی سے استدلال کرتے ہیں۔ جن کا قصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے رات کے وقت ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ محل کی چھت پر گھوم رہا ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے اس کو پکڑ کر پوچھا کہ رات کے وقت یہاں محل کی چھت پر کیا کر رہے ہو؟ اس آدمی نے کہا کہ اونٹ تلاش کرنے آیا ہوں میرا اونٹ گمُ ہو گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؒ نے فرمایا کہ ارے بے وقوف، کم عقل، رات کے وقت محل کی چھت پر اونٹ تلاش کر رہا ہے۔ تجھے یہاں اونٹ کیسے ملے گا؟ اس آدمی نے حیرت سے پوچھا یہاں اونٹ نہیں مل سکتا؟ حضرت ابراہیم نے فرمایا کہ نہیں تجھے یہاں محل کی چھت پر اونٹ کیسے ملے گا؟ اس آدمی نے کہا کہ اگر اس محل میں اونٹ نہیں مل سکتا اور اس محل میں اونٹ تلاش کرنے والا احمق ہے۔ تو یہ بھی سمجھ لو کہ تم یہاں رہتے ہوئے خدا کو تلاش کر رہے ہو، تمہیں خدا بھی نہیں مل سکتا اگر میں احمق ہوں تو مجھ سے زیادہ احمق تم ہو۔ بس! اس وقت حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کے دل پر ایک چوٹ لگی، اور اسی وقت ساری بادشاہت چھوڑ کر جنگل کی طرف روانہ ہوگئے۔ اور روانہ ہوتے وقت سوچا کہ اب تو اللہ کی یاد میں زندگی بسر کرنی ہے۔ اس لئے صرف ایک تکیہ اور ایک پیالہ ساتھ لے لیا تا کہ کھانے پینے کی ضرورت پیش آئیگی تو اس پیالے میں کھا پی لیں گے اور سونے کی ضرورت پیش آئے گی تو زمین پر تکیہ رکھ کر سو جائیں گے، جب کچھ آگے چلے تو دیکھا کہ ایک آدمی دریا کے کنارے بیٹھا ہے اور چلو بنا کر پانی پی رہا ہے آپ نے سوچا کہ یہ پیالہ میں نے اپنے ساتھ فضول لے لیا۔ یہ کام تو ہاتھوں کے ذریعے بھی ہوسکتا ہے چنانچہ وہ پیالہ پھینک دیا اور آگے روانہ ہوگئے کچھ اور آگے گئے تو دیکھا کہ ایک آدمی سر کے نیچے اپنا ہاتھ رکھ کر سو رہا ہے پھر سوچا کہ یہ تکیہ بھی میں نے فضول لیا ہے۔ تکیہ تو اللہ تعالی نے خود دے رکھا ہے۔ اس سے کام چلائیں گے چنانچہ وہ تکیہ بھی پھینک دیا۔

غلبہ حال کی کیفیت قابل تقلید نہیں!

اس قصہ کی وجہ سے بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ پیالہ رکھنا بھی اسراف ہے۔اور تکیہ رکھنا بھی اسراف ہے اللہ تعالی حضرت تھانویؒ کے درجات بلند فرمائے، آمین۔۔۔۔وہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی نتھار کر چلے گئے۔وہ فرماتے ہیں کہ اپنے حالات کو حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کے حالات پر قیاس مت کرو ایک تو اس وجہ سے کہ جو کیفیت حضرت ابراہیم بن ادھمؒ پر طاری ہوئی، وہ غلبہ حال کی کیفیت تھی وہ قابل تقلید کیفیت نہیں تھی۔اور غلبہ حال کا مطلب یہ ہے کہ کسی وقت طبیعت پر کسی بات کا اتنا غلبہ ہو جاتا ہے کہ آدمی اس حالت میں معذور ہو جاتا ہے، معذور ہونے کی وجہ سے اس کے حالات دوسروں کیلئے قابل تقلید نہیں رہتے۔اس لئے حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کے یہ حالات ہمارے اور آپکے لئے قابل تقلید نہیں۔ورنہ دماغ میں یہ بات جم جائے گی کہ تکیہ بھی چھوڑو، اور پیالہ بھی چھوڑو، اور گھر بار بھی چھوڑو، بیوی بچے چھوڑو، اس لئے کہ خدا اس کے بغیر نہیں ملے گا۔حالانکہ دین کا یہ تقاضہ نہیں، بلکہ یہ غلبہ حال کی کیفیت ہے جو حضرت ابراہیم بن ادھمؒ پر طاری ہوئی۔

آمدنی کے مطابق کشادگی ہونی چاہئے!

دوسرے یہ کہ ہر آدمی کی ضرورت اس کے حالات کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہیں۔لہذا کشادگی کا معیار بھی ہر انسان کا الگ ہے۔اب جو شخص کم آمدنی والا ہے۔اس کی کشادگی کا معیار اور ہے، اور جو متوسط آمدنی والا ہے۔اس کا معیار اور ہے اور جو زیادہ آمدنی والا ہے اس کی کشادگی کا معیار اور ہے۔اس لئے ہر شخص کی آمدنی کے معیار کے اعتبار سے کشادگی ہونی چاہئے، یہ نہ ہو کہ شوہر بیچارے کی آمدنی تو کم ہے۔اور ادھر بیوی صاحبہ نے دولت مند قسم کے لوگوں کے گھر میں جو چیزیں دیکھیں ان کی نقل اتارنے کی فکر لگ گئی۔اور شوہر سے اس کی فرمائش ہونے لگی۔اس قسم کی فرمائشوں کا تو کوئی جواز نہیں۔لیکن شوہر کو چاہئے کہ اپنی آمدنی کو مدنظر رکھتے ہوئے کشادگی سے کام لے۔اور اپنی بیوی کے حق میں بخل اور کنجوسی سے کام نہ لے۔

بیویوں کا ہم پر کیا حق ہے!

حضرت معاویہ بن حیدۃ رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ ’’میں نے حضور اقدس ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! ہم لوگوں کی بیویوں کا ہم پر کیا حق ہے؟ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جب تم کھاؤ تو اس کو بھی کھلاؤ اور جب تم پہنو تو اس کو بھی پہناؤ اور یہ کہ چہرے پر نہ مارو اور برا بھلا مت کہو ‘‘۔’’تقبح‘‘ کے معنی ہیں کوسنے دینا۔برا بھلا کہنا۔اور اس سے دل آزاری کی باتیں کرنا۔اور اس کو مت چھوڑ مگر گھر ہی میں۔

اس کا بستر چھوڑ دو!

جیسا کہ پیچھے بیان کیا گیا کہ اگر تم عورت کے اندر کوئی بے حیائی کی بات دیکھو تو پہلے اس کو سمجھاؤ اگر سمجھانے سے باز نہ آئے تو اس کا بستر چھوڑ دو۔ اور الگ بستر پر سونا شروع کر دو، اس حدیث میں بستر چھوڑنے کی تفصیل یہ بیان فرمادی کہ بستر چھوڑنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم گھر سے باہر چلے جاؤ۔ بلکہ گھر کے اندر ہی رہو۔ البتہ احتجاج کے طور پر تادیبی طور پر اور ایک نفسیاتی مار کے طور پر کمرہ بدل دو یا بستر بدل دو اور اس سے علیحدگی اختیار کرلو۔

ایسی علیحدگی جائز نہیں!

علماء نے اس حدیث کے یہ معنی بھی بیان فرمائے ہیں کہ ایسے موقع پر اگر چہ بستر کو الگ کر دو لیکن بالکلیہ بات چیت ختم نہ کرو اور ایسی علیحدگی نہ ہو کہ ایک دوسرے کو سلام بھی نہ کیا جائے۔ اور سلام کا جواب بھی نہ دیا جائے اور کوئی ضروری بات کرنی ہو تو اس کا جواب بھی نہ دیا جائے۔ اس طرح کی علیحدگی جائز نہیں ہے۔

چار ماہ سے زیادہ سفر میں بیوی کی اجازت!

اس حدیث کے تحت فقہاء کرام نے یہاں تک لکھا ہے کہ مرد کیلئے چار مہینہ سے زیادہ گھر سے باہر رہنا بیوی کی اجازت اور اس کی خوشدلی کے بغیر جائز نہیں، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے اپنی تمام قلم رو میں یہ حکم جاری فرمادیا کہ جو مجاہدین گھر سے باہر رہتے ہیں وہ چار ماہ سے زیادہ گھر سے باہر نہ رہیں اور اسی وجہ سے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کو چار چار ماہ سے کم کا سفر درپیش ہو تو اس کیلئے بیوی کی اجازت کی ضرورت نہیں لیکن اگر چار ماہ سے زیادہ کا سفر درپیش ہو تو اس کیلئے بیوی سے اجازت لینی ضروری ہے۔

چاہے وہ سفر کتنا ہی بابرکت کیوں نہ ہو حتی کہ اگر حج کا سفر ہو تو اس میں بھی اگر وہ چار ماہ کے اندر واپس آسکتا ہے تو پھر اجازت کی ضرورت نہیں اگر نفلی طور پر وہاں زیادہ قیام کا ارادہ ہے تو پھر اجازت لینی ضروری ہے، یہی حکم تبلیغ و دعوت اور جہاد کے سفر کا ہے۔ لہذا جب ان مبارک سفروں میں بیوی کی اجازت ضروری ہے تو پھر جو لوگ ملازمت کیلئے پیسہ کمانے کیلئے لمبے سفر کرتے ہیں ان میں تو بطریق اولی بیوی کی اجازت ضروری ہے۔ اگر بیوی کی اجازت کے بغیر جائیں گے تو یہ بیوی کی حق تلفی ہوگی اور شرعاً ناجائز ہوگا اور گناہ ہوگا۔

بہتر لوگ کون ہیں!

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تمام مومنوں میں ایمان کے اعتبار سے سب سے زیادہ کامل وہ شخص ہے جو اخلاق کے اعتبار سے ان میں سب سے اچھا ہو''۔ جو شخص جتنا زیادہ خوش اخلاق ہوگا وہ اتنا ہی کامل ایمان والا ہو۔اس لئے کامل ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان دوسروں کے ساتھ حسن اخلاق کا معاملہ کرے اور تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو اپنی بیویوں اور اپنی عورتوں کیلئے بہتر ہوں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والے ہوں۔

آج کے دور میں ''خوش اخلاقی''!

آج کل ہر چیز کے معنی بدل گئے ہر چیز کا مفہوم الٹ گیا ہمارے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ پہلے زمانے کے مقابلے میں اب اس دور میں ہر چیز الٹی ہوگئی یہاں تک پہلے چراغ تلے اندھیرا ہوتا تھا اور اب بلب کے اوپر اندھیرا ہوتا ہے۔ پھر فرماتے کہ آج کل ہر چیز کی قدریں بدل گئیں ہر چیز کا مفہوم الٹ گیا۔حتی کہ اخلاق کا مفہوم بھی بدل گیا آج صرف چند ظاہری حرکات کا نام اخلاق ہے مثلاً مسکرا کر مل لئے ،اور ملاقات کے وقت رسمی الفاظ زبان سے ادا کردیئے۔مثلاً یہ کہہ دیا کہ ''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی'' یا ''آپ سے مل کر بڑا اچھا معلوم ہوا'' وغیرہ اب زبان سے تو یہ الفاظ ادا کر رہے ہیں ،لیکن دل کے اندر عداوت اور حسد کی آگ سلگ رہی ہے، دل کے اندر نفرت کروٹیں لے رہی ہے بس آج اسی کا نام خوش اخلاقی ہے۔اور آج باقاعدہ ایک فن بن گیا ہے کہ دوسروں کے ساتھ کس طرح پیش آیا جائے تاکہ دوسرے لوگ ہمارے گرویدہ ہو جائیں اور باقاعدہ اس پر کتابیں لکھی جارہی ہیں کہ دوسرے کو گرویدہ بنانے کیلئے اور دوسرے کو متاثر کرنے کیلئے کیا طریقے اختیار کئے جائیں؟ لہذا سارا زور اس پر صرف ہو رہا ہے کہ دوسرا گرویدہ ہو جائے دوسرا ہم سے متاثر ہو جائے اور ہم کو اچھا سمجھنے لگے۔آج اسی کا نام ''اخلاق'' رکھا جاتا ہے۔

خوب سمجھ لیجئے: اس کا اس اخلاق سے کوئی تعلق نہیں جس کا ذکر حضور اقدس ﷺ فرمارہے ہیں۔ یہ اخلاق نہیں، بلکہ ریاکاری اور دکھاوا ہے اور یہ نمائش ہے اور یہ دوسرے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے اور اپنے گرد اکٹھا کرنے کا بہانہ ہے، یہ حب جاہ ہے، یہ حب شہرت ہے جو بذات خود بیماری اور بداخلاقی ہیں ،حسن اخلاق سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

حسن اخلاق دل کی کیفیت کا نام ہے!

حقیقت میں اخلاق دل کی ایک کیفیت کا نام ہے جس کا مظاہرہ اعضاء اور جوارح سے ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دل میں ساری مخلوق خدا

کی خیر خواہی ہو۔ اور ان سے محبت ہو خواہ وہ دشمن اور کافر ہی کیوں نہ ہو، اور یہ سوچ کر یہ میرے مالک کی مخلوق ہے لہذا مجھے اس سے محبت رکھنی چاہئے اس کے ساتھ مجھے اچھا سلوک کرنا چاہئے ، اولاً دل میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے اور پھر اس جذبے کے ماتحت اعمال صادر ہوتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ خیر خواہی کرتا ہے اب اس جذبہ کے بعد چہرے پر جو مسکراہٹ اور تبسم آتا ہے وہ بناوٹی نہیں ہوتا اور وہ دوسروں کو اپنا گرویدہ کرنے کیلئے نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی دلی خواہش اور دلی جذبے کا ایک لازمی اور منطقی تقاضہ ہوتا ہے۔ لہذا حضور اقدس کے بیان کردہ اخلاق میں اور آج کے اخلاق میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

اخلاق پیدا کرنے کا طریقہ!

اور ان اخلاق کو حاصل کرنے کیلئے محض کتاب پڑھ لینا کافی نہیں ہے، نہ محض وعظ سن لینا کافی ہوتا ہے۔ اس کیلئے کسی مربی اور کسی مصلح کی صحبت میں رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تصوف اور پیری مریدی کا جو سلسلہ بزرگوں سے چلا آرہا ہے اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر اخلاق فاضلہ پیدا ہوں اور برے اخلاق دور ہوں۔ بہر حال ایمان میں کامل ترین افراد وہ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہوں۔ جن کے دل میں صحیح داعئے پیدا ہوتے ہوں اور ان صحیح داعیوں کا اظہار ان کے اعمال وافعال سے ہوتا ہو۔ اللہ تعالی اپنی رحمت سے ہم سب کو ان کاملین میں داخل فرمادیں۔ آمین۔

اللہ کی بندیوں کو نہ مارو!

حضرت ایاس بن عبداللہ رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ''اللہ کی بندیوں کو مارو نہیں''، یعنی عورتوں کو مارنا اچھی بات نہیں ہے مت مارا کرو اور جب حضور اقدس ﷺ نے روک دیا کہ یہ کام مت کرو تو جس شخص نے براہِ راست حضور اقدس ﷺ کی زبان سے سن لیا، اس کیلئے وہ کام حرام قطعی ہو گیا اب اس کیلئے کسی بھی حالت میں مارنا جائز نہیں۔

حدیث ظنی یا قطعی!

یہ بات سمجھ لیجئے کہ ایک تو وہ حدیث ہے، جو ہم اور آپ کتاب میں پڑھتے ہیں یا سنتے ہیں۔ اور جو لمبی سند کے ساتھ ہم تک پہنچتی ہے حدثنا فلان قال حدثنا فلان قال حدثنا فلان۔ ایسی حدیث ظنی کہلاتی ہے۔ اس لئے کہ ظنی طریقوں سے ہم تک پہنچتی ہے لہذا اس حدیث پر عمل کرنا واجب ہے اگر عمل نہیں کرے گا تو گناہ گار ہوگا لیکن صحابہ کرام نے جو بات حضور اقدس سے براہ راست سن لی، وہ حدیث ظنی نہیں ہے، بلکہ قطعی ہے، لہذا اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرے گا تو صرف گناہگار نہیں ہوگا بلکہ کافر ہو جائے گا، اس لئے کہ اس نے

حضور اقدس ﷺ کے ارشاد کا انکار کر دیا، لہذا فوراً کافر ہو گیا۔

صحابہ کرامؓ ہی اس لائق تھے!

کبھی کبھی ہمارے دلوں میں یہ احمقانہ خیال آتا ہے کہ کاش ہم بھی حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں پیدا ہوئے ہوتے، اور اس زمانے کی برکات حاصل کرتے۔ ارے یہ تو اللہ تعالی کی حکمت ہے اور وہی اپنی حکمت سے فیصلہ فرماتے ہیں کہ اپنی حکمت سے ہمیں اس دور میں پیدا فرمایا، اگر ہم اس دور میں پیدا ہو جاتے تو خدا جانے کس اسفل السافلین میں ہوتے۔ اللہ تعالی بچائے آمین۔ اس لئے کہ وہاں ایمان کا معاملہ اتنا نازک تھا کہ ذرا سی دیر میں انسان اِدھر سے اُدھر ہو جاتا تھا۔

صحابہ کرام نے حضور اقدس ﷺ کے ساتھ جس جانثاری کا معاملہ فرمایا وہ انہی کا ظرف تھا۔ اور اسی کے نتیجے میں وہ اس درجے تک پہنچے اگر ہم جیسا آرام پسند اور عافیت پسند آدمی اس دور میں ہوتا تو خدا جانے کیا حشر بنتا۔ یہ تو اللہ تعالی کا بڑا فضل وکرم ہے کہ اس نے ہمیں اس انجام سے بچایا۔ اور ایسے دور میں پیدا فرمایا جس میں ہمارے لئے بہت سی آسانیاں ہیں۔ آج ایک حدیث کے بارے میں ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث ظنی ہے۔ اور ظنی ہونے کی وجہ سے اگر کوئی انکار کر دے گا تو کافر نہ ہوگا۔ صرف گناہ گار ہی ہوگا۔ لیکن صحابہ کرام کا معاملہ تو یہ تھا کہ اگر کوئی شخص حضور اقدس ﷺ کی زبان سے کوئی حکم سننے کے بعد انکار کر دے کہ میں نہیں کرتا فوراً کافر ہو جاتا۔ اللہ تعالی بچائے۔ آمین۔

یہ عورتیں شیر ہو گئیں ہیں!

لہذا جب حضور اقدس ﷺ نے یہ فرمایا کہ عورتوں کو نہ مارو تو اب مارنے کا سلسلہ بالکل بند ہو گیا۔ اس لئے کہ صحابہ کرامؓ تو ایسے نہیں تھے کہ حضور اقدس ﷺ سے کسی کام کے بارے میں ممانعت] اور پھر بھی وہ کام جاری رکھیں۔ جب مارنے کا سلسلہ بالکل بند ہو گیا تو کچھ دنوں کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ: ''یا رسول اللہ ﷺ یہ عورتیں تو اب اپنے شوہروں پر شیر ہو گئیں، اس لئے کے آپ ﷺ نے مارنے کی ممانعت کر دی۔ جس کے بعد اب کوئی شخص اپنی بیوی کو نہیں مارتا بلکہ مار کے قریب جانے سے بھی ڈرتا ہے۔ اور اس نہ مارنے کے نتیجے میں عورتیں شیر ہو گئی ہیں۔

اور شوہروں کی حق تلفیاں کرنے لگی ہیں۔ اور ان کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگی ہیں۔ اب آپ ﷺ فرمائیں کہ ان حالات میں ہم کیا کریں؟ چنانچہ حضور اقدس ﷺ نے اجازت دے دی کہ اگر عورتیں شوہروں کی حق تلفی کریں اور مارنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو تمہیں

مارنے کی اجازت ہے۔اب اس اجازت دینے کے نتیجے میں یہ ہوا کہ ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں بہت سی خواتین آنی شروع ہوگئیں۔اور آکر عرض کرتیں کہ یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ نے شوہروں کو مارنے کی اجازت دے دی جس سے لوگوں نے غلط فائدہ اٹھایا۔اور ہمیں اس طرح مارا۔

یہ اچھے لوگ نہیں ہیں!

آپ نے اپنا نام لے کر فرمایا کہ:''محمد ﷺ کے گھر میں بہت سی خواتین چکر لگاتی ہیں۔اور وہ اپنے شوہروں کی شکایت کرتی ہیں کہ وہ شوہران کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں۔ان کو بری طرح مارتے ہیں۔لہذا خوب اچھی طرح سن لو کہ جو لوگ یہ مار پیٹ کر رہے ہیں وہ تم میں اچھے لوگ نہیں ہیں۔اور اچھے مومن اور مسلمان کا کام نہیں ہے کہ وہ مار پیٹ کرے''۔اس سارے مجموعے سے آنحضرت ﷺ نے یہ بات واضح فرمادی کہ اگرچہ ناگزیر حالت میں، جب کوئی اور چارہ نہ رہے، اس وقت شریعت کی طرف سے ایسی مار کی اجازت ہے جس سے نشان نہ پڑے اور بہت زیادہ تکلیف نہ ہو، لیکن اس کے باوجود محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کی اصل خواہش یہ ہے کہ کوئی مرد کسی عورت پر کبھی ہاتھ نہ اٹھائے۔چنانچہ حضرات امہات المومنین رضی اللہ تعالی عنہما فرماتی ہیں کہ'' آنحضرت ﷺ ساری عمر کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا لہذا سنت کا تقاضہ بھی یہی ہے۔

دنیا کی بہترین چیز نیک بیوی!

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالی عنہما روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ''یہ دنیا ساری کی ساری لطف اندوزی کی چیز ہے''۔یعنی ایسی چیز ہے جس سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔نفع اٹھاتا ہے۔اور لطف اٹھاتا ہے اس لئے کہ اللہ تعالی نے یہ دنیا انسان کے نفع کیلئے پیدا فرمائی ہے۔جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالی نے فرمایا کہ:''اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہارے فائدے کیلئے پیدا کیا جو کچھ زمین میں ہے۔اور تمہارے نفع کیلئے اور تمہارئے لطف اٹھانے کیلئے اور تمہاری ضرورت پوری کرنے کیلئے پیدا کیا ۔اور دنیا کی بہترین متاع جس سے انسان نفع اٹھائے۔وہ نیک اور صالح عورت ہے''۔

ایک دوسری حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ''مجھے تمہاری دنیا میں سے تین چیز بہت زیادہ محبوب ہیں''۔کتنا خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا کہ:''تمہاری دنیا''میں سے یہ اس لئے فرمایا کہ آپ ﷺ دوسری جگہ پر یہ ارشاد فرما چکے تھے کہ''میرا دنیا سے کیا تعلق ! میں تو ایک ایسے سوار کی طرح ہوں جو کسی درخت کے سائے میں ذرا سی دیر کیلئے ٹھہرتا ہے۔اور پھر چلا جاتا ہے اور اس درخت کو چھوڑ

دیتا ہے''۔اس لئے آپ ﷺ نے فرمادیا کہ'' تمہاری دنیا میں سے تین چیزیں مجھے بہت زیادہ محبوب اور پسند ہیں۔ وہ کیا ہیں؟ایک نیک بیوی دوسری خوشبو اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے''۔

بری بیوی سے پناہ مانگو!

بہرحال تین پسندیدہ چیزوں میں سے ایک نیک بیوی ہے اس لئے کہ اگر عورت نیک نہ ہوتو اس سے حضور اقدس ﷺ نے پناہ مانگی: ''اے اللہ! میں اس عورت سے پناہ مانگتا ہوں جو مجھے بڑھاپے سے پہلے بوڑھا کردے اور اس اولاد سے پناہ مانگتا ہوں جو میرے لئے وبال ہوجائے''۔اللہ تعالی بچائے۔اس لئے جب اپنے لئے یا اپنی اولاد کیلئے رشتہ تلاش کروتو ایسی عورت تلاش کرو جس میں دین ہو صلاح ہو، نیکی ہو، اگر خدانہ کرے، نیکی نہیں تو وہ پھر عذاب بننے کا اندیشہ ہے۔لہذا اگر کسی شخص کو صالح بیوی کی نعمت میسر آئی ہوتو اس کو چاہئے کہ وہ اس کی قدر کرے۔اس کی ناقدری نہ کرے۔اور اس کی قدر یہی ہے کہ اس کے حقوق ادا کرے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کرے۔اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان ارشادات پر ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

سلسلہ اصلاحی خطبات | ٦٦

تقدیر پر راضی رہنا چاہیئے

- تکلیف پر، راضی رہنا چاہیئے
- بیماری پر، راضی رہنا چاہیئے
- روزی پر، راضی رہنا چاہیئے
- فیصلے پر، راضی رہنا چاہیئے
- موت پر، راضی رہنا چاہیئے
- نعمت پر، راضی رہنا چاہیئے
- پریشانی پر، راضی رہنا چاہیئے
- آمدنی پر، راضی رہنا چاہیئے
- ملازمت پر، راضی رہنا چاہیئے

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم

میمن اسلامک پبلشرز

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقدیر پر راضی رہنا چاہئے

الحمدلله نحمده ونستعينه ونستغفره ونومن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيات اعمالنا، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريك له ونشهدان سيدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبده ورسوله صلى الله تعالى عليه وعلى اله واصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيرا۔

اما بعد!

﴿عن أبي هريره رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: احرص على ماينفعك ولستعن بالله ولا تعجز، وان اصابك شيئى فلا تقل لوأني فعلتُ لكان كذا وكذا،

ولکن قل: قدر الله وماشاء فعل، فان "لو" تفتح عمل الشیطان﴾ (مسلم شریف کتاب القدر، باب فی الأمر بالقوۃ وترک العجز)

دنیا کی حرص مت کرو

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان کاموں کی حرص کرو جو تم کو نفع پہنچانے والے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ وہ اعمال اور وہ افعال جو آخرت میں نفع کا سبب بن سکتے ہیں ان کے اندر حرص کرو۔ دیکھئے! ویسے تو حرص بُری چیز ہے اور اس سے منع فرمایا گیا ہے کہ مال کی حرص، دنیا کی حرص، شہرت کی حرص، نام و نمود کی حرص، دولت کی حرص مت کرو اور انسان کے لئے یہ بہت بڑا عیب ہے کہ وہ ان چیزوں کی حرص کرے بلکہ ان تمام چیزوں میں قناعت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور فرمایا گیا ہے کہ ان میں سے جو کچھ تمہیں جائز طریقے سے کوشش کرنے کے نتیجے میں مل رہا ہے اس پر قناعت کرو اور یہ سمجھو کہ میرے لئے یہی بہتر تھا۔ مزید کی حرص کرنا کہ مجھے اور زیادہ مل جائے، یہ درست نہیں اور اس حرص سے بچو، کیونکہ دنیا میں کوئی بھی شخص اپنی ساری خواہشات کبھی پوری نہیں کرسکتا۔ "کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد"۔ بڑے سے بڑا بادشاہ، بڑے سے بڑا سرمایہ دار ایسا نہیں ملے گا جو یہ کہہ دے کہ میری ساری

خواہشات پوری ہوگئی ہیں۔ بلکہ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر ابن آدم کو ایک وادی سونے کی بھر کر مل جائے تو وہ یہ چاہے گا کہ دو مل جائیں۔ اور جب دو مل جائیں گی تو پھر خواہش کرے گا کہ تین ہو جائیں۔ اور ابن آدم کا پیٹ سوائے مٹی کے اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔ جب قبر میں جائے گا تو قبر کی مٹی اس کا پیٹ بھرے گی، دنیا کے اندر کوئی چیز اس کا پیٹ نہیں بھرے گی۔ البتہ ایک چیز ہے جو اس کا پیٹ بھر سکتی ہے۔ وہ ہے "قناعت" یعنی جو کچھ اس کو اللہ تعالیٰ نے جائز اور حلال طریقے سے دے دیا ہے، اس پر قناعت کرلے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، اس کے سوا پیٹ بھرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔

دین کی حرص پسندیدہ ہے

لہٰذا دنیا کی چیزوں میں حرص کرنا بُرا ہے اور اس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن دین کے کاموں میں، اچھے اعمال میں، عبادات میں حرص کرنا اچھی چیز ہے۔ مثلاً کوئی شخص نیک کام کر رہا ہے اس کو دیکھ کر یہ حرص کرنا کہ میں بھی یہ نیک کام کروں۔ یا فلاں شخص کو دین کی نعمت حاصل ہے مجھے بھی یہ نعمت حاصل ہو جائے۔ ایسی حرص مطلوب ہے اور محبوب اور پسندیدہ ہے۔ اس لئے اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسے کاموں کی حرص کرو جو آخرت میں نفع دینے

والے ہیں۔ اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فاستبقوا الخیرات یعنی نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ اور آپس میں مسابقت کرو۔

حضراتِ صحابہؓ اور نیک کاموں کی حرص

حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نیکیوں میں بڑے حریص تھے اور ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح ہمارے نامۂ اعمال میں نیکی کا اضافہ ہو جائے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے تو انہوں نے ان کو یہ حدیث سنائی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی نماز جنازہ میں شریک ہو تو اس کو ایک قیراط اجر ملتا ہے۔ اور اگر اس کے دفن میں بھی شریک رہے تو اس کو دو قیراط ملتے ہیں"۔

"قیراط" اس زمانے میں سونے کا ایک مخصوص وزن ہوتا تھا۔ آپ نے سمجھانے کے لئے قیراط کا لفظ بیان فرما دیا، پھر خود ہی فرمایا کہ آخرت کا وہ قیراط اُحد پہاڑ سے بھی بڑا ہو گا۔ مطلب یہ تھا کہ قیراط سے دنیا والا

قیراط مت سمجھ لینا بلکہ آخرت والا قیراط مراد ہے جو اپنی عظمت شان کے لحاظ سے اُحد پہاڑ سے بھی زیادہ بڑا ہے۔ اور یہ بھی اس اجر کا پورا بیان نہیں ہے۔ اس لئے کہ پورا بیان تو انسان کی قدرت میں بھی نہیں ہے کیونکہ انسان کی لغت اس کے بیان کے لئے ناکافی ہے۔ اس واسطے یہ الفاظ استعمال فرمائے۔ تاکہ ہماری سمجھ میں آجائے۔ بہرحال، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جب یہ حدیث سنی تو حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ کیا واقعۃً آپ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے؟ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے خود یہ حدیث سنی ہے۔ اس وقت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: افسوس! ہم نے اب تک بہت سے قیراط ضائع کردیئے۔ اگر پہلے سے یہ حدیث سنی ہوتی تو ایسے مواقع کبھی ضائع نہ کرتے۔ تو تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا یہی حال تھا کہ وہ اس بات کے حریص تھے کہ کسی طرح کوئی نیکی ہمارے نامۂ اعمال میں بڑھ جائے۔

یہ حرص پیدا کریں

ہم اور آپ وعظوں میں سنتے رہتے ہیں کہ فلاں عمل کا یہ ثواب ہے، فلاں عمل کا یہ ثواب ہے۔ یہ درحقیقت اس لئے بیان کئے جاتے ہیں تاکہ ہمارے دلوں میں ان اعمال کو انجام دینے کی حرص پیدا ہو۔ فضیلت

والے اعمال، نوافل، مستحبات اگرچہ فرض وواجب نہیں۔ لیکن ایک مسلمان کے دل میں ان کی حرص ہونی چاہئے کہ وہ ہمیں حاصل ہوجائیں۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ دین کی حرص عطا فرماتے ہیں تو ان کا یہ حال ہوجاتا ہے کہ وہ ہروقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح کوئی نیکی ہمارے نامۂ اعمال میں بڑھ جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دوڑ لگانا

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک دعوت میں تشریف لے جارہے تھے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی ساتھ تھیں۔ پیدل سفر تھا۔ راستے میں ایک جنگل اور میدان پڑتا تھا، اور بے پردگی کا احتمال نہیں تھا اس لئے کہ وہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا کہ اے عائشہ! کیا میرے ساتھ دوڑ لگاؤ گی؟ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ ہاں! دوڑ لگاؤں گی۔ اس دوڑ لگانے سے ایک طرف تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دلجوئی مقصود تھی اور دوسری طرف امت کو یہ تعلیم دینی تھی کہ بہت زیادہ بزرگ اور نیک ہوکر ایک کونے میں بیٹھ جانا بھی اچھی بات نہیں۔ بلکہ دنیا میں آدمیوں کی طرح اور انسانوں کی طرح رہنا چاہئے۔ اور ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی

ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ساتھ دو مرتبہ دوڑ لگائی۔ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم آگے نکل گئے اور دوسری مرتبہ جب دوڑ لگائی تو چونکہ اس وقت آپ کا جسم نسبۃً بھاری ہوگیا تھا اس لئے میں آگے نکل گئی اور آپ پیچھے رہ گئے۔ اس وقت آپ نے فرمایا: "تلک بتلک" یعنی دونوں برابر ہوگئے۔ ایک مرتبہ تم جیت گئیں اور ایک مرتبہ میں جیت گیا۔ اب دیکھئے کہ بزرگانِ دین اس سُنّت پر کس طرح عمل کرنے کے لئے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔

حضرت تھانویؒ کا اس سُنّت پر عمل

ایک مرتبہ حضرت حکیم الأمت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ تھانہ بھون سے کچھ فاصلہ پر ایک گاؤں میں دعوت میں تشریف لے جارہے تھے اور اہلیہ محترمہ ساتھ تھیں۔ جنگل کا پیدل سفر تھا، کوئی اور شخص بھی ساتھ نہیں تھا۔ جب جنگل کے درمیان پہنچے تو خیال آیا کہ الحمد للہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی سنّتوں پر عمل کرنے کی توفیق ہوگئی ہے لیکن اہلیہ کے ساتھ دوڑ لگانے کی سُنّت پر ابھی تک عمل کا موقع نہیں ملا۔ آج موقع ہے کہ اس سُنّت پر بھی عمل ہوجائے۔ چنانچہ اس وقت آپ نے دوڑ لگا کر اس سُنّت پر بھی عمل کرلیا۔ اب ظاہر ہے کہ دوڑ لگانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت پر عمل کرنے کے لئے دوڑ لگائی۔ یہ ہے

اتباعِ سُنّت کی حرص۔ نیک کاموں کی حرص۔ اجر وثواب حاصل کرنے کی حرص۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے اندر یہ حرص پیدا فرمادے۔ آمین۔

ہِمّت بھی اللہ سے مانگنی چاہیئے

اب بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے دل میں ایک نیک کام کرنے کا شوق پیدا ہوا اور دل چاہا کہ فلاں شخص یہ عبادت کرتا ہے، میں بھی یہ عبادت انجام دوں۔ لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ یہ عبادت اور یہ نیک کام ہمارے بس میں نہیں ہے، ہم نہیں کرپائیں گے، یہ تو بڑے لوگوں کا کام ہے۔ تو جب اس قسم کا خیال دل میں پیدا ہو تو اس وقت کیا کریں؟ اس کے لئے حدیث کے اگلے جملے میں ارشاد فرمایا کہ:

﴿واستعن بالله ولا تعجز﴾

یعنی ایسے وقت میں مایوس اور عاجز ہو کر نہ بیٹھ جائے کہ مجھ سے یہ عبادت ہو ہی نہیں سکتی بلکہ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرے۔ اور کہے کہ یا اللہ! یہ کام میرے بس میں تو نہیں ہے۔ لیکن آپ کی قدرت میں ہے۔ آپ ہی مجھے اس نیک کام کی توفیق عطا فرمادیں اور اس کے کرنے کی ہِمّت عطا فرمادیں۔

مثلاً نیک لوگوں کے بارے میں سنا کہ وہ رات کو اٹھ کر تہجد پڑھا کرتے ہیں اور رات کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں اور اللہ

تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہیں۔ تو اب دل میں شوق پیدا ہوا کہ مجھے بھی رات کو اٹھ کر تہجد کی نماز پڑھنی چاہئے۔ لیکن یہ خیال بھی آیا کہ رات کو اٹھ کر تہجد پڑھنا میرے بس میں نہیں۔ چلو چھوڑو اور مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے بلکہ اللہ تعالیٰ سے کہے کہ یا اللہ! میری آنکھ نہیں کھلتی، میری نیند پوری نہیں ہوتی۔ یا اللہ! تہجد پڑھنے کی توفیق عطا فرمادیجئے اور اس کی فضیلت عطا فرمادیجئے۔

یا عمل کی توفیق یا اجر و ثواب

کیونکہ جب اللہ تعالیٰ سے دعا کرے گا اور توفیق مانگے گا تو پھر دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو واقعۃً اللہ تعالیٰ اس عمل کی توفیق عطا فرمادیں گے۔ اور اگر اس عمل کی توفیق حاصل نہ ہوئی تو یقیناً اس نیک عمل کا ثواب انشاء اللہ ضرور حاصل ہو جائے گا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے شہادت طلب کرے اور یہ کہے کہ یا اللہ! مجھے اپنے راستے میں شہادت نصیب فرما، تو اللہ تعالیٰ اس کو شہادت کا مرتبہ عطا فرمادیتے ہیں۔ اگرچہ بستر پر ہی اس کا انتقال ہو جائے۔

ایک لوہار کا واقعہ

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا جب انتقال ہو گیا تو کسی

نے خواب میں ان کو دیکھا تو پوچھا کہ حضرت! کیسی گزری؟ جواب میں انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑے کرم کا معاملہ فرمایا اور مغفرت فرمادی اور استحقاق کے بغیر بڑا درجہ عطا فرمایا۔ لیکن جو درجہ میرے سامنے والے مکان میں رہنے والے لوہار کو نصیب ہوا وہ مجھے نہیں مل سکا۔ جب خواب دیکھنے والا بیدار ہوا تو اس کو یہ جستجو ہوئی کہ یہ معلوم کروں کہ وہ کون لوہار تھا اور کیا عمل کرتا تھا؟ جس کی وجہ سے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی آگے بڑھ گیا۔ چنانچہ وہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے محلے میں گیا اور پوچھا کہ یہاں کوئی لوہار رہتا تھا جس کا انتقال ہوگیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ ہاں، اس سامنے والے مکان میں ایک لوہار رہتا تھا۔ اور چند روز پہلے اس کا انتقال ہوا ہے۔ چنانچہ یہ لوہار کے گھر گیا اور اس کی بیوی سے اپنا خواب بیان کیا اور پوچھا کہ تمہارا شوہر ایسا کون سا عمل کرتا تھا جس کی وجہ سے وہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے آگے بڑھ گیا؟ لوہار کی بیوی نے بتایا کہ میرا شوہر ایسی کوئی خاص عبادت تو نہیں کرتا تھا۔ سارا دن لوہا کوٹتا رہتا تھا۔ البتہ میں نے اس کے اندر دو باتیں دیکھیں۔ ایک یہ کہ جب لوہا کوٹنے کے دوران اذان کی آواز "اللہ اکبر" کان میں پڑتی تو فوراً اپنا کام بند کردیتا تھا۔ حتیٰ کہ اگر اس نے اپنا ہتھوڑا کوٹنے کے لئے اوپر اٹھالیا ہوتا اور اتنے میں اذان کی آواز آجاتی تو وہ یہ بھی گوارا نہیں کرتا تھا کہ اس ہتھوڑے سے چوٹ لگادوں۔ بلکہ ہتھوڑے کو پیچھے کی

طرف پھینک دیتا اور اٹھ کر نماز کی تیاری میں لگ جاتا۔ دوسری بات میں نے یہ دیکھی کہ ہمارے سامنے والے مکان میں ایک بزرگ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ رہا کرتے تھے۔ وہ رات بھر اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر میرا شوہر یہ کہا کرتا تھا کہ یہ اللہ کے نیک بندے ساری رات عبادت کرتے ہیں۔ کاش اللہ تعالیٰ مجھے بھی فراغت عطا فرماتے تو میں بھی عبادت کرتا ـــــــ یہ جواب سن کر اس شخص نے کہا کہ بس یہی حسرت ہے جس نے ان کو حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے آگے بڑھا دیا ـــــــ میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ قصہ سنا کر فرمایا کرتے تھے کہ: یہ ہے "حسرت نایاب" جو بعض اوقات انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے ـــــــ اس لئے جب کسی کے بارے میں سنو کہ فلاں شخص یہ نیک عمل کرتا ہے تو اس نیک عمل کے بارے میں دل میں حرص اور حسرت پیدا ہونی چاہئے کہ کاش ہمیں بھی اس نیک کام کے کرنے کی توفیق مل جائے۔

حضراتِ صحابہؓ کرام کی فکر اور سوچ کا انداز

حدیث شریف میں آتا ہے کہ بعض صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ، ہمیں یہ فکر ہے کہ ہمارے بہت سے ساتھی

دولت مند اور مال دار ہیں۔ ان پر ہمیں رشک آتا ہے۔ اس لئے کہ جو جسمانی عبادت ہم کرتے ہیں۔ وہ بھی کرتے ہیں۔ لیکن جسمانی عبادت کے علاوہ وہ مالی عبادت بھی کرتے ہیں، مثلاً صدقہ خیرات کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں ان کے گناہ بھی معاف ہوتے ہیں اور ان کے درجات بھی بلند ہوتے ہیں۔ لہذا آخرت کے درجات میں وہ ہم سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور ہم جتنی بھی کوشش کرلیں لیکن غریب ہونے کی وجہ سے ان سے آگے نہیں بڑھ سکتے، اس لئے کہ ہم صدقہ خیرات نہیں کرسکتے ـــــــ دیکھئے، ہماری اور ان کی سوچ میں کتنا فرق ہے، ہم جب اپنے سے بڑے مالدار کے بارے میں سوچتے ہیں تو اس کے صدقہ خیرات کرنے پر ہمیں رشک نہیں آتا، بلکہ اس بات پر رشک آتا ہے کہ اس کے پاس دولت زیادہ ہے۔ اس لئے یہ بہت مزے سے زندگی گزار رہا ہے، کاش کہ ہمیں بھی دولت مل جائے تو ہم بھی عیش و آرام سے زندگی گزاریں۔ یہ ہے سوچ کا فرق۔

بہرحال، ان صحابہ کرام کے سوال کے جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں ایک ایسا عمل بتاتا ہوں کہ اگر تم اس عمل کو پابندی سے کرلو گے تو صدقہ خیرات کرنے والوں سے تمہارا ثواب بڑھ جائے گا، کوئی تم سے آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ وہ عمل یہ ہے کہ ہر نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ "سبحان اللہ"، ۳۳ مرتبہ "الحمدللہ"، ۳۴ مرتبہ "اللہ اکبر" پڑھ لیا کرو۔

نیکی کی حرص عظیم نعمت ہے

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہی ذکر مال داروں نے بھی شروع کردیا تو پھر ان صحابہ کرام کا سوال برقرار رہے گا۔ کیونکہ مالدار لوگ پھر ان سے آگے بڑھ جائیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ در حقیقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ بتلانا چاہتے تھے کہ جب تمہیں یہ حرص اور حسرت ہورہی ہے کہ ہم بھی مالدار ہوتے تو ہم بھی اسی طرح صدقہ خیرات کرتے جس طرح یہ مال دار لوگ کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ اس حرص کی برکت سے تم کو صدقہ خیرات کا اجر وثواب بھی عطا فرمادیں گے ـــــــ بہرحال، کسی نیک کام کے کرنے کی حرص اور ارادہ اور اس کے نہ کرسکنے کی حسرت بھی بڑی نعمت ہے۔ اس لئے جب کسی شخص کے بارے میں سنو کہ فلاں شخص یہ نیک عمل کرتا ہے تو تم یہ دعا کرلو کہ اے اللہ! یہ نیک کام میرے بس سے باہر ہے۔ آپ ہی اس کام کے کرنے میں میری مدد فرمائیے، اور مجھے اس کے کرنے کی توفیق عطا فرمائیے، تو پھر اللہ تعالیٰ یا تو اس نیک کام کے کرنے کی توفیق عطا فرمادیں گے۔ یا اس نیک کام کا اجر وثواب عطا فرمادیں گے۔ یہ نسخہ کیمیا ہے۔

لفظ "اگر" شیطانی عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے

آگے فرمایا کہ:

﴿وان اصابک شیئی فلا تقل لوأنی فعلت لکان کذا وکذا ولکن قل قدر الله وماشاء فعل، فان "لو" تفتح عمل الشیطان﴾

یعنی اگر دنیاوی زندگی میں تمہیں کوئی مصیبت اور تکلیف پہنچے تو یہ مت کہو کہ اگر یوں کرلیتا تو ایسا نہ ہوتا۔ اور اگر یوں کرلیتا تو ایسا ہو جاتا، یہ اگر مگر مت کہو، بلکہ یہ کہو کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور مشیّت یہی تھی۔ جو اللہ نے چاہا وہ ہوگیا، اس لئے کہ یہ لفظ "اگر" شیطان کے عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے ـــــــ مثلاً کسی کے عزیز کا انتقال ہو جائے تو کہتا ہے کہ اگر فلاں ڈاکٹر سے علاج کرالیتا تو یہ بچ جاتا، یا مثلاً کسی کے ہاں چوری ہوگئی، یا ڈاکہ پڑگیا تو یہ کہتا ہے کہ اگر فلاں طریقے سے حفاظت کرلیتا تو چوری نہ ہوتی وغیرہ۔ ایسی باتیں مت کہو، بلکہ یوں کہو کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں ایسا ہی ہونا مقدر تھا، اس لئے ہوگیا، میں اگر ہزار تدبیر کرلیتا تب بھی ایسا ہی ہوتا۔

دنیا راحت اور تکلیف سے مرکّب ہے

اس حدیث میں کیا عجیب وغریب تعلیم دی گئی ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں یہ بات اتار دے۔ آمین۔ یقین رکھیئے کہ اس دنیا میں سکون، عافیت، آرام اور اطمینان حاصل کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ انسان تقدیر پر یقین اور ایمان لے آئے۔ اس لئے کہ کوئی

انسان ایسا نہیں ہے جس کو اس دنیا میں کبھی کوئی غم اور پریشانی نہ آئی ہو۔ یا کبھی کوئی مصیبت اس کے اوپر نہ آئی ہو۔ یہ عالم دنیا دونوں چیزوں سے مرکب ہے، جس میں خوشی بھی ہے، غم بھی ہے، راحت بھی ہے اور تکلیف بھی ہے۔ یہاں کوئی خوشی بھی خالص نہیں، کوئی غم خالص نہیں۔ لہٰذا غم، تکلیف اور پریشانی تو اس دنیا میں ضرور آئے گی، اگر ساری دنیا کی دولت خرچ کر کے یہ چاہو کہ کوئی تکلیف نہ آئے تو یہ نہیں ہو سکتا۔

اللہ کے محبوب پر تکالیف زیادہ آتی ہیں

ہماری اور تمہاری کیا حقیقت ہے۔ انبیاء علیہم السلام جو اللہ تعالیٰ کی پیاری اور محبوب مخلوق ہے۔ ان کے اوپر بھی تکالیف اور پریشانیاں آتی ہیں۔ اور عام لوگوں سے زیادہ آتی ہیں۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿اشد الناس بلاءً الانبیاء ثم الأمثل فالأمثل﴾

(کنز العمال، حدیث نمبر ۶۷۸۳)

یعنی لوگوں میں سب سے زیادہ تکالیف انبیاء علیہم السلام پر آتی ہیں۔ اور پھر جو شخص انبیاء علیہم السلام سے جتنا قریب ہو گا اس کو اتنی ہی زیادہ تکالیف اور پریشانیاں آئیں گی، وہ عالم جہاں کوئی پریشانی اور تکلیف نہیں آئے گی، وہ عالم جنت ہے، ـــــ لہٰذا اس دنیا میں پریشانیاں تو آئیں

گی، لیکن اگر ان تکالیف پر یہ سوچنا شروع کردیا کہ ہائے یہ کیوں ہوا؟
اگر ایسا کرلیتے تو یہ نہ ہوتا۔ فلاں وجہ اور سبب کے ایسا ہوگیا۔ ایسا سوچنے
سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس سے حسرت بڑھتی ہے، تکلیف اور صدمہ
بڑھتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر شکوہ پیدا ہوتا ہے کہ معاذ اللہ ــــــ یہ
ساری مصیبتیں میرے مقدر میں رہ گئی تھیں، وغیرہ۔ اور وہ مصیبت
وبالِ جان بن جاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی تکلیف ہوئی
اور اس شکوہ کی وجہ سے آخرت میں اس پر عذاب کا مستحق ہوجاتا ہے۔
اور بعض اوقات ایمان بھی خطرہ میں پڑجاتا ہے۔

حقیر کیڑا مصلحت کیا جانے

اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں کہ جب
تمہیں کوئی پریشانی یا تکلیف آئے تو یہ سمجھو کہ جو کچھ پیش آیا ہے۔ یہ
اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے سے پیش آیا ہے۔ میں اس کی حکمت کیا
جانوں، اللہ تعالیٰ ہی اسکی حکمت اور مصلحت جانتے ہیں۔ ایک حقیر کیڑا
اس کی حکمت اور مصلحت کو کیا جانے ــــــ البتہ اس تکلیف پر رونا
آئے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ بعض لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ
تکلیف پر رونا نہیں چاہئے۔ یہ بات غلط ہے، اس لئے کہ تکلیف پر رونا
بُرا نہیں ہے۔ بشرطیکہ اللہ تعالیٰ سے اس مصیبت پر شکوہ نہ ہو۔

ایک بزرگ کا بھوک کی وجہ سے رونا

ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک صاحب ان سے ملنے گئے، دیکھا کہ وہ بیٹھے رو رہے ہیں۔ ان صاحب نے پوچھا کہ حضرت کیا تکلیف ہے؟ جس کی وجہ سے آپ رو رہے ہیں؟ ان بزرگ نے جواب دیا کہ بھوک لگ رہی ہے۔ اس شخص نے کہا کہ آپ کوئی بچے ہیں کہ بھوک کی وجہ سے رو رہے ہیں۔ بھوک کی وجہ سے تو بچے روتے ہیں۔ آپ تو بڑے ہیں۔ پھر بھی رو رہے ہیں؟ ان بزرگ نے فرمایا: تمہیں کیا معلوم، اللہ تعالیٰ کو میرا رونا دیکھنا ہی مقصود ہو۔ اس وجہ سے وہ مجھے بھوکا رکھ رہے ہیں ——— تو بعض اوقات اللہ تعالیٰ کو رونا بھی پسند آتا ہے، بشرطیکہ اس کے ساتھ شکوہ شکایت نہ ہو ——— اسی کو صوفیاء کرام کی اصطلاح میں "تفویض" کہا جاتا ہے۔ یعنی معاملہ اللہ کے سپرد کر دینا اور یہ کہنا کہ اے اللہ۔ مجھے ظاہری طور پر تکلیف ہو رہی ہے۔ لیکن فیصلہ آپ کا برحق ہے ——— اگر انسان کو اس بات کا یقین حاصل ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے کے بغیر ایک پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا اور تمام فیصلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں تو اس یقین کے بعد اطمینان اور سکون حاصل ہو جائے گا اور بیماری اور پریشانی کے وقت جو ناقابل برداشت صدمہ اور تکلیف ہوتی ہے وہ نہیں ہو گی۔

مسلمان اور کافر کا امتیاز

ایک کافر کا عزیز بیمار ہوا۔ اس نے ڈاکٹر سے علاج کرایا، ڈاکٹر کے علاج کے دوران اس کا انتقال ہوگیا، تو اب اس کافر کے پاس اطمینان حاصل کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، کیونکہ وہ تو یہی سمجھے گا کہ ڈاکٹر نے دوا صحیح تجویز نہیں کی، صحیح دیکھ بھال نہیں کی، اس لئے یہ مرگیا۔ اگر علاج صحیح ہوجاتا تو یہ نہ مرتا ــــــ لیکن ایک مسلمان کا عزیز بیمار ہوگیا، ڈاکٹر نے علاج کیا، لیکن اس کا انتقال ہوگیا تو اب اس مسلمان کے پاس اطمینان اور سکون حاصل کرنے کا ذریعہ موجود ہے، وہ یہ کہ اگرچہ اس کی موت کا ظاہری سبب ڈاکٹر کی غفلت ہے، لیکن جو کچھ ہوا، یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوا، ان کے ارادے سے موت واقع ہوئی، اگر ڈاکٹر صحیح دوا دیتا، تب بھی وہ دوا الٹی پڑجاتی۔ اور اگر میں اس ڈاکٹر کے علاوہ دوسرے ڈاکٹر کے پاس جاتا، تب بھی موت آتی۔ اس لئے کہ ہونا وہی تھا جو تقدیر میں اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا تھا۔ اس کی موت کا وقت آچکا تھا۔ اس کے دن پورے ہوگئے تھے، اس کو تو جانا تھا، اس لئے چلا گیا، اللہ تعالیٰ کی تقدیر برحق ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جو جلیل القدر صحابہ میں سے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں آگ کا کوئی انگارہ اپنی زبان پر رکھ لوں اور اس کو چاٹوں، یہ عمل مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں کسی ایسے واقع

کے بارے میں جو ہوچکا، یہ کہوں کہ کاش! یہ واقعہ نہ ہوتا، اور کسی ایسے واقع کے بارے میں جو نہیں ہوا، یہ کہوں کہ کاش! وہ واقعہ ہو جاتا۔

اللہ کے فیصلے پر راضی رہو

مقصد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بات کا فیصلہ فرمادیں، اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق کوئی واقعہ پیش آجائے تو اب اس کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ یا یہ کہنا کہ ایسا ہو جاتا، یہ کہنا اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی ہونے کے خلاف ہے۔ ایک مومن سے مطالبہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اور اس کے فیصلے پر راضی رہے، اور اس تقدیر کے فیصلے پر اس کے دل میں شکایت پیدا نہ ہو، اور نہ دل میں اس کی بُرائی ہو۔ بلکہ دل وجان سے اس پر راضی رہے ـــــــ ایک اور حدیث میں حضرابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

﴿اذا قضى الله قضاءً أحب أن يرضى بقضاءه﴾

یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی کام کے بارے میں فیصلہ فرمادیتے ہیں کہ یہ کام اس طرح انجام دیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ میرا بندہ اس فیصلے پر راضی ہو۔ اور اس فیصلے کو بے چوں چرا تسلیم کرے۔ یہ نہ کہے کہ یوں ہوتا تو اچھا تھا۔ فرض کریں کہ کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جو طبیعت کو ناگوار ہے اور وہ غم اور تکلیف کا واقعہ ہے۔ اب

پیش آچکنے کے بعد یہ کہنا کہ اگر یوں کرلیتے تو یہ واقعہ پیش نہ آتا۔ ایسا کہنے سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ اس لئے کہ جو واقعہ پیش آیا، وہ تو پیش آنا ہی تھا۔ اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور اس کی تقدیر تھی۔ تم اگر ہزار تدبیر بھی کرلیتے۔ تب بھی وہ فیصلہ ٹلنے والا نہیں تھا۔ لہٰذا اب فضول یہ باتیں کرنا کہ ایسا کرلیتے تو ایسا ہو جاتا۔ یہ باتیں اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونے کے منافی ہیں۔ ایسی باتیں کرنا مؤمن کا کام نہیں۔

رضاء بالقضاء میں تسلّی کا سامان ہے

حقیقت میں اگر غور کر کے دیکھا جائے تو انسان کے پاس (رضا بالقضاء) تقدیر پر راضی ہونے کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے؟ اس لئے کہ تمہارے ناراض ہونے سے وہ فیصلہ بدل نہیں سکتا جو غم پیش آیا ہے، تمہاری ناراضگی سے وہ غم دور نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس ناراضگی سے غم کی شدّت اور تکلیف میں مزید اضافہ ہو جائے گا اور یہ کہے گا کہ ہائے ہم نے یہ نہ کرلیا۔ فلاں تدبیر اختیار نہ کرلی ــــــــ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ رضا بالقضاء میں درحقیقت انسان کی تسلّی کا سامان ہے۔ اور ایک مؤمن کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو تسلّی کا ذریعہ بنادیا ہے۔

تقدیر "تدبیر" سے نہیں روکتی

اور یہ "تقدیر" عجیب وغریب عقیدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب ایمان کو عطا فرمایا ہے۔ اس عقیدہ کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ طرح طرح کی غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں ــــــ پہلی بات یہ ہے کہ کسی واقعہ کے پیش آنے سے پہلے تقدیر کا عقیدہ کسی انسان کو بے عملی پر آمادہ نہ کرے۔ مثلاً ایک انسان تقدیر کا بہانہ کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے اور یہ کہے کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ میں کچھ نہیں کرتا۔ یہ عمل حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ بلکہ حکم یہ ہے کہ جس چیز کے حاصل کرنے کی جو تدبیر ہے۔ اس کو اختیار کرو۔ اس کے اختیار کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑو۔

تدبیر کے بعد فیصلہ اللہ پر چھوڑ دو

دوسری بات یہ ہے کہ تقدیر کے عقیدے پر عمل کسی واقعہ کے پیش آنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی واقعہ پیش آچکا، تو ایک مؤمن کا کام یہ ہے کہ وہ یہ سوچے کہ میں نے جو تدبیریں اختیار کرنی تھیں وہ کرلیں اور اب جو واقعہ ہماری تدبیر کے خلاف پیش آیا، وہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے ہم اس پر راضی ہیں ــــــ لہٰذا واقعہ پیش آچکنے کے بعد اس پر بہت زیادہ پریشانی، بہت زیادہ حسرت اور تکلیف کا اظہار کرنا اور

یہ کہنا کہ فلاں تدبیر اختیار کرلیتا تو یوں ہو جاتا۔ یہ بات عقیدہ تقدیر کے خلاف ہے ــــــ ان دو انتہاؤں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے ہمیں راہ اعتدال یہ بتادی کہ جب تک تقدیر پیش نہیں آئی، اس وقت تک تمہارا فرض ہے کہ اپنی سی پوری کوشش کرلو۔ اور احتیاطی تدابیر بھی اختیار کرلو، اس لئے کہ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ تقدیر میں کیا لکھا ہے؟

حضرت فاروق اعظمؓ کا ایک واقعہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ شام کے دورے پر تشریف لے جارہے تھے۔ راستے میں آپ کو اطلاع ملی کہ شام کے علاقے میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی ہے ــــــ یہ اتنا سخت طاعون تھا کہ انسان بیٹھے بیٹھے چند گھنٹوں میں ختم ہو جاتا تھا۔ اس طاعون میں ہزارہا صحابہ کرامؓ شہید ہوئے ہیں۔ آج بھی اردن میں حضرت عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے مزار کے پاس پورا قبرستان ان صحابہ کرامؓ کی قبروں سے بھرا ہوا ہے جو اس طاعون میں شہید ہوئے ــــــ بہرحال، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کہ وہاں جائیں یا نہ جائیں اور واپس چلے جائیں۔ اس وقت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث سنائی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اگر کسی علاقے میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑے تو جو لوگ اس علاقے سے باہر ہیں وہ

اس علاقے کے اندر داخل نہ ہوں، اور جو لوگ اس علاقے میں مقیم ہیں۔ وہ وہاں سے نہ بھاگیں ـــــ یہ حدیث سن کر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس حدیث میں آپ کا صاف صاف ارشاد ہے کہ ایسے علاقے میں داخل نہیں ہونا چاہئے۔ لہٰذا آپ نے وہاں جانے کا ارادہ ملتوی کردیا ـــــ اس وقت ایک صحابی غالباً حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ تھے، انہوں نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

﴿أتفر من قدر الله؟﴾

کیا آپ اللہ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟ یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے اس طاعون کے ذریعہ موت کا آنا لکھ دیا ہے تو وہ موت آکر رہے گی۔ اور اگر تقدیر میں موت نہیں لکھی تو جانا اور نہ جانا برابر ہے۔ جواب میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

﴿لو غيرك قالها يا أبا عبيده﴾

اے ابوعبیدہؓ اگر آپ کے علاوہ کوئی شخص یہ بات کہتا تو میں اس کو معذور سمجھتا، لیکن آپ تو پوری حقیقت سے آگاہ ہیں آپ یہ کیسے کہہ رہے ہیں کہ تقدیر سے بھاگ رہا ہوں۔ پھر فرمایا کہ:

﴿نعم نفر من قدر الله الى قدر الله﴾

"ہاں! ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ کی تقدیر کی طرف

بھاگ رہے ہیں"۔

مطلب یہ تھا کہ جب تک واقعہ پیش نہیں آیا، اس وقت تک ہمیں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا حکم ہے۔ اور ان احتیاطی تدابیر کو اختیار کرنا عقیدہ تقدیر کے خلاف نہیں، بلکہ عقیدہ تقدیر کے اندر داخل ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے کہ احتیاطی تدابیر اختیار کرو، چنانچہ اس حکم پر عمل کرتے ہوئے واپس جارہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اگر تقدیر میں ہمارے لئے طاعون کی بیماری میں مبتلا ہونا لکھا ہے تو اس کو ہم ٹال نہیں سکتے۔ لیکن اپنی سی تدبیر ہمیں پوری کرنی ہے۔

"تقدیر" کا صحیح مفہوم

یہ ہے ایک مؤمن کا عقیدہ کہ اپنی طرف سے تدبیر پوری کی، لیکن تدبیر کرنے کے بعد معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کردیا اور یہ کہہ دیا کہ یا اللہ، ہمارے ہاتھ میں جو تدبیر تھی وہ تو ہم نے اختیار کرلی۔ اب معاملہ آپ کے اختیار میں ہے، آپ کا جو فیصلہ ہوگا۔ ہم اس پر راضی رہیں گے۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا ـــــــ لہٰذا واقعہ کے پیش آنے سے پہلے عقیدہ تقدیر کسی کو بے عملی پر آمادہ نہ کرے۔ جیسے بعض لوگ عقیدہ تقدیر کو بے عملی کا بہانہ بنالیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔ لہٰذا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں۔

کام کیوں کریں؟ یہ درست نہیں، کیونکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اپنی تدبیر کرتے رہو۔ ہاتھ پاؤں ہلاتے رہو۔ لیکن ساری تدابیر اختیار کرنے کے بعد اگر واقعہ اپنی مرضی کے خلاف پیش آجائے تو اس پر راضی رہو لیکن اگر تم اپنی رضامندی کا اظہار نہ کرو، بلکہ یہ کہہ دو کہ یہ فیصلہ تو بہت غلط ہوا، بہت بُرا ہوا تو اس کا نتیجہ سوائے پریشانی میں اضافے کے کچھ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ جو واقعہ پیش آچکا ہے۔ وہ بدل نہیں سکتا، اور آخر کار تمہیں سر تسلیم خم کرنا ہی پڑے گا۔ اس لئے پہلے دن ہی اس کو تسلیم کرلینا چاہئے کہ جو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے ہم اس پر راضی ہیں۔

غم اور صدمہ کرنا "رضابالقضاء" کے منافی نہیں

اب ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے۔ وہ یہ کہ جیسا کہ میں پہلے عرض کیا تھا کہ اگر کوئی تکلیف دہ واقعہ پیش آئے، یا کوئی غم یا صدمہ پیش آئے تو اس غم اور تکلیف پر رونا صبر کے منافی اور خلاف نہیں۔ اور گناہ نہیں ـــــــ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ غم اور صدمہ کرنا اور اس کا اظہار کرنا جائز ہے۔ رونا بھی جائز ہے۔ اور دوسری طرف آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا چاہئے۔ یہ دونوں چیزیں کیسے جمع کریں کہ ایک طرف فیصلے پر راضی بھی ہوں اور دوسری طرف غم اور صدمہ کا اظہار بھی کرنا جائز ہو؟ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ غم اور صدمہ کا اظہار الگ چیز ہے۔ اور اللہ

کے فیصلے پر راضی ہونا الگ چیز ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ عین حکمت پر مبنی ہے، اور ہمیں اس کی حکمت معلوم نہیں، اور حکمت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے دل کو تکلیف پہنچ رہی ہے۔ اس لئے غم اور صدمہ بھی ہے اور اس غم اور صدمہ کی وجہ سے ہم رو بھی رہے ہیں۔ اور آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ کیا ہے، وہ برحق ہے۔ حکمت پر مبنی ہے۔ لہٰذا "رضا" سے مراد رضاء عقلی ہے۔ یعنی عقلی طور پر انسان یہ سمجھے کہ یہ فیصلہ صحیح ہے۔

ایک بہترین مثال

مثلاً ایک مریض ڈاکٹر سے آپریشن کرانے کے لئے ہسپتال جاتا ہے، اور ڈاکٹر سے درخواست کرتا ہے، اور اس کی خوشامد کرتا ہے کہ میرا آپریشن کردو۔ جب ڈاکٹر نے آپریشن شروع کیا تو اب یہ رو رہا ہے۔ چیخ رہا ہے۔ ہائے ہائے کر رہا ہے۔ اور اس تکلیف کی وجہ سے اس کو رنج اور صدمہ بھی ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ڈاکٹر کو آپریشن کی فیس بھی دیتا ہے اور اس کا شکریہ بھی ادا کرتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ وہ عقلی طور پر جانتا ہے کہ جو کچھ ڈاکٹر کر رہا ہے، وہ ٹھیک کر رہا ہے، اور میرے فائدے کے لئے کر رہا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک مؤمن کو اس دنیا میں جتنی تکلیفیں اور جتنے صدمے پہنچتے ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی

طرف سے پہنچتے ہیں۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ تمہارا آپریشن کر رہے ہیں۔ اب اگر ان تکالیف کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر رہے ہو تو اس کا انجام تمہارے حق میں بہتر ہونے والا ہے ——— لہٰذا عقلی طور پر اگر یہ بات دل میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اور پھر انسان اس صدمے پر اور اس تکلیف پر اظہار غم کرے۔ روئے، چلائے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔

کام کا بگڑنا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات ایک تاجر شخص اس بات کی کوشش میں لگا ہوتا ہے کہ میرا فلاں سودا ہو جائے تو اس کے ذریعہ میں بہت نفع کما لوں گا۔ یا ایک شخص کسی عہدے اور منصب کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ مجھے فلاں منصب مل جائے تو بڑا اچھا ہو، اب اس سودے کے لئے یا اس منصب کے لئے بھاگ دوڑ اور کوشش کر رہا ہے، دعائیں کر رہا ہے، دوسروں سے بھی دعائیں کرا رہا ہے، لیکن جب سب کام مکمل ہو چکے، اور قریب تھا کہ وہ سودا ہو جائے۔ یا وہ عہدہ اور منصب اس کو مل جائے، عین اس وقت اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ میرا یہ نادان اور بیوقوف بندہ اس سودے کے یا منصب کے حاصل کرنے کے پیچھے پڑا ہوا ہے، اور اپنی پوری کوشش صرف کر رہا ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ اگر یہ سودا یا یہ منصب اس کو حاصل ہو گیا تو مجھے اس کو جہنم میں ڈالنا پڑے گا، اس

لئے کہ اس سودے یا اس عہدے کے نتیجے میں یہ گناہ میں مبتلا ہوگا۔ اور اس کے نتیجے میں مجھے اس کو جہنم میں دھکیلنا پڑے گا۔ اس لئے یہ منصب یہ سودا اس سے دور کر دیا جائے، چنانچہ عین اس وقت جب کہ وہ سودا ہونے والا تھا۔ یا وہ عہدہ ملنے ہی والا تھا کہ اچانک کوئی رکاوٹ کھڑی ہوگئی۔ اور وہ سودا نہیں ہوا۔ یا وہ عہدہ نہیں ملا۔ اب یہ شخص رو رہا ہے اور یہ شکایت کر رہا ہے کہ فلاں شخص نے بیچ میں آکر میرا کام بگاڑ دیا۔ اور اب اس بگاڑ کو دوسروں کی طرف منسوب کر رہا ہے۔ حالانکہ اس کو یہ معلوم نہیں کہ جو کچھ کیا وہ اس کے خالق اور مالک نے کیا ہے۔ اور اس کے فائدے کے لئے کیا، کیونکہ اگر یہ عہدہ مل جاتا تو جہنم کے عذاب میں مبتلا ہوتا ——— یہ ہے تقدیر اور اللہ کا فیصلہ جس پر عقلی طور پر انسان کو راضی رہنا چاہئے۔

تقدیر کے عقیدے پر ایمان لاچکے ہو

عقیدہ کے اعتبار سے تو ہر مؤمن کا تقدیر پر ایمان ہوتا ہے۔ جب ایک بندہ ایمان لاتا ہے تو اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لانے کے ساتھ وہ تقدیر پر بھی ایمان لاتا ہے:

﴿آمنت باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الآخر والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ﴾

لیکن اس ایمان کا اثر عموماً اس کی زندگی پر ظاہر نہیں ہوتا اور اس

عقیدے کا استحضار نہیں رہتا۔ اور اس کی طرف دھیان نہیں رہتا۔
جس کی وجہ سے وہ دنیا میں پریشان ہوتا رہتا ہے، اس لئے صوفیاء کرام
فرماتے ہیں کہ جب تم اس عقیدے پر ایمان لے آئے تو اس عقیدے
کو اپنی زندگی کا جزو بناؤ، اور اس عقیدے کا دھیان پیدا کرو، اور اس کو یاد
رکھو، اور جو بھی واقعہ پیش آئے اس وقت اس کو تازہ کرو کہ میں اللہ کی
تقدیر پر ایمان لایا تھا، اسلئے مجھے اس پر راضی رہنا چاہئے۔ یہی فرق ہے
ایک عام آدمی میں اور اس شخص میں جس نے صوفیاء کرام کی زیر
تربیت اس عقیدے کو اپنی زندگی میں اپنانے کی کوشش کی ہو ——
لہٰذا اس عقدے کو اس طرح حال بنالیں کہ جب کبھی کوئی ناگوار واقعہ
پیش آئے تو اس وقت "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھے۔ اور ساتھ میں
اللہ تعالیٰ کے حوالے کردے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے، آگے ہمیں اس
کے اندر چون وچرا کرنے کی گنجائش نہیں —— اس کی مشق کرنی
پڑتی ہے۔ تب جاکر یہ عقیدہ حال بن جاتا ہے۔ اور جب یہ حال بن جاتا
ہے تو پھر ایسے شخص کو دنیا میں کبھی پریشانی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اس
عقیدے کو ہم سب کا حال بنادے۔ آمین

یہ پریشانی کیوں ہے؟

دیکھئے، صدمہ اور غم اور چیز ہے یہ تو ہر شخص کو پیش آتی ہیں۔ لیکن
ایک ہے پریشانی، وہ یہ کہ آدمی اس غم اور صدمہ کی وجہ سے بے تاب

اور بے چین ہے۔ کسی کروٹ چین نہیں آرہا ہے یہ پریشانی کیوں ہے؟ اس لئے کہ وہ شخص اس فیصلے پر عقلی طور پر راضی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے آدمی کو چین اور سکون کیسے میسر آئے؟ ـــــ اور جس شخص کا اس بات پر ایمان ہے کہ میرے اختیار میں جو کچھ تھا وہ میں نے کرلیا۔ اب آگے میرے اختیار سے باہر تھا۔ اس لئے میں کچھ نہیں کرسکتا تھا اور اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ برحق ہے، ایسے شخص کو کبھی پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔ غم اور صدمہ ضرور ہوگا۔ لیکن پریشانی نہیں ہوگی۔

آب زر سے لکھنے کے قابل جملہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو مجھے اس پر بہت شدید صدمہ ہوا، زندگی میں اتنا بڑا صدمہ کبھی پیش نہیں آیا تھا، اور یہ صدمہ بے چینی کی حد تک پہنچا ہوا تھا، کسی کروٹ کسی حال قرار نہیں آرہا تھا اور اس صدمہ پر رونا بھی نہیں آرہا تھا۔ اس لئے کہ بعض اوقات رونے سے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے ـــــ اس وقت میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبد الحئی صاحب قدس اللہ سرہ کو اپنی یہ کیفیت لکھی تو انہوں نے جواب میں صرف ایک جملہ لکھ دیا اور الحمد للہ آج تک وہ جملہ دل پر نقش ہے اور اس ایک جملے نے اتنا فائدہ پہنچایا کہ میں بیان نہیں کرسکتا، وہ جملہ یہ تھا:

"صدمہ تو اپنی جگہ پر ہے۔ لیکن غیر اختیاری امور
پر اتنی زیادہ پریشانی قابل اصلاح ہے"۔

یعنی صدمہ تو اپنی جگہ ہے، وہ ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ عظیم باپ سے جدائی ہوگئی۔ لیکن یہ ایک غیر اختیاری واقعہ پیش آیا، اس لئے تم یہ نہیں کرسکتے تھے کہ موت کے وقت کو ٹلا دیتے۔ اب اس غیر اختیاری واقعے پر اتنی پریشانی قابل اصلاح ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ رضا بالقضاء کا جو حکم ہے۔ اس پر عمل نہیں ہو رہا ہے اور اس پر عمل نہ ہونے کی وجہ سے پریشانی ہو رہی ہے ——— یقین جانئے اس ایک جملے کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے سینے پر برف رکھ دی۔ اور میری آنکھیں کھول دیں۔

لوح دل پر یہ "جملہ" نقش کرلیں

ایک اور موقع پر اپنے دوسرے شیخ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے خط میں لکھا کہ حضرت! فلاں بات کی وجہ سے سخت پریشانی ہے۔ جواب میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جملہ لکھا کہ:

"جس شخص کا اللہ جل جلالہ سے تعلق ہو، اس کا
پریشانی سے کیا تعلق؟"

یعنی پریشانی اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہو تو پھر پریشانی آنے کی مجال نہیں ـــــــ اس لئے کہ جو صدمہ اور غم ہو رہا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے کہو، یا اللہ اس کو دور فرمادیں اور پھر اللہ تعالیٰ جو فیصلہ فرمائیں اس پر راضی رہو۔ لیکن پریشانی کس بات کی؟ لہٰذا اگر رضا بالقضاء حال بن جائے اور جسم و جان کے اندر داخل ہو جائے تو پھر پریشانی کا گزر نہیں ہو سکتا۔

حضرت ذوالنون مصریؒ کے راحت و سکون کا راز

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے جاکر پوچھا کہ حضرت کیا حال ہے؟ فرمایا: بڑے مزے میں ہوں۔ اور اس شخص کے مزے کا کیا پوچھتے ہو کہ اس کائنات میں کوئی واقعہ اس کی مرضی کے خلاف نہیں ہوتا۔ بلکہ جو واقعہ بھی پیش آتا ہے وہ اس کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ لہٰذا دنیا کے سارے کام میری مرضی کے مطابق ہو رہے ہیں ـــــــ سوال کرنے والے نے کہا کہ حضرت! یہ بات تو انبیاء علیہم السلام کو بھی حاصل نہیں ہوئی کہ دنیا کے تمام کام ان کی مرضی کے مطابق ہو جائیں۔ آپ کو یہ کیسے حاصل ہوئی؟ جواب میں فرمایا کہ میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے۔ جو اللہ کی مرضی، وہ میری مرضی، اور دنیا کے سارے کام اللہ تعالیٰ کی مرضی سے

ہوتے ہیں۔ اور میری بھی وہی مرضی ہے۔ اور جب سارے کام میری مرضی سے ہو رہے ہیں تو میرے مزے کا کیا پوچھنا۔ پریشانی تو میرے پاس بھی نہیں بھٹکتی، پریشانی تو اس شخص کو ہو جس کی مرضی کے خلاف کام ہوتے ہوں۔

تکالیف بھی حقیقت میں رحمت ہیں

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن کو رضا بالقضاء کی دولت عطا فرمادیتے ہیں۔ ان کے پاس پریشانی کا گزر نہیں ہوتا ـــــــ ان کو صدمہ ضرور ہوتا ہے۔ غم اور تکلیف ان کے پاس ضرور آتی ہے۔ لیکن پریشانی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ جو کچھ غم یا صدمہ آرہا ہے، وہ میرے مالک کی طرف سے آرہا ہے۔ اور میرے مالک کی حکمت کے مطابق آرہا ہے، اور میرے مالک کی تقدیر کے مطابق میرا فائدہ بھی اسی میں ہے۔ حتیٰ کہ بعض بزرگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

یعنی یہ بات تمہارے دشمن کو نصیب نہ ہو کہ وہ تیری تلوار سے ہلاک ہو، دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو اس پر اپنا خنجر آزمائے ـــــــ یعنی یہ جو تکلیفیں پہنچ رہی ہیں۔ یہ بھی ان کی رحمت کا عنوان

ہے۔ اور جب ان کی رحمت کا عنوان ہے تو دوسروں کو کیوں پہنچیں، یہ بھی ہمیں پہنچیں۔

ایک مثال

حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ اس کی ایک مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک شخص آپ کا محبوب ہے۔ اس سے آپ کو انتہاء درجہ کی محبت ہے اور اس محبوب کے دور ہونے کی وجہ سے بہت عرصہ سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اچانک وہ محبوب آپ کے پاس آتا ہے، اور چپکے سے آکر آپ کو پیچھے سے پکڑ کر زور سے دبالیتا ہے۔ اور اتنی زور سے دباتا ہے کہ پسلیاں ٹوٹنے کے قریب ہونے لگتی ہیں، اور آپ کو تکلیف ہوتی ہے جس کے نتیجے میں آپ چیختے اور چلاتے ہیں اور اپنے کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تم کون ہو؟ وہ جواب میں کہتا ہے کہ میں تمہارا فلاں محبوب ہوں۔ اگر تمہیں میرا یہ دبانا پسند نہیں ہے تو میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں اور تمہارے رقیب کو دبالیتا ہوں۔ اگر تم عاشق صادق ہو تو یہی جواب دوگے کہ میرے رقیب کو مت دبانا۔ بلکہ مجھے ہی دباؤ اور زور سے دباؤ۔ اور یہ شعر پڑھوگے کہ ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمیں یہ ادراک عطا فرمادے کہ یہ تکلیفیں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا عنوان ہیں۔ لیکن ہم چونکہ کمزور ہیں۔ اس لئے ہم ان تکالیف کو مانگتے نہیں، لیکن جب وہ تکلیف آگئی تو ان کی حکمت اور فیصلے سے آئی ہے، اس لئے وہ ہمارے حق میں بہتر ہے۔

تکلیف مت مانگو، لیکن آئے تو صبر کرو

ہمارے بس کا یہ کام نہیں ہے کہ ہم ان تکالیف کو مانگیں، لیکن جن کو ان تکالیف کی حقیقت کا ادراک ہوتا ہے، وہ بعض اوقات مانگ بھی لیتے ہیں، چنانچہ بعض صوفیاء کرام سے مانگنا منقول ہے، خاص کر وہ تکلیف جو دین کے راستے میں پہنچے اس کو تو عاشقان صادق نے ہزارہا تکالیف پر مقدم اور افضل قرار دیا۔ اس کے بارے میں یہ شعر کہا کہ ؎

بجرم عشق تو کشند عجب غوغانیسیت
تو غیر برسر جام آکہ خوش تماشانیسیت

یعنی تیرے عشق کے جرم میں لوگ مجھے مار رہے ہیں، اور گھسیٹ رہے ہیں۔ اور ایک شور برپا ہے، آکر دیکھ کہ تماشے کا کیسا شاندار منظر ہے ـــــــ یہ تو بڑے لوگوں کی بات ہے لیکن ہم لوگ چونکہ کمزور ہیں۔ طاقت اور قوت اور صلاحیت نہیں ہے۔ اس لئے ان تکالیف کو اللہ تعالیٰ سے مانگتے نہیں ہیں۔ بلکہ عافیت مانگتے ہیں کہ یا اللہ عافیت عطا

فرمایئے، اور جب تکلیف آجاتی ہے تو اس کے ازالے کی بھی دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! یہ تکلیف اگرچہ آپ کی نعمت ہے، لیکن ہماری کمزوری پر نظر کرتے ہوئے اس نعمت کو عافیت کی نعمت سے بدل دیجئے لیکن پریشانی نہیں ہونی چاہئے۔ اس کا نام "رضا بالقضاء" ہے۔ تقدیر پر ایمان تو سب کا ہوتا ہے کہ جو کچھ تقدیر میں لکھا تھا وہ ہو گیا۔ لیکن اس عقیدے کو اپنی زندگی کا حال بنانا چاہئے۔ "حال" بنانے کے بعد انشاء اللہ پریشانی پاس نہیں بھٹکے گی۔

اللہ والوں کا حال

چنانچہ آپ نے اللہ والوں کو دیکھا ہو گا کہ ان کو آپ کبھی بے تاب اور بے چین اور پریشان نہیں پائیں گے۔ ان کے ساتھ کیسا ہی بڑے سے بڑا ناگوار واقعہ پیش آجائے۔ اس پر ان کو غم تو ہو گا۔ لیکن بے تابی اور بے چینی اور پریشانی ان کے پاس بھی نہیں پھٹکتی۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ اس پر راضی رہنا ضروری ہے۔ لہٰذا انسان کی زندگی میں جب بھی کوئی ناگوار واقعہ پیش آجائے تو اس کو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ خیال کرتے ہوئے اس پر راضی رہنے کی فکر کرے۔ غم، صدمہ اور پریشانی کا یہی علاج ہے۔ اور ایسا کرنے سے اس کو اعلیٰ درجہ کا صبر حاصل ہو جائے گا اور صبر وہ اعلیٰ عبادت ہے جو ساری عبادتوں سے بڑھ کر ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿انما یوفی الصّٰبرون اجرھم بغیر حسابٍ﴾
"یعنی اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر عطا فرمائیں گے"۔

کوئی شخص تکلیف سے خالی نہیں

ہر تکلیف کے موقع پر یہ سوچنا چاہئے کہ اس کائنات میں کوئی ایسا شخص ہو نہیں سکتا جس کو اپنی زندگی میں کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچی ہو۔ چاہے وہ بڑے سے بڑا بادشاہ ہو، بڑے سے بڑا سرمایہ دار اور دولت مند ہو، بڑے سے بڑا صاحب منصب ہو، بڑے سے بڑا نیک، ولی اللہ ہو، بڑے سے بڑا نبی ہو۔ لہٰذا تکلیف تو تمہیں ضرور پہنچے گی۔ تم چاہو تو بھی پہنچے گی اور نہ چاہو تو بھی پہنچے گی۔ اس لئے کہ یہ دنیا ایسی جگہ ہے جہاں راحت بھی ہے، غم بھی ہے، خوشی ہے، پریشانی بھی ہے۔ خالص راحت بھی کسی کو حاصل نہیں۔ خالص غم بھی کسی کو میسر نہیں۔ یہ طے شدہ بات ہے۔ حتیٰ کہ خدا کا انکار کرنے والوں نے خدا کے وجود کا انکار کر دیا۔ (العیاذ باللہ) لیکن اس بات سے انکار نہیں کر سکے کہ اس دنیا میں کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ جب یہ بات طے شدہ ہے کہ تکلیف پہنچنی ہے تو اب سوال یہ ہے کہ کون سی تکلیف پہنچے اور کون سی تکلیف نہ پہنچے۔ اس کا ایک راستہ تو یہ ہے کہ تم خود فیصلہ کرلو کہ مجھے فلاں تکلیف پہنچے اور فلاں تکلیف نہ پہنچے۔ کیا تمہارے اندر اس بات

کی طاقت ہے کہ تم یہ فیصلہ کرو کہ فلاں تکلیف میرے حق میں بہتر ہے اور فلاں تکلیف بہتر نہیں ہے؟ ظاہر ہے کہ تم نہیں جانتے کہ کون سی تکلیف کا انجام میرے حق میں بہتر ہوگا اور کون سی تکلیف کا انجام بہتر نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کردو، اور یہ کہہ دو کہ یا اللہ! آپ اپنے فیصلے کے مطابق جو تکلیف دینا چاہیں وہ دے دیجئے اور پھر اس کو برداشت کرنے کی طاقت بھی دے دیجئے اور اس پر صبر بھی عطا فرمایئے۔

چھوٹی تکلیف بڑی تکلیف کو ٹال دیتی ہے

انسان بے چارہ اپنی عقل کے دائرے میں محدود ہے، اس کو یہ پتہ نہیں کہ جو تکلیف مجھے پہنچی ہے اس نے مجھے کسی بڑی تکلیف سے بچالیا ہے۔ مثلاً کسی شخص کو بخار آگیا، تو اب اس کو بخار کی تکلیف نظر آرہی ہے، یا کوئی شخص کسی ملازمت کے لئے کوشش کررہا تھا، لیکن وہ ملازمت اس کو نہیں ملی۔ اس کو یہ تکلیف نظر آرہی ہے۔ یا گھر میں سامان کی چوری ہوگئی۔ اس کو یہ تکلیف نظر آرہی ہے۔ لیکن اس کو یہ معلوم نہیں کہ اگر یہ تکلیف نہ پہنچتی تو دوسری کون سی تکلیف پہنچتی؟ اور وہ تکلیف بڑی تھی یا یہ تکلیف بڑی ہے؟ چونکہ اس کو اس کا علم نہیں ہے۔ اس لئے جو تکلیف اس کو پہنچی ہے تو اس کو لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور اس کا ذکر اور چرچا کرتا رہتا ہے کہ ہائے مجھے یہ تکلیف پہنچ

گئی، بلکہ اس موقع پر انسان یہ سوچے کہ اچھا ہوا کہ اس چھوٹی سی تکلیف پر بات ٹل گئی۔ ورنہ خدا جانے کتنی بڑی مصیبت آتی۔ کیا بلا نازل ہوتی۔ یہ سوچنے سے انسان کو تسلی ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ انسان کو دکھا بھی دیتے ہیں کہ جس مصیبت کو تم بڑی تکلیف سمجھ رہے تھے۔ دیکھو وہ کیسی رحمت ثابت ہوئی۔

اللہ سے مدد مانگو

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری تسلّی کے لئے یہ دعا بھی تلقین فرمادی کہ:

﴿لا ملجأ ولا منجأ من الله الا إليه﴾

اللہ تعالیٰ سے بچاؤ کا سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں کہ اسی کی آغوش رحمت میں پناہ لو، یعنی اس کے فیصلے پر راضی رہو، اور پھر اسی سے مدد مانگو، یا اللہ، اس کو دور فرمادیجئے، اسی بات کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ایک مثال کے ذریعہ سمجھاتے ہیں کہ ایک تیر انداز تصور کرو، جس کے پاس اتنی بڑی تیر کمان ہے جس نے ساری کائنات کو گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ اور اس کمان کے ہر ہر حصے میں تیر لگے ہوئے ہیں، اور دنیا میں کوئی جگہ ایسی محفوظ نہیں ہے۔ جس جگہ پر وہ تیر نہ پہنچ سکتے ہوں۔ پوری دنیا کا چپہ چپہ اس کی زد میں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسے تیر

انداز کے تیروں سے بچنے کی کیا صورت ہے؟ کون سی جگہ ایسی ہے جہاں پر جاکر ان تیروں سے بچا جاسکے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تم تیروں سے بچنا چاہتے ہو تو اس تیز انداز کے پہلو میں جاکر کھڑے ہو جاؤ، اس کے علاوہ کوئی اور جگہ بچاؤ کی نہیں ہے ـــــــ اسی طرح یہ مصائب، یہ حوادثات، یہ پریشانیاں اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے فیصلوں کے تیر ہیں۔ ان تیروں سے اگر بچاؤ کی کوئی جگہ ہے تو وہ اللہ تعالیٰ ہی کے دامن رحمت میں ہے۔ اس کے علاوہ کوئی جگہ نہیں ہے ـــــــ اس لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہئے کہ یا اللہ، ناقابل برداشت تکلیف مت دیجئے اور جب تکلیف دیں تو اس پر صبر بھی عطا فرمادیں اور اس کو میری مغفرت اور ترقی درجات کا ذریعہ بنائیے۔ آمین۔

ایک نادان بچے سے سبق لیں

آپ نے چھوٹے بچے کو دیکھا ہوگا کہ جب ماں اس کو مارتی ہے۔ اس وقت بھی وہ ماں ہی کی گود میں اور زیادہ گھستا ہے، حالانکہ جانتا ہے کہ میری ماں مجھے مار رہی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ بچہ یہ بھی جانتا ہے کہ ماں پٹائی تو کر رہی ہے لیکن اس پٹائی کا علاج بھی اسی کے پاس ہے اور مجھے شفقت اور محبت بھی اسی کی آغوش میں مل سکتی ہے ـــــــ لہٰذا جب بھی کوئی ناگوار بات یا واقعہ پیش آجائے تو یہ سوچو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اور اسی کی آغوش رحمت میں مجھے پناہ مل سکتی ہے، یہ

سوچ کر پھر اسی سے اس کے ازالے کی اور اس پر صبر کی دعا کریں۔ یہ ہے "رضا بالقضاء" اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو عطا فرمادیں۔ آمین۔

اللہ کے فیصلے پر رضامندی خیر کی دلیل ہے

ایک اور حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿إذا اراد الله بعبدٍ خيرا ارضاه بما قسم له وبارك له فيه، واذا لم يرد به خيرا، لم يرضه بما قسم له ولم يبارك له فيهِ﴾

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کی بھلائی اور خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو اپنی قسمت پر راضی کردیتے ہیں، اور اس قسمت میں اس کے لئے برکت بھی عطا فرماتے ہیں، اور جب کسی سے بھلائی کا ارادہ نہ فرمائیں (العیاذ باللہ) تو اس کو اس کی قسمت پر راضی نہیں کرتے۔ یعنی اس کے دل میں قسمت پر اطمینان اور رضا پیدا نہیں ہوتی۔ اور اس کے نتیجے میں یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ حاصل ہے۔ اس میں بھی برکت نہیں ہوتی ـــــ اس حدیث کے ذریعہ یہ بتادیا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو قسمت پر راضی کردیتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ پھر یہ ہوتا ہے کہ اگرچہ اس کو تھوڑا ملا ہو، لیکن اس

تھوڑے میں ہی اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمادیتے ہیں۔

برکت کا مطلب اور مفہوم

آج کی دنیا گنتی کی دنیا ہے اور ہر چیز کی گنتی گنی جاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ مجھے ایک ہزار روپے ملتے ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ مجھے دو ہزار روپے ملتے ہیں۔ تیسرا کہتا ہے کہ مجھے دس ہزار روپے ملتے ہیں ـــــ لیکن کوئی شخص یہ نہیں دیکھتا کہ اس گنتی کے نتیجے میں مجھے کتنی راحت ملی؟ کتنا آرام ملا؟ کتنی عافیت حاصل ہوئی؟ اب مثلاً ایک شخص کو پچاس ہزار روپے مل گئے۔ لیکن گھر کے اندر پریشانیاں، بیماریاں ہیں اور سکون حاصل نہیں ہے اور ہر وقت پریشانی کے اندر مبتلا ہے۔ اب بتایئے وہ پچاس ہزار کس کام کے؟ اس سے پتہ چلا کہ وہ پچاس ہزار روپے برکت والے نہیں تھے۔ بے برکتی والے ہیں ـــــ ایک دوسرا شخص ہے جس کو ایک ہزار روپے ملے۔ لیکن اس کو راحت اور آرام اور عافیت میسّر ہے۔ تو اگرچہ وہ گنتی میں ایک ہزار ہیں۔ لیکن اپنے حاصل اور نتائج کے اعتبار سے یہ ایک ہزار والا پچاس ہزار والے سے آگے بڑھ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہزار برکت والے تھے اور اس ایک ہزار سے بے شمار کام اور فائدے حاصل ہو گئے۔

ایک نواب کا واقعہ

حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ نے مواعظ میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں ایک نواب تھے۔ ان کی بڑی زمینیں، جائیدادیں، نوکر چاکر وغیرہ سب کچھ تھا۔ ایک مرتبہ میری ان سے ملاقات ہوئی تو ان نواب صاحب نے خود مجھے بتایا کہ "میں اپنے بارے میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میرے پاس یہ ساری دولتیں ہیں۔ جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ لیکن مجھے ایک ایسی بیماری لاحق ہو گئی ہے کہ اس کی وجہ سے کوئی چیز نہیں کھاسکتا۔ اور میرے معالج نے میرے لئے صرف ایک غذا تجویز کی ہے۔ وہ یہ کہ گوشت کا قیمہ بناؤ، اور اس قیمہ کو ایک کپڑے میں باندھ کر اس کا رس نکالو اور اس کو چمچے کے ذریعہ پیو ـــــ اب دیکھئے، دسترخوان پر دنیا بھر کے انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے ہیں، ہزار قسم کی نعمتیں حاصل ہیں لیکن صاحب بہادر نہیں کھاسکتے۔ اس لئے کہ بیمار ہیں۔ ڈاکٹر نے منع کردیا ہے۔ بتاؤ، وہ دولت کس کام کی جس کو انسان اپنی مرضی سے استعمال نہ کرسکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالٰی نے اس نعمت میں برکت نہیں ڈالی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ نعمت بیکار ہو گئی ـــــ ایک دوسرا آدمی ہے جو محنت مزدوری کرتا ہے، ساگ روٹی کھاتا ہے، لیکن بھرپور بھوک کے ساتھ اور پوری لذّت کے ساتھ کھاتا ہے، اور وہ کھانا اس کے جسم کو جاکر لگتا

ہے۔ اب بتایئے یہ مزدور بہتر ہے یا وہ نواب بہتر ہے؟ حالانکہ گنتی اس کی زیادہ ہے، اور اس مزدور کی گنتی کم ہے۔ لیکن راحت اس مزدور کو نصیب ہے۔ اس نواب کو میسر نہیں۔ اس کا نام ہے برکت۔

قسمت پر راضی رہو

بہرحال، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا جو بندہ قسمت پر راضی ہوجائے اور قسمت پر راضی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تدبیر چھوڑ دے، اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے، بلکہ کام کرتا رہے۔ لیکن ساتھ میں اس پر راضی ہو کہ اس کام کرنے کے نتیجے میں جو کچھ مجھے مل رہا ہے۔ وہ میرے لئے بہتر ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے لئے اسی میں برکت عطا فرمادیتے ہیں۔ اسی کو راحت کا سبب بنادیتے ہیں ـــــــ اور اگر کوئی شخص قسمت پر راضی نہ ہو، بلکہ ہر وقت ناشکری کرتا رہے اور یہ کہتا رہے کہ مجھے تو ملا ہی کیا ہے۔ میں تو محروم رہ گیا۔ میں تو پیچھے رہ گیا۔ تو اس کا نتیجہ پھر یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ تھوڑا بہت ملا ہوا ہے۔ اس کی لذت سے بھی محروم ہوجاتا ہے اور اس میں برکت نہیں ہوتی ـــــــ انجام تو وہی ہوگا جو اللہ تعالیٰ چاہیں گے۔ اور اتنا ہی ملے گا جتنا اللہ تعالیٰ چاہیں گے، تمہارے رونے سے۔ ناشکری کرنے سے تمہاری حالت نہیں بدل جائے گی۔ لیکن اس ناشکری سے نقصان یہ ہوگا کہ موجودہ نعمت سے جو نفع حاصل ہو سکتا تھا وہ بھی حاصل نہ ہوا۔

میرے پیمانے میں لیکن حاصل میخانہ ہے

اس لئے اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمتوں پر راضی رہو، چاہے وہ مال و دولت کی نعمت ہو، پیشے کی نعمت ہو، صحت کی نعمت ہو۔ حسن و جمال کی نعمت ہو۔ دنیا کی ہر دولت اور ہر نعمت پر راضی رہو، اور یہ سوچو کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمت جس مقدار میں مجھے عطا فرمائی ہے وہ میرے حق میں بہتر ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر ہے جو یاد رکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا ؎

مجھ کو اس سے کیا غرض کس جام میں ہے کتنی مے
میرے پیمانے میں لیکن حاصل میخانہ ہے

یعنی دوسروں کے پیالوں مین کتنی مے بھری ہے، مجھے اس سے کیا تعلق، لیکن میرے پیمانے میں جو مے ہے، وہ میرے لئے کافی ہے۔ لہٰذا مجھے اس سے کیا غرض کہ کسی کو ہزار مل گئے۔ کسی کو لاکھ ملے، کوئی کروڑ پتی بن گیا، لیکن جو کچھ مجھے ملا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ میں اسی میں مگن ہوں، اور اس پر خوش ہوں ——— بس یہ فکر حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی فکر سے قناعت حاصل ہوتی ہے۔ اسی سے رضا بالقضاء حاصل ہوتی ہے۔ اسی سے تکلیفیں اور صدمے دور ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یہ فکر عطا فرمادے اور اس کو ہمارا حال

بنادے۔ آمین

﴿وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین﴾

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ناموس رسالت ﷺ کی توہین

اسباب اور سدباب

از: شیخ الاسلام مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیۃ

مرتب: محمد انور حسین (فاضل و متخصص جامعہ دارالعلوم، کراچی)

مغربی ممالك کی طرف سے توهین رسالت کا ناپاك سلسله ۲۰۰۶ء سے شروع هوا تها، جب سے اب تك یه مکروه سلسله وقفے وقفے سے جاری هے، اس موضوع پر جن حضرات کو حق تعالیٰ نے قابل قدر خدمات سر انجام دینے کی توفیق عطافرمائی هے ان میں شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتهم کا نام سر فهرست هے، حضرت والا مدظلهم کے تحریری وتقریری ارشادات کا خلاصه جامعه دارالعلوم کراچی کے فاضل جناب مولانا محمد انور حسین صاحب نے مرتب کیا هے۔ جو ماهنامه البلاغ ترجمان دارالعلوم کراچی شماره جمادی الاولیٰ والثانیه میں شامل اشاعت هے۔

الحمد للّٰه نحمده ونستعینه ونستغفره ونؤمن به ونتوکل علیه ونعوذ باللّٰه من شرور أنفسنا ومن سیئات أعمالنا من یهده اللّٰه فلا مضلّ له ومن یضلله فلاهادی له ونشهد أن لااله الا اللّٰه وحده لاشریک له ونشهد أنّ سیّدنا وسندنا ونبیّنا ومولانا محمّداً عبده ورسوله صلی اللّٰه تعالیٰ علیه وعلیٰ اله وأصحابه وبارک وسلّم تسلیماً کثیراً کثیراً۔

أما بعد!

حضرات علمائے کرام اور قابل احترام قارئین!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مذاکرہ غرض وغایت

آج یہ مبارک مذاکرہ سیدالاولین والآخرین سرکار رسالت مآب ﷺ کے ناموس کے سلسلے میں مسلمانوں پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان پر غور وفکر کرنے اور ان کے مطابق اپنا لائحہ عمل طے کرنے کے لئے منعقد ہوا ہے۔

حالات پس منظر

حالات کے جس پس منظر میں یہ مبارک مذاکرہ منعقد ہوا ہے اس سے ہر مسلمان واقف ہے، اور اس وقت پورے عالم

اسلام میں مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک پوری مسلم دنیا میں ان دریدہ ذہن اور بد باطن افراد کی حرکت کے خلاف اضطراب، غم وغصے اور احتجاج کی ایک لہر دوڑی ہوئی ہے، جنہوں نے محسن انسانیت سرور دوعالم سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان میں گستاخی کر کے اپنی بد باطنی کا ثبوت دیا ہے۔

حیلۂ گناہ بدتر از گناہ

افسوس ناک بات یہ ہے اپنی اس شرمناک حرکت پر کسی ندامت کا اظہار کرنے کے بجائے اس پر معافی مانگنے کے بجائے اپنی اس حرکت کے جواز میں مختلف حیلے بہانے تراشے جارہے ہیں۔ کہا جارہا ہے کہ ان بد باطن افراد کے خلاف کوئی کارروائی آزادیٔ اظہار رائے کے اصولوں کے خلاف ہے۔

اہلِ مغرب کی مکاری

اہل مغرب کا ایک عرصہ سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ اس نے کچھ خوبصورت الفاظ گھڑ لئے ہیں اور ان کو اپنی زندگی کا محور قرار دے کر دنیا بھر میں اپنی معصومیت کا ڈھنڈورا پیٹا ہے، یہ الفاظ ایسے ڈھیلے ڈھالے ہیں کہ ان میں وہ جس معنی کو چاہیں اس ڈھیلے ڈھالے جامے میں داخل کر دیں اور جس چیز کو چاہیں نکال دیں۔ جمہوریت انسانی حقوق اور پرامن بقائے باہمی یہ سارے وہ الفاظ جن کا دن رات راگ الاپا جاتا ہے لیکن اگر ان کی تہہ میں عملی کارروائیوں کو دیکھا جائے تو سوائے اس کے اس کا کوئی مطلب نہیں نکلتا کہ یہ الفاظ جب تک ہمارے سیاسی اور ہمارے ذاتی مفادات کو برتری وتقدم حاصل ہو اس وقت تک تو ان کا تحفظ اور احترام لازمی ہے، لیکن جب ان ہی سے کوئی ہمارے مفادات سے ٹکرا جائے تو نہ آزادی اظہار رائے باقی رہتی ہے، نہ انسانی حقوق اور نہ پرامن بقائے باہمی۔

آزادیٔ اظہارِ رائے کا مقصد

ہم عرصے سے یہ کھیل دیکھتے چلے آرہے ہیں کہ اور انہوں نے یہ خوبصورت الفاظ دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے گھڑے ہوئے ہیں۔ یہ آزادی اظہار رائے جس کا ڈھنڈورا پیٹا جارہا ہے اور جس کے پردے میں وہ شرمناک گستاخی کی جارہی ہے کہ جس کے مقابل اس روئے زمین پر کسی اور گستاخی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا حال یہ ہے کہ آپ لوگ جانتے ہوں گے کہ یورپ اور دیگر متعدد ممالک میں یہ قانون نافذ ہے کہ یہودیوں کے ہولوکاسٹ کے خلاف اگر کوئی تاریخی تحقیق بھی کرنا چاہے تو اسے اس کی اجازت نہیں ہے اور قانون اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ ان حالات کی کھوج کرید میں پڑے کہ یہودیوں کو جرمنی سے جب نکالا گیا تھا تو کتنے افراد واقعۃً قتل ہوئے تھے اور کتنے قتل نہیں ہوئے تھے، اگر کوئی شخص علمی بنیاد پر یہ تاریخی تحقیق کرنا چاہے تو یہ قانوناً جرم ہے اور پھر بھی یہی کہا جاتا ہے کہ آزادی اظہار رائے ہے۔

درسِ عبرت

مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ آج سے چند سال پہلے جب پاکستان میں مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا تو ان کی طرف سے پوری مغربی دنیا میں یہ فریاد کی جارہی تھی کہ ہم پر ظلم ہو رہا ہے آزادی اظہار رائے کے اوپر پاکستان میں پابندی عائد کی جارہی ہے، ان ہی دنوں میں ایک دن میں اپنے گھر میں بیٹھا تھا کہ مغرب کے وقت گھر کی گھنٹی بجی باہر نکل کر دیکھا تو ہمارے پاکستان کی وزارت خارجہ کے ایک ذمہ دار افسر پیرس سے ایمنسٹی انٹرنیشنل جو کہ ایک ادارہ ہے اس کے ڈائریکٹر کو لے کر تشریف لائے اور عجیب بات یہ تھی کہ کسی سابقہ اجازت کے بغیر یہ حضرات تشریف لائے اور مجھ سے کہا کہ ہم آپ کا انٹرویو لینا چاہتے ہیں، میں نے پوچھا کہ کس موضوع پر آپ انٹرویو لینا چاہتے ہیں؟

تو کہنے لگے کہ مجھے پیرس سے اس مشن پر بھیجا گیا ہے کہ میں جنوبی ایشیا کے لوگوں کا سروے کروں کہ ان کے ذہنوں میں آزادی اظہار رائے کا کیا تصور ہے اور آزادی اظہار رائے کے بارے میں وہ کیا مؤقف رکھتے ہیں۔ انہوں نے پہلے مجھ سے معذرت کی تھی کہ ہم آپ سے **Appointment** کے بغیر آ گئے ہیں، مجھے یہ اندازہ ہوا کہ وہ بہت مختصر وقت کے لئے آئے ہیں وہ پہلے **Appointment** بھی نہیں لے سکے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کب تشریف لائے؟ تو کہنے لگے کہ میں کل کراچی پہنچا ہوں، پھر میں نے پوچھا کہ اب آگے آپ کا کیا پروگرام ہے؟ تو کہنے لگے کہ کل مجھے اسلام آباد جانا ہے اور دو دن وہاں رہ کر پھر میں نئی دہلی جاؤں گا پھر وہاں سے کوالالمپور جانا ہے۔

میں نے کہا کل دورہ کتنے دنوں کا ہے؟ کہنے لگے کہ ایک ہفتے میں یہ دورہ مکمل ہوگا۔ تو میں نے کہا کہ کراچی میں جو آپ دو دن رہے۔ کل سے ابتک رہے تو ذرا یہ فرمائیے کہ کتنے لوگوں کا انٹرویو آپ نے لیا؟ کہنے لگے کہ پانچ آدمیوں کا انٹرویو لے چکا ہوں چھٹے آپ ہیں۔ تو میں نے کہا کہ ان چھ آدمیوں کا انٹرویو لے کر آپ نے پوری کراچی کا سروے مکمل کرلیا اور جو کل آپ اسلام آباد جارہے ہیں تو ایک دن یا دو دن رہ کر پانچ چھ آدمیوں کا سروے وہاں کرلیں گے اور اس کے بعد پھر دہلی اور کوالالمپور جائیں گے اور ایک ہفتے کے اندر یہ سروے مکمل کر کے آپ اپنی رپورٹ ''سب مٹ'' کردیں گے تو یہ فرمائیے کہ یہ سروے کیا واقعی کوئی سنجیدہ سروے ہے جو اتنی مدت میں کیا جائے؟

کہنے لگے میں مجبور ہوں، مجھے اتنا ہی وقت دیا گیا ہے اور وقت کی کمی کے باعث میں اس سے زیادہ لوگوں سے ملاقات نہیں کرسکتا اس لئے انہی افراد سے انٹرویو کر کے میں اپنا سروے مکمل کروں گا۔ میں نے کہا کہ اگر آپ کے پاس اتنا ہی کم وقت تھا کہ آپ پانچ چھ افراد سے زیادہ کسی سے ملاقات نہیں کرسکتے تھے تو آپ کو کس ڈاکٹر نے مشورہ دیا تھا کہ سروے کریں، اگر سروے کرنا ہی تھا تو اس کے لئے وقت نکالتے لیکن اگر آپ تھوڑے سے وقت میں چند افراد کی بات سن کر اور پورے جنوبی ایشیا کی طرف آپ ایک نقطہ نظر منسوب کرنے والے ہیں تو معاف کیجئے اس غیر سنجیدہ سروے میں، میں پارٹی بننے کو تیار نہیں، لہٰذا میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔

آپ میرے مہمان ہیں بیشک چائے پیجئے میں آپ کی خاطر تواضع کروں گا لیکن جہاں تک انٹرویو کا تعلق ہے تو میں آپ کو کوئی انٹرویو نہیں دوں گا۔

ہمارے ملک کی وزارت خارجہ کے افسر جوان کے ساتھ تھے، انہوں نے مجھ سے کہا کہ جناب دیکھئے یہ صاحب بہت دور سے آئے ہیں کم از کم کچھ تو آپ ان کی رعایت کر لیجئے، میں نے کہا کہ مہمان کی حیثیت سے رعایت یہ ہے کہ میرے پاس چائے پیئں، لیکن جہاں تک معاملے کی بات ہے تو میں ایسے غیر سنجیدہ سروے میں حصہ لینے کو تیار نہیں ہوں، جس کا مقصد دنیا کو دھوکہ دینا ہو میں پورے جنوبی ایشیا کا سروے کر کے اور سارے جنوبی ایشیا کے سر پر ایک مؤقف تھوپ دیا جائے یا مجھے بتا دیں کہ میری بات غلط ہے، مجھے سمجھا دیں کہ اتنے دنوں میں سروے ہوسکتا ہے، ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ انہوں نے کہا بات تو آپ کی ٹھیک ہے لیکن میں آپ سے محض التماس کرتا ہوں کہ میں بہت دور سے آیا ہوں تو کچھ تو میری باتوں کا جواب دیدیں، میں نے کہا کہ آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا آخر چونکہ ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا خاموش ہو کر بیٹھ گئے تو میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک سوال آپ سے کرلوں؟ وہ کہنے لگے کہ میں آپ سے سوال کرنے آیا تھا آپ الٹا مجھ سے سوال کرنے لگے، میں نے کہا میں تو آپ سے اجازت مانگ رہا ہوں اگر آپ اجازت دیں گے تو سوال کروں گا اور اگر اجازت نہیں دیں گے تو سوال نہیں کروں گا انہوں نے کہا: اچھا کیجئے۔

سوال: میں نے کہا کہ میرا سوال یہ ہے کہ آپ آزادی اظہار رائے کے بارے میں ایک تحقیق کرنے کیلئے نکلے ہیں اور آپ کے ادارے نے اس آزادی اظہار رائے کو اپنا موٹو بنایا ہوا ہے، آپ یہ بتایئے کہ آپ کے خیال میں آزادی اظہار ائے بالکل اپسلوٹ ہے اس کے اوپر کوئی شرط، کوئی قید، کوئی پابند نہیں یا یہ کہ اس کے اوپر کوئی شرط اور پابندیاں عائد ہوسکتی ہیں؟ کہنے لگے کہ میں مطلب نہیں سمجھا۔

تو میں نے کہا کہ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک شخص یہ کہے کہ جتنے بڑے بڑے سرمایہ دار ہیں ان سب نے قوم کی دولت کو لوٹا ہے، لہٰذا میں لوگوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ ان لوگوں کی تجوریوں پر، ان لوگوں کے خزانوں پر، ان کے بنک بیلنس پر ڈاکے ڈالیں اور پیسے اکٹھے کر کے غریبوں کی مدد کریں، تو بتائے کیا اس بات کی آپ اجازت دیں گے، آپ اس ایکسپریشن کی فریڈم کے بھی قائل ہیں کہ اس کی بھی آزادی ملنی چاہیئے کہ لوگ ڈاکے ڈالنے کی دعوت دیدیں جب کہ مقصد ان کا نیک ہو کہ غریبوں کی امداد کی جائے؟ کہنے لگے نہیں اس کی اجازت نہیں ہوسکتی۔ میں نے کہا کہ اگر اس کی اجازت نہیں ہوسکتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فریڈم آف ایکسپریشن یہ بالکل اپسلوٹ چیز نہیں ہے، مطلق چیز نہیں ہے کہ اس کے اوپر کوئی پابندی عائد نہ ہو، کہنے لگے ہاں کچھ نہ کچھ تو پابندیاں عائد ہونگی۔

میں نے کہا کہ بتایئے وہ پابندیاں کیا ہیں اور کون مقرر کرے گا؟ کس کے پاس یہ اتھارٹی ہے کہ وہ یہ پابندیاں عائد کرے کہ فریڈم آف ایکسپریشن پر یہ پابندی ہونی چاہیئے اور یہ پابندی نہیں ہونی چاہیئے۔ اگر آپ کے ادارے نے اس کے بارے میں

کوئی تحقیق کی ہوتو براہ کرم مجھے اس سے مطلع فرمائیں۔ کہنے لگے اس سے پہلے ہم نے اس موضوع پر سوچا نہیں ہے اور اگر ہمارے ادارے میں اس پر کوئی کام ہوا ہوگا تو ہم آپ کو مطلع کریں گے۔ میں نے کہا کہ آپ ضرور مطلع کریں لیکن میں آپ سے یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ اس سوال کا جواب زندگی بھر نہیں دے سکتے کہ آخر آزادی اظہار رائے پر پابندی کس قسم کی ہوسکتی ہے اور کون سی اتھارٹی ہے جو یہ طے کرے کہ کونسی پابندی معقول ہے اور جائز ہے اور کون سی پابندی ناجائز ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ آج انسانوں کا ایک گروہ یہ کہے گا کہ فلاں پابندی ہونی چاہیئے، دوسرا گروہ کہے گا فلاں پابندی ہونی چاہیئے اور متفقہ بنیاد انسانوں کے درمیان فراہم ہونا تقریباً ناممکن ہے۔

اس کا تو ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جس ذات نے اظہار رائے کی طاقت انسان کی زبان کو اور قلم کو عطا کی ہے اسی ذات سے پوچھا جائے کہ کونسی آزادی اے اللہ تیرے نزدیک جائز ہے اور کون سی آزادی اظہار رائے تیرے نزدیک ناجائز ہے۔ جب تک اللہ ﷻ کے آگے سر نہیں جھکایا جائے گا اور اللہ ﷻ کے پیغمبر جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کے قدموں میں سر نہیں رکھا جائیگا تو کوئی بھی شخص اس کا معیار اور اس کی کوئی بنیاد فراہم نہیں کرسکتا، چنانچہ آج اس واقعے کو کئی سال گذر گئے ہیں، وہ دن ہے اور آج کا دن ہے آج تک پلٹ کر انھوں نے اس سوال کا جواب دینے کی یا اس کے بارے میں کوئی وضاحت کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی، اس لئے کہ ان کے پاس کوئی جواب تھا ہی نہیں۔

تو یہ سارے الفاظ آزادی اظہار رائے، پرامن بقائے باہمی اور انسانی حقوق یہ اس وقت تک ہیں، جب تک اپنے مفادات کو یہ سرو کررہے ہوں۔

وہی انسانی حقوق کے علم بردار جب افغانستان اور عراق پر بمباری کرتے ہیں، بے گناہ بچوں اور عورتوں کو شہید کرتے ہیں ،تو کوئی انسانی حقوق کی بات ان کے دماغ میں نہیں آتی اور وہی لوگ جو آزادی اظہار رائے اور انسان کی آزادی کے قائل تھے آج یہ قانون بنا رہے ہیں کہ جس پر چاہو حملہ کردو، جب چاہو حملہ کردو، جس سرحد کو چاہو پار کرلو، تو ان بہانوں کے ذریعے آخر کب تک انسانیت کو دھوکا دیا جائے گا!

نبی کریم سرور دو عالم محمد مصطفیٰ ﷺ کی توقیر و تعظیم تو یہ ہے کہ یہ دریدہ ذہن ہزار بدزبانیاں کیا کریں لیکن نبی کریم ﷺ کی عظمت وجلال میں ان کی بدباطنی سے حبہ برابر کوئی کمی نہیں آتی۔ جب تک اس کائنات کے اوپر اللہ ﷻ کی حکمرانی قائم ہے، نبی کریم سرور دو عالم ﷺ حرمت وتقدیس کے گیت گائے جاتے رہیں گے۔ اللہ ﷻ نے خود قرآن کریم میں فرمادیا:

"انّا کفینک المستھزء ین".

"جو لوگ تمہارا انداق اڑاتے ہیں ہم تمہارے لئے ان کی سازشوں کے خلاف کافی ہیں"۔

قرآن کریم نے خود فرمادیا:

"ورفعنا لک ذکرک".

"ہم نے آپ کے تذکرے کو بلند مقام عطا کیا ہے"۔

لہٰذا یہ ہزار بد باطنیاں کیا کریں لیکن سرور دو عالم ﷺ کی عظمت شان میں اس سے کوئی فرق نہیں آتا۔

فرد مسلم کی ذمہ داری

ہاں! ایک مسلمان ہونے کے ناطے ہمارا فرض ہے کہ جب کبھی ایسی گستاخی کی جائے تو اس پر مسلمان اپنے ردعمل کا اظہار کرے اور اس کا اصل ردعمل تو وہ ہے جو ہماری تاریخ میں غازی علم دین شہید رحمہ اللہ نے کر کے دکھایا، اصل ردعمل تو وہ تھا اور ہماری تاریخ میں غازی علم دین شہید جیسے لوگوں سے بھری ہے ہوئی ہے لیکن ہم یہاں دور بیٹھ کر کیا سکتے ہیں اس کے بارے میں الحمدللہ اس مذاکرے کے اندر بہت سی تجاویز آپ حضرات کے سامنے آئی ہیں، ہمیں قومی سطح پر بھی اور بین الاقوامی سطح پر بھی اس بد باطنی کے خلاف احتجاج کو قوت کے ساتھ جاری رکھنا ہے اور یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ یہ مغربی طاقتیں ٹھیٹھ لفظوں میں اگر میں لفظ استعمال کروں تو ہماری اردو زبان کا محاورہ ہے کہ "یہ لوگ جوتے کے آشنا ہیں" یعنی ان کے اوپر دباؤ ڈالنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کی مصنوعات کا بائیکاٹ کریں اور جس دن ان کو اپنی تجارت میں خسارہ نظر آئے گا اس دن آزادی اظہار رائے کے سارے خواب بکھر جائیں گے۔

اس لئے مسلمانوں سے ہمیں اس مذاکرے کے ذریعے یہ اپیل کرنی چاہیئے کہ حکومت بائیکاٹ کرے یا نہ کرے، لیکن مسلمان اس بات کا تہیہ اور عہد کریں کہ جن ملکوں میں یہ گستاخی کی گئی ہے، ان ممالک کی مصنوعات کی خرید و فروخت ہم بند کر دیں، جو امپورٹر ہیں وہ امپورٹ کرنا بند کر دیں، جو تاجر ہیں ان کی مصنوعات کو فروخت کرنا بند کر دیں اور جو صارفین ہیں وہ ان کو خریدنا بند کر دیں۔

جس وقت یہ مسئلہ اٹھا ابھی تک پاکستان میں اتنی شدت سے نہیں اٹھا تھا لیکن بہت سے عرب ممالک میں اٹھ چکا تھا، میں اس وقت سعودی عرب میں تھا اور یہ منظر میری آنکھوں نے دیکھا کہ حکومت کی طرف سے کوئی باضابطہ اعلان نہیں ہوا تھا کہ عوام ڈنمارک کی مصنوعات کا بائیکاٹ کریں لیکن وہاں کی بڑی بڑی سپر مارکیٹوں نے اپنے ہاں یہ بورڈ لگائے ہوئے تھے کہ ہمارے ہاں کوئی شخص ڈنمارک کی کوئی چیز خریدنے کے لئے نہ آئے اور صرف یہ ہی نہیں کہ جتنا اسٹاک پہلے سے موجود ہے پہلے وہ بیچ دیں اور اس کے بعد پھر بائیکاٹ کریں بلکہ ان کے الماریوں کے شیلف خالی پڑے ہوئے تھے، وہاں پر لکھا ہوا تھا کہ ڈنمارک کی مصنوعات اس جگہ ہوا کرتی تھیں، ہم نے سب نکال کر باہر پھینک دی ہیں۔ عوام نے یہ سلسلہ شروع کیا اور جب اس معمولی پیمانے پر چند ملکوں میں یہ کام ہوا تو آپ نے دیکھا کہ کچھ نہ کچھ حرکت شروع ہوگئی اور یہ کہا گیا کہ ہماری مصنوعات کا بائیکاٹ ہو رہا ہے ہمیں نقصان پہنچ رہا ہے۔

حب نبوی کا ادنیٰ ثبوت

میرے بھائیو اور دوستو! ہمارا سب سے پہلا اور سب سے ادنیٰ درجے کی، نبی کریم سرور دو عالم ﷺ سے محبت کا ثبوت کم از کم یہ تو ہو کہ اگر ہم ڈنمارک کا مکھن کھایا کرتے ہیں تو کیا ہمیں وہ مکھن زیادہ عزیز ہے یا جناب نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ کی عزت اور حرمت زیادہ عزیز ہے؟

اگر ہم ان کی اور کوئی مصنوعات استعمال کیا کرتے تھے تو اس استعمال کرنا بند کر دیں اور لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ ان مصنوعات کا مکمل بائیکاٹ کریں۔

بین الاقوامی سطح پر حکومت کا یہ فریضہ ہے اور صدر مملکت سے ہم لوگوں کی جو ملاقات ہوئی اس میں بھی ہم لوگوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایک ایسا بین الاقوامی قانون منظور کرانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ الحمد للہ! مسلمانوں کے نزدیک نہ صرف سرور دو عالم ﷺ بلکہ تمام پیغمبر انبیاء علیہم السلام برابر ہیں۔

یہ قرآن کریم کا اعلان ہے:

" لانفرق بين أحد من رسله ".

''ہم جدا نہیں کرتے اس کے پیغمبروں میں سے''۔

لہٰذا کسی بھی نبی کی شان میں کسی بھی قسم کی گستاخی چاہے وہ زبانی ہو، تحریری ہو، تصویر کی شکل میں ہو، اسکیچ کی شکل میں ہو یا کسی بھی شکل میں ہو اس کو سخت ترین سزا کا مستوجب قرار دیا جائے اور جب تک یہ نہیں ہوتا مسلمانوں کو اپنا احتجاج جاری رکھنا چاہیئے۔

اور یہ بات صحیح نہیں ہے کہ جیسا کہ بعض لوگ یہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ بھئی کب تک احتجاج کرتے رہو گے۔ ارے ہم اس وقت تک احتجاج کرتے رہیں گے جب تک نبی کریم سرور دو عالم ﷺ کی ناموس کی مکمل تحفظ نہیں دیا جاتا۔ اس واسطے جب تک یہ احتجاج جاری نہیں رہے گا اس وقت تک مغربی دنیا پر دباؤ نہیں پڑے گا، لہٰذا بین الاقوامی سطح پر اگر آپ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو وہ مؤثر اس وقت تک نہیں ہوگا جب تک یہ احتجاج جاری نہیں رہے گا۔

احتجاج کی شرعی حدود

ہاں! یہ ضرور ہے کہ احتجاج کے لئے بھی جس طرح نبی کریم سرور دو عالم ﷺ کی محبت کا حق ادا کرنے کی ضرورت ہے وہاں آپ کی اطاعت بھی ایک مسلمان کا شیوہ ہونا چاہیئے۔ اس احتجاج میں اگر کسی بے گناہ کی جان جاتی ہے، کسی بے گناہ کے مال کو لوٹا جاتا ہے یا اس کو آگ لگائی جاتی ہے تو اس کا کوئی جواز نہ اسلام میں ہے، نہ اخلاقی اعتبار سے اس کا کوئی جواز ہے، اور یہ جناب نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے، آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ کے موقع یہ اعلان فرمایا:

" ألا انّ دمائكم و أموالكم و أعراضكم حرام عليكم كحرمة يومكم هذا في بلد كم هذا ".

''تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں تمہارے اوپر حرام ہیں''۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرو ﷛ کی ایک روایت ابن ماجہ میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم سرورِدوعالم ﷺ کعبہ شریف کا طواف کررہے تھے اور طواف کرتے کرتے آپ نے کعبہ کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ: ''اے بیت اللہ! تیری عظمت اور تیری تقدیس کتنی بڑی ہے''، صحابی کہتے ہیں کہ میں نے یہ الفاظ نبی کریم ﷺ کی زبان سے سنے آپ نے دو تین مرتبہ یہ الفاظ دہرائے کہ اے بیت اللہ! تیری عظمت، تیری تقدیس کتنی بڑی ہے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد خود سرورِدوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے بیت اللہ تیری عظمت بہت بڑی ہے، لیکن ایک ایسی چیز ہے جس کی عظمت اور جس کی تقدیس تجھ سے بھی زیادہ ہے اور فرمایا کہ وہ ایک مسلمان کی جان، اس کا مال، اس کی آبرو، اس کی حرمت اور تقدیس ہے یہ کعبے سے بھی زیادہ بڑی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص کسی بے گناہ مسلمان کی جان پر، مال پر، آبرو پر حملہ کرتا ہے تو سرورِدوعالم ﷺ کے نزدیک اس سے بڑا مجرم ہے جو کعبے کو معاذ اللہ ڈھانے کا ارتکاب کرے، اس سے مکمل اجتناب اور پرہیز کرتے ہوئے ہمیں عوامی طور پر یہ احتجاج جاری رکھنا چاہیئے۔ گستاخ ممالک کی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنا چاہیئے اور بین الاقوامی سطح پر اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے کہ کسی طرح سے ساری دنیا میں اس بات کو تسلیم کرلیا جائے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی ادنیٰ توہین قابلِ تعزیر اور سخت ترین سزا کی مستوجب قرار پائے۔

ان گستاخانہ خاکوں کے ضمن میں یہ تین طرح کے اقدامات کی تجاویز پیش خدمت ہیں: جن میں سیاسی، معاشی اور تبلیغی سطح پر جدوجہد کرنی شامل ہے۔

سیاسی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہماری حکومت ڈنمارک کے سفیر کو نکال دے اور اپنے سفیر کو بلالے اگر اس طرح تمام مسلم ممالک کریں تو اس کا خاطر خواہ اثر پڑ سکتا ہے۔

معاشی سطح پر ان ممالک کی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا جائے جس میں گستاخانہ خاکے شائع ہوئے ہیں اور فلم بنائی گئی ہے۔ چونکہ ڈنمارک حکومت نے نیم دلانہ قسم کے اقدامات کیے ہیں اس طرح اس گستاخ پر مقدمہ نہیں چلایا۔

تبلیغی سطح پر یہ معاملے میڈیا میں لانے کی ضرورت ہے کیونکہ یورپ میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کو ان معاملات کی سرے سے معلومات نہیں ہوتی، وہ معاشی مصروفیات میں سارا دن گزار دیتے ہیں، آج دنیا میں تعلیم وتبلیغ کا وسیع ذریعہ میڈیا ہے تاکہ ناواقف لوگوں تک یہ بات پہنچ جائے۔ ہم تبلیغی معاملے پر احساس جرم کا اعتراف کرتے ہیں، آج اسلام کو صحیح طور پر پیش کرنے میں ہم نے مجرمانہ کوتاہی سے کام لیا ہے۔

اللہ ﷻ اپنے فضل وکرم اپنی رحمت سے ہمیں نبی کریم ﷺ کی محبت اور عظمت کا وہ حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے جو اللہ ﷻ کی رضا کے مطابق ہو۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين .